عرب اور موالی

نگار سجاد ظہیر

قرطاس
۲۰۱۹ء



يَلُوحُ الخطُّ فی القِرطاسِ دهراً
و كاتبه رَميمٌ فی التُّرابِ

[نقشِ کتابت، کاغذ پر مدتوں قائم و دائم اور تاباں رہے گا
جبکہ لکھنے والے کی ہڈیاں خاک میں مل چکی ہوں گی]

عرب اور موالیٰ

(پہلی صدی ہجری کے اسلامی معاشرے میں
موالی کی سماجی حیثیت و علمی مرتبہ)

نگار سجاد ظہیر
سابق صدر و پروفیسر (ر)، شعبۂ اسلامی تاریخ
کراچی یونی ورسٹی، کراچی

نظر ثانی

پروفیسر علی محسن صدیقی
سابق صدر، شعبۂ اسلامی تاریخ
کراچی یونی ورسٹی، کراچی

قرطاس
۲۰۱۹ء

قرطاس

سلسلۂ مطبوعات - ۱۵۳

طبع اوّل --- دسمبر ۲۰۰۶ء

طبع دوم --- جولائی ۲۰۱۹ء

قیمت : -/۲۰۰ روپے

ISBN: 978-969-9640-58-2

قرطاس

فلیٹ نمبر A-15، گلشن امین ٹاور، گلستان جوہر بلاک 15، کراچی

موبائل: 0321-3899909 ای میل: saudzaheer@gmail.com

ویب سائٹ: www.qirtas.co.nr

فہرست مضامین

انتساب

اپنے اساتذہ کرام:

پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم (مرحوم)

پروفیسر علی محسن صدیقی (مرحوم)

پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر (مرحوم)

کے نام،

جن کی خصوصی توجہ کے بغیر میرے کام کی تکمیل ممکن نہ تھی

نگار

اظہارِ تشکر:

اپنے پی ایچ۔ڈی کے مقالے کو کتابی شکل میں طبع کرانے کا ارادہ ہوا تو میں نے یہ مسودہ اپنے استادِ محترم پروفیسر علی محسن صدیقی صاحب کو اس خیال سے بھجوایا کہ وہ اس پر ایک نظر ڈال لیں، تاکہ مقالے میں جو کمی رہ گئی ہے یا تسامحات سرزد ہوئے ہیں یا اگر کہیں اصلاح کی گنجائش ہے تو اشاعت سے قبل کرلی جائے۔ عدیم الفرصتی کے باوجود جناب صدیقی صاحب نے جس طرح میرا طویل مقالہ لفظاً لفظاً پڑھا اور اصلاح فرمائی، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مقالہ حتی المقدور غلطیوں سے پاک ہوگیا اور اب میں اپنا یہ کام اطمینانِ قلب کے ساتھ پیش کر سکتی ہوں۔ ان کی نظرِ ثانی نے میرے مقالے کو جو وقار بخشا ہے، اس کے لئے "شکریہ" کا لفظ بہت چھوٹا ہوگا۔

ڈاکٹر سلیم صاحب کی شدید علالت کے دوران میں نے اپنا تھیسس BASR میں جمع کرایا تھا، اس سے قبل کہ مجھے ڈگری ایوارڈ ہوتی، اور میرے ممتحن حضرات (پروفیسر سید سلمان ندوی، ڈربن، ساؤتھ افریقہ اور ڈاکٹر عبدالحق انصاری، علی گڑھ، انڈیا) کی شاندار رپورٹ سے وہ شادکام ہوتے، پیغامِ اجل آپہنچا اور وہ راہیٔ مُلکِ عدم ہوئے۔ اس کے بعد کے تمام انتظامی مراحل پروفیسر ڈاکٹر محمد صابر کی راہنمائی میں طے کیے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی شفقت، راہنمائی اور تعاون نے ہر مرحلہ آسان کردیا، ورنہ ہوسکتا تھا کہ جامعہ کراچی میں بعض اساتذہ کی ناروا سیاست اور بے جا حسد راہ کھوٹی کرتا۔ آج میں جس مقام پر ہوں (یعنی شعبۂ اسلامی تاریخ کی سربراہ)، یہ ڈاکٹر صاحب کی خصوصی توجہ، مہربانی، عنایت اور شفقت کی وجہ سے ہے۔ ان کے لئے بھی "شکریہ" کا لفظ بہت معمولی اور حقیر ہے۔

آخر میں اعتراف کروں گی کہ اپنے والدین کی دعاؤں، شوہر اور بچوں کے غیر مشروط تعاون کے بغیر چار سال پر پھیلا ہوا یہ کام، سمٹ نہ سکتا۔



دیباچہ (طبع دوم)

زیر نظر کتاب پہلی بار دسمبر ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی۔ ۲۰۰۸ء میں صدارتی ایوارڈ حاصل کیا اور جلد ہی اسٹاک ختم ہوگیا، اس کی مانگ برقرار رہی تاہم قرطاس کی دیگر مطبوعات میں مصروف رہنے کی وجہ سے اس کی اشاعتِ ثانی مسلسل تاخیر کا شکار ہوتی رہی۔ بہرحال اب بارہ سال کے وقفے کے بعد کتاب دوبارا پیش کی جارہی ہے۔ اس طبع ثانی میں ایک باب ''شعوبیت'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ دراصل میرا مقالہ تھا جو خدابخش لائبریری جرنل، پٹنہ، انڈیا سے شمارہ ۱۴۰ (بابت اپریل۔ جون ۲۰۰۵ء) میں شائع ہوا تھا۔

کتاب کی لسانیاتی اصلاح کے لئے یہ مسودہ عبدالستار ہاشمی صاحب کو بھجوایا گیا اور انہوں نے جو لسانیاتی تصحیحات تجویز کیں، انہیں اختیار کیا گیا۔ طبع ثانی کے اشاریے کی تیاری کے لئے ریحان عمر صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

نگار



مقدمہ

پہلی صدی ہجری کی سیاسی، تہذیبی و علمی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے، تاریخ کے طالب علم کے ذہن میں ''موالی'' کے حوالے سے بہت سے سوالات ابھرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ لفظ ''مولی'' (جمع: موالی) کا اطلاق کن پر ہوسکتا تھا، اس 'ادارے' کی اس عہد میں کیا ضرورت تھی۔ قرآن، موالی کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ اسلام نے ان کو کیا سماجی مقام عطا کیا، نیز عربوں کی قبائلی عصبیت اور فاتحانہ ارستقراطیت (Aristocracy)، بعد میں ان کا یہ مقام کس حد تک برقرار رکھ سکی۔ خود موالی، قبولِ اسلام کے بعد، اسلامی روح سے کس حد تک واقف ہوسکے اور اپنی سابقہ قومی عصبیت سے کس حد تک دست بردار ہوسکے۔ ان کے سیاسی عزائم نے بنوامیہ کی حکومت کے لئے کن خطرات کو جنم دیا اور یہ کہ زیرِ نظر صدی اور اس سے ملحقہ دوسری صدی ہجری میں اٹھنے والے بیشتر مذہبی فتنوں میں دستِ موالی کی کارفرمائی کا کیا سبب تھا۔

پھر یہ علمی مسئلہ یہیں ختم نہیں ہوجاتا۔ جس طرح اس امر کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں کہ اسلام نے انسانی سماج کو قدیم عصبیتوں سے نجات دلانے میں جو کامیابی حاصل کی، اس کے وسائل و مدارج اس عالم اسباب میں کیا رہے، وہیں اس امر کے بارے میں تحقیق بھی تاریخ کی اہم ضرورت ہے کہ اسلام نے انسانی سماج کو جب قدیم جاہلانہ عصبیتوں سے پاک کردیا تھا تو پھر نصف صدی کے اندر اندر ہی وہ کیونکر سابقہ شدت سے انہی جاہلانہ عصبیتوں میں گرفتار ہوگیا۔

زیرِ نظر مقالے میں انہی سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ

پہلی کوشش نہیں ہے۔ اس موضوع پر جرجی زیدان، احمد امین المصری، حسن ابراہیم حسن اور مستشرقین میں سے خصوصاً ولہاوزن (J. Wellhausen)، لیوی (Reuben Levy)، گولڈزہیر (Gold Ziher) اور گب (H.A.R. Gibb) وغیرہ نے اظہار خیال کیا ہے۔ مگر اس موضوع پر کافی کچھ کہنے کی گنجائش پائی گئی ہے اور بعض مورخین نے جن نتائج کا استخراج کیا ہے، وہ خاصے متنازعہ رہے ہیں۔ اس ضمن میں ایک معتدل اور معروضی فکر کی ضرورت مستقل محسوس کی جارہی تھی اور یہی ضرورت اس موضوع کے انتخاب کا سبب بنی۔

اس علمی مسئلے کے لئے پہلی صدی ہجری کے دور کو منتخب کرنے کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ موالی کے سماجی مرتبے کے تعین کا اہم اور حل طلب مسئلہ اٹھا ہی اس صدی میں تھا۔ اگر عربوں کو اپنی عربیت پر ناز تھا تو دوسری طرف عجمیوں خصوصاً ایرانی موالی کو اپنے شاندار سابقہ ساسانی تمدن پر غرور تھا اور فتوحات کے نتیجے میں جب یہ دونوں تہذیبیں ٹکرائیں تو فاتحین (یعنی عربوں) کے قائم کردہ ریاست و معاشرے میں مفتوحین (یعنی موالی) کے سماجی مرتبے کا تعین ایک اہم اور نازک مسئلے کی شکل اختیار کرگیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسی صدی میں مختلف مذہبی فرقوں، مثلاً شیعہ، خوارج اور مُرجۂ وغیرہ کا ظہور ہوا جن کے سیاسی و تمدنی نظریات نے اس سماجی مسئلے کو اپنے اپنے تناظر میں حل کرنے کی کوشش کی۔

''تاریخ'' ایک ایسا مضمون ہے جس میں قیاسیات و تاویلات سے کام لینے کی گنجائش ہوتی ہے، خصوصاً اسباب واقعات معلوم کرنے کے معاملے میں مورخ کو بیشتر حالات میں قیاس کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں علوم سائنس کا معاملہ دوسرا ہے، سائنس میں جب کوئی نتیجہ حاصل کرنے یا سبب معلوم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو تجربہ گاہ میں جاکر بڑی حد تک حتمی سبب حاصل کرلینا اور پھر متعدد تجربات کے ذریعہ اس کی تصدیق بھی کرلینا اک امر ممکن ہے، مگر یہ معاملہ تاریخ کے ساتھ نہیں ہے۔

علم التاریخ کا شاید سب سے دشوار اور کٹھن مرحلہ (جس سے اس مقالے کی تیاری کے دوران مجھے بارہا گزرنا پڑا) وہ ہوتا ہے جب مورخ کسی تہذیب کا ایسا کیمیائی تحلیل کی طرح

تجزیہ کرنا چاہتا ہے، جس کے ذریعہ وہ اس کے داخلی عناصر کی اصلیت کا پتا چلا سکے اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس تہذیب پر وقت کا ایک طویل عرصہ گزر چکا ہو۔ ابھی تک کوئی ایسی کیمیائی تجربہ گاہ (Laboratory) وجود میں نہیں آئی ہے (اور نہ آسکتی ہے) جو تاریخی تحلیل کا حتمی کام انجام دے سکے اور نہ کوئی ایسی خوردبین (Microscope) ہی ایجاد ہوئی ہے جو ان تہذیبی عوامل کی تمام تر باریکیوں کے ساتھ وضاحت کر سکے، جنھوں نے کسی تہذیب کی تشکیل میں خاص حصہ لیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں کوئی بات بھی 'حرف آخر' نہیں ہوتی۔ لہٰذا مجھے بھی اس بات کا دعویٰ نہیں ہے کہ یہ مقالہ اس موضوع پر حرف آخر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی واقعہ سے مختلف ذہن، مختلف نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اس موضوع پر بھی مزید کچھ کہنے کی گنجائش پیدا کی جا سکتی ہے۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ اس مقالے کے حوالے سے پہلی صدی ہجری کی سیاسی، تہذیبی اور علمی تاریخ پر ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس موقع پر اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اموی عہد کی بیشتر تاریخیں، عباسی عہد میں لکھی گئیں، جو دونوں حکمران خانوادوں کے مابین ایک طویل کشمکش اور عرب و موالی تعلقات کے حوالے سے بھی معروضیت کے مطلوبہ معیار تک نہیں پہنچ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ حقائق کا صحیح ادراک کر کے اس عہد کی سیاسی و معاشرتی تاریخ بیان کرنا واقعتاً جان جوکھوں کا کام ثابت ہوا۔

پی ایچ۔ ڈی کی تکمیل کے لئے یہ مقالہ ڈاکٹر محمد سلیم صاحب، سابق صدر شعبۂ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی کی زیر نگرانی مکمل کیا گیا۔ بڑھاپے اور ناسازیٔ طبع کے باوجود ان کی توجہ اور تعاون پر میرا رواں رواں ان کا شکر گزار رہے۔

نگار سجاد ظہیر

۱۵ر جنوری ۱۹۹۸ء

بمطابق ۱۶ر رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ



باب اول

لفظ موالی کی تشریح و توضیح

عربی زبان، سامی زبانوں میں نہایت اہم ہے بلکہ اس بنا پر کہ سامی اقوام کا مسکن اول "عرب" ہی ہے اور یہیں سے سام کی یہ نسل عرب کے قرب و جوار کے ملکوں میں نقل مکانی کر کے آباد ہوئی۔ امم سامیہ کی اولین زبان جو وہ بولتے تھے "عربی" ہی ہے۔ یوں عربی زبان کو عراق کی آرامی، کلدانی، نبطی اور الجزیرہ کی سریانی اور ارض کنعان کی عبرانی زبانوں کی اساس قرار دیا گیا ہے اور اس مفہوم میں اسے "اُمُّ الْاَلْسِنَة" ثابت کیا گیا ہے۔ عربی زبان کی وسعت یہیں ختم نہ ہوئی بلکہ بحر احمر کو پار کر کے افریقہ میں بھی اس نے اپنے قدم جمائے اور مقامی زبان کے امتزاج سے عربی کی وہ شاخ وجود میں آئی جسے حبشی کہا جاتا ہے۔ اس طرح عرب کے نقل مکانی کرنے والے قبائل مصر میں بھی داخل ہوئے اور ہکسوس (Hyksos) (چرواہے) بادشاہوں کے نام سے "مصریات" میں انہیں نمایاں حیثیت ملی اور ان کی تہذیبی و لسانی چھاپ قبطی زبان پر بھی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ بحر روم کے ساحلوں سے عرب آباد کار فینیقی اور قرطاجنی ناموں سے شمالی افریقہ کے اس ساحل تک پہنچے جو مغربی یورپ کے مقابل ہے۔ ان نقل مکانی کرنے والے عربوں کی تہذیب و زبان نے ان خطوں کے باشندوں پر اپنے واضح نشانات ثبت کیے جو بربری زبان پر آج بھی واضح طور سے موجود ہیں۔

عربی زبان اپنی وسعت اور پہنائی کے باعث نہایت "دولت مند" زبان ہے اور اس کے ذخیرہ الفاظ میں اتنی کثرت ہے کہ شاید ہی کوئی زبان اس سے ہمسری کا دعویٰ کر

سکے۔اس کی تفصیل میں جائے بغیر صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ عربی میں ایک لفظ کے متعدد معانی اور بہت سے ہم معنی الفاظ موجود ہیں۔مثلاً شہر کے لئے عربی میں بیسیوں الفاظ ہیں اور ''عین'' کے بیسیوں معانی ہیں۔اس مقالہ کی حد تک صرف ایک لفظ کی تفصیل برمحل ہوگی اور وہ ہے لفظ ''مولیٰ'' جو متعدد معانی و مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے۔

مولیٰ (جمع موالی) عربی زبان کا ایک کثیر المعنی لفظ ہے۔مولیٰ کا مادہ وَلِی " ہے، جس کے معنی قرب اور نزدیکی کے ہیں۔عربی محاورہ ہے، تباعدنا بعد وَلِیٍ یعنی ہم نزدیکی کے بعد دور ہو گئے ہے۔ا

وَلاء (واؤ پر زبر) ملک اور محبت کو کہتے ہیں۔مولیٰ اسی سے مشتق ہے جس کے معنی مالک کے ہیں۔۲ [زبیدی، تاج العروس، جلد۱۰،ص ۳۹۹]

وِلاء (واؤ پر زیر) اُس میراث کو کہتے ہیں جو کسی سے عقدِ مُوالات کی وجہ سے ملے۔

ان مختلف مشتقات کے مصادر مختلف ہیں۔وَلایہ (واؤ پر زبر) نسب، نصرت اور عتق کے لیے استعمال ہوتا ہے۔وِلایہ (واؤ پر زیر) امارت وحکمرانی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔۳ اور مُوالاۃ عہد یا معاہدہ کے لیے مستعمل ہے۔موالاۃ کی ضد مُعاداۃ اور وَلِی کی ضد عَدُوٌ ہے۔۴

لفظ ولاء اور توالی دراصل دو چیزوں میں ایسی کیفیت اتصالیہ کو کہتے ہیں کہ درمیان میں اجنبیت حائل نہ رہے۔مجازاً مراد قرب ہوتا ہے۔خواہ یہ قرب مکانی ہو یا نسبی، دینی ہو یا دنیاوی، اعتقاد کے اعتبار سے ہو یا مالکیت ومملوکیت کے اعتبار سے، یوں دو یا دو سے زائد افراد کو باہم اتحاد کی وجہ سے ایک دوسرے کا مولیٰ، ولی اور متولی کہا جائے گا۔۵

قرآن کی رو سے:

قرآن مجید میں یہ لفظ اکیس مرتبہ آیا ہے۔۶ اور مختلف مقامات پر مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے لیکن اگر ان معنوں کی درجہ بندی کی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ قرآن میں لفظ

مولیٰ مندرجہ ذیل تین معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

۱۔ حقیقی مالک یا آقا:

قرآن مجید میں بعض موقعوں پر یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنی مالکِ حقیقی اور آقا کے ہیں۔ وہ مقامات یہ ہیں:

(الف) اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (البقرہ:۲۸۶)

[تو ہمارا مالک ہے، کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر]

(ب) ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ط (الانعام:۶۲)

[پھر سب کے سب اللہ، اپنے حقیقی آقا کی طرف واپس لائے جائیں گے]

(ج) وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (یونس:۳۰)

[اور سب اپنے مالک حقیقی کی طرف پھیر دیئے جائیں گے اور وہ سارے جھوٹ جو انھوں نے گھڑ رکھے تھے گم ہو جائیں گے۔]

(د) وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ط هُوَ مَوْلٰىكُمْ ج فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (الحج:۷۸)

[اللہ (کی رسی) کو مضبوطی سے پکڑے رہو۔ وہ تمہارا مولا ہے، سو وہ بہت ہی اچھا مولیٰ ہے اور وہ بہت ہی اچھا مددگار ہے۔]

۲۔ نگران، سرپرست، متولی، کارساز یا رفیق:

مولیٰ کے دوسرے معنی نگران، سرپرست، متولی، کارساز یا رفیق کے ہیں۔ یہ لفظ حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، اور مجازاً بھی استعمال ہوا ہے۔
حقیقی معنوں میں مندرجہ ذیل آیات میں مذکور ہوا ہے۔

(الف) وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (الانفال:۴۰)

[اور اگر وہ نہ مانیں تو جان رکھو کہ اللہ تمہارا سرپرست ہے اور وہ بہترین حامی و مددگار ہے]

(ب) قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (التوبہ:۵۱)

[کہو ہمیں ہرگز کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے۔ اللہ ہی ہمارا کارساز ہے اور اہلِ ایمان کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔]

(ج) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (محمد:۱۱)

[یہ اس لیے کہ ایمان لانے والوں کا کارساز اللہ ہے اور کافروں کا کارساز کوئی نہیں۔]

(د) وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (التحریم:۲)

[اللہ تمہارا کارساز ہے اور وہی علیم و حکیم ہے۔]

(ہ) وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ (التحریم:۴)

[اور اگر نبی کے مقابلے میں تم نے باہم جتھہ بندی کی تو جان رکھو کہ اللہ اس کا کارساز ہے]

یہی الفاظ مجازاً بھی استعمال ہوئے ہیں:

(الف) وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ (النحل:۷۶)

[اللہ ایک اور مثال دیتا ہے۔ دو آدمی ہیں: ایک گونگا (بہرا) ہے، کوئی کام نہیں کرسکتا، اپنے آقا پر بوجھ بنا ہوا ہے۔]

(ب) يَدْعُوا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ (الحج:۱۳)

[وہ اُس کو پکارتا ہے جس کا نقصان اُس کے نفع سے قریب تر ہے۔ بدترین ہے اس کا یہ مولیٰ اور بدترین ہے اس کا یہ رفیق۔]

(ج) اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ؕ (الاحزاب:۵)

[ان کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو۔ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے اور اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں۔]

(د) ماوٰکم النار، هى مولٰکم، وبئس المصير (الحدید:۱۵)

[تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے وہی تمہارا ساتھی ہے اور یہ بدترین انجام ہے۔]

۳۔ عصبات اور قرابت دار:

مولیٰ کا لفظ قرآن حکیم میں عصبات، قرابت دار اور بنو اعمام کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے، ان معنوں میں یہ لفظ سورۃ النساء، سورۃ دخان اور سورۃ مریم میں آیا ہے۔

(الف) وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِىَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ (النساء:۳۳)

[ماں باپ اور قرابت دار جو چھوڑ کر مریں گے اس کے وارث ہم نے ہر شخص کے مقرر کردیے ہیں اور جن سے تم نے اپنے ہاتھوں سے گرہ باندھی (معاہدہ کیا ہے) انہیں ان کا حصہ دو۔]

(ب) وَاِنِّىْ خِفْتُ الْمَوَالِىَ مِنْ وَّرَآءِىْ وَكَانَتِ امْرَاَتِىْ عَاقِرًا فَهَبْ لِىْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا (المریم:۵)

[مجھے اپنے مرنے کے بعد اپنے قرابت داروں کا ڈر ہے اور میری بیوی بھی بانجھ ہے تو تُو مجھے اپنے پاس سے وارث عطا فرما۔]

(ج) يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَنْ مَوْلًى شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (الدخان:۴۱)

[وہ دن جب کوئی قریبی عزیز اپنے کسی قریبی عزیز کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ کہیں سے انہیں کوئی مدد پہنچے گی۔]

اس سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ قرآن میں لفظ ''مولیٰ'' کہیں بھی آزاد کردہ غلام کے لئے نہیں استعمال کیا گیا حالانکہ عرب جاہلیہ کی شاعری میں یہ لفظ مندرجہ بالا تمام مفاہیم کے علاوہ آزاد کردہ غلاموں کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا اور احادیث میں بھی اسے ان معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

احادیث کی رو سے:

احادیثِ نبوی میں الفاظ مولیٰ، موالی، ولاء، ولی اور تولی بار بار مذکور ہوئے ہیں۔ کتب صحاح ستہ کے علاوہ دیگر مسانید اور کتب سنن میں بھی ان کے مشتقات متعدد احادیث و احکام کے ضمن میں آئے ہیں۔ بعض مقامات پر یہ لفظ ناصر و مددگار، اعانت کرنے والے اور حامی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے پتہ چلتا ہے:

"قریش والانصار و جُهَيْنَةُ و مُزَيْنَةُ و اسلم و اشجع و غِفَار موالی ليس لهم مولیٰ دون الله و رسوله" [۷]

یعنی: [قبائل قریش، انصار، جہینہ، مزینہ، اسلم، غفار اور اشجع، اللہ اور اس کے رسول ہی ان کے معین و مددگار ہیں۔]

بعض احادیث میں مولیٰ سے مراد مالک، ولی اور آقا کے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے:

''ایما عبد نکح بغیر اذن مولاہ فنکاحہ باطل'' [۸]

یعنی: [جس غلام نے اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح کیا تو اس کا

نکاح باطل ہے۔]

ایک اور جگہ ارشاد نبوی ہے:

"ومن تولی قوماً بغیر اذن موالیه لعنةُ الله والملائکة والناس اجمعین" ۹ یہی بات خطبہ حجۃ الوداع میں یوں کہی گئی ہے: "من ادعی الی غیر ابیه اوتولیٰ غیر موالیه فعلیه لعنةُ الله والملا ئکة والناس اجمعین لا یقبل منه صرف ولا عدل" ۱۰ یعنی: جس شخص نے اپنے آزاد کرنے والوں اور محسنوں کی اجازت کے بغیر دوسرے لوگوں سے موالات اور عہد و پیمان کرلیا تو اس پر اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہو۔

لفظ مولیٰ بعض احادیث میں بالکل برعکس معنوں میں استعمال ہوا ہے، یعنی آقا کے مقابلے میں غلام یا آزاد کردہ غلام کے لیے بھی یہی لفظ مولیٰ استعمال کیا گیا ہے، مثلاً حدیث میں ہے:

"مولی القوم من انفسهم" ۱۱ یعنی: قوم کا آزاد کردہ شخص انہی میں سے ہوتا ہے۔

چونکہ مولیٰ کے معنی آزاد کنندہ اور آزاد کردہ دونوں ہی ہیں اس لیے ارباب لغت و حدیث نے فرق کرنے کی غرض سے آزاد کنندہ کو "المولی الاعلیٰ" اور "مولی من فوق" اور آزاد کردہ کو "المولی الاسفل" اور "مولی من تحت" کہا ہے۔ ۱۲

بعض احادیث میں (قرآن کی طرح) لفظ مولیٰ وارث کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

"ومن اسلم علی یده رجل فهو مولاه رای یرثه کما یرث من اعتقه" ۱۳

یعنی: جس مسلمان کے ہاتھ پر کوئی شخص اسلام لایا تو وہ (مسلمان) اس (نومسلم) کا مولیٰ و وارث ہوگیا۔

عربی شاعری کی رو سے:

عربی شاعری، خواہ عہد جاہلیہ کی ہو یا صدر الاسلام کی اس میں مولیٰ اور موالی کے الفاظ انہی تمام معنوں میں استعمال ہوئے ہیں، جن کا احاطہ قرآن و حدیث میں کیا گیا ہے چنانچہ عربی شاعری میں یہ لفظ مولیٰ کہیں رشتہ داروں خصوصاً بنو اعمام کے لیے استعمال ہوا ہے، کہیں دوست، رفیق، ساتھی اور مددگار کے لیے بولا گیا ہے۔ کہیں اس سے مراد وارث اور حلیف کے ہیں اور کہیں اس کے معنی آزاد کردہ غلام یا مالک کے ہیں، مثلاً مندرجہ ذیل اشعار میں مولیٰ بنو اعمام کو کہا گیا ہے۔

۱۔ بنی جشم بن عامر بن قداد کے ایک شاعر عمرو بن خثارم کا ایک شعر ہے:

ان اباکم ھو جدی و ابی لم ینصر المولی اذا لم تغضبی ۱۴

[تمہارا باپ وہی ہے جو میرا باپ اور دادا ہے، اگر تم غیرت نہیں دکھاؤ گے تو تمہارے مولیٰ کی کون مدد کرے گا۔]

۲۔ اسی طرح زہیر ۱۵ کے ایک قصیدے کا ایک شعر ہے:

حدب علی المولی الضریک اذا نابت علیه نوائب الدھر

[یہ اپنے محتاج چچازاد بھائی پر مشفق و مہربان ہوتا ہے، جب زمانے کی آفات اس پر نازل ہو جائیں۔]

۳۔ ایک عربی شاعر مرہ بن عدا کہتا ہے:

رایت الموالی الالی یخذلوننی علی حدثان الدھر اذ یتقلب ۱۶

[میں اپنے برادران عم کو غلطی پر دیکھتا ہوں جو مجھے گردش زمانہ میں تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔]

۴۔ عہد اموی کا ایک شاعر فضل بن عباس بن عتبہ بن ابی لہب ۱۷ بنو امیہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

مهلاً بنی عمنا مهلاً موالینا لا تنبشوا بیننا ماکان مدفونا
مهلاً بنی عمنا عن تحت اثلتنا سیروا رویدا کما کنتم تسیرونا ۱۸

[اے ہمارے برادران عم نرمی اختیار کرو اور گڑی ہوئی عداوتوں کو مت اکھاڑو۔ اے ہمارے برادران عم ہماری بے عزتی نہ کرو اور نرمی کی وہی چال چلو جو تم پہلے چلتے تھے۔]

بعض عربی اشعار میں مولیٰ سے مراد عبد، غلام اور تابع کے ہوتے ہیں۔

۱۔ حصین ۱۹ ابن حمام المرّی کہتا ہے:

موالی موالینا لیسبوا نسائنا لعمری لقد جئتم بسنة اشاما

[ہمارے موالی کے غلام بھی ان کے ساتھ جنگ کرنے کی غرض سے آئے ہیں تاکہ ہماری عورتوں کو گرفتار کر کے لے جائیں۔ میری زندگی کی قسم یہ بڑی منحوس بات ہے۔]

۲۔ حریث بن جابر الوائلی کہتا ہے:

لعمرک ماانصفتنی حین سمیتنی هواک مع المولیٰ و ان لا هوی لیا
اذا ظلم المولیٰ فزعت لظلمه فحرک احشائی و هرت کلابیا ۲۰

[تیری جان کی قسم! تو نے یہ تکلیف دہ بات کہہ کر مجھ سے انصاف نہیں کیا کہ "تجھے اپنے غلام سے محبت ہے اور مجھے اپنے غلام سے محبت نہیں۔" جب میرے غلام پر ظلم ڈھایا جاتا ہے تو میں پریشان ہو جاتا ہوں چنانچہ یہ ظلم میرے (دل وجگر) کو ہلا دیتا ہے اور میرے کتے مجھ پر بھونکنے لگتے ہیں۔]

عربی شاعری میں لفظ مولیٰ آزاد کردہ غلام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ شقران مولیٰ سلاماں ۲۱ کہتا ہے:

لو کنت مولی قیس عیلان لم تجد علی الانسان من الناس درهما
ولکننی مولی قضاعه کلها فلست ابالی ان ادین و تغرما ۲۲

[اگر میں قیس عیلان کا آزاد کردہ غلام ہوتا تو، تو مجھ پر لوگوں میں سے کسی شخص کا ایک درہم بھی قرض نہ پاتا۔ لیکن میں تو سارے قضاعہ قبیلے کا موئی ہوں اس لیے اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں کرتا کہ قرض لوں اور وہ میری طرف سے میرا قرض ادا کریں۔]

اسی طرح عربی شاعری میں لفظ موئی ''حلیف'' کے لیے بھی مستعمل ہے۔ ایک عربی شاعر، جس کے حلیف حوشب کو اس کے برادر عم زاد نے مارا پیٹا تھا، کہتا ہے:

ساخذ منکم ال حزن بحوشب وان کان لی مولیٰ لی و کنتم بنوابی ۲۳

[اے بنی حزن، میں تم سے عنقریب حوشب کا انتقام لوں گا۔ اگر چہ وہ میرا حلیف ہے اور تم میرے دادا کی اولاد ہو۔]

عربی شاعری میں موئی، مددگار اور حامی کو بھی کہتے ہیں۔ مثلاً ایک عرب شاعر عباس بن مرداس السلمی کہتا ہے:

فحارب فان مولاک حارد نصره ففی السیف مولیٰ نصره لا یحارد ۲۴

[پس تو ہمسایہ کی حمایت میں دشمنوں سے لڑ، پھر اگر تیرے عم زاد بھائی کی مدد کمزور پڑ جائے تو تلوار ایسا مددگار ہے جس کی مدد میں کوئی کمزوری نہیں۔]

ایک اور عربی شاعر ابی ابن حمام العبسی کہتا ہے:

لست بمولی سَوْءَ ۃٍ ادعی لہا فان لسوآت الامور موالیا ۲۵

[میں برائی کا دلدادہ اور حامی نہیں ہوں کہ مجھے اس کی طرف منسوب کیا جائے، بے شک برے کاموں کے حامی میرے سوا دوسرے لوگ ہیں۔]

عربی شاعری میں یہی لفظ ''موئی'' دوست و رفیق کے لیے بھی بہ کثرت استعمال ہوا ہے۔ ایک عربی شاعر عبداللہ بن عمۃ الضبی کہتا ہے: ۲۶

لاتجعلونا الی مولیٰ یحل بنا عقد الحزام اذا مالبدہ مالا

مولیٰ من الخوف یدعی وھو مشتمل تری بہ عن قتال القوم عقالا ۲۷

[ہمیں ایسے دوست کے حوالے نہ کرو کہ جس وقت اس کی زین ایک طرف جھک جائے تو وہ کمزوری کی تلافی کرنے کی بجائے اور زیادہ کمزور ہو جائے۔ ایسے دوست کے حوالے نہ کرو جسے بوقت خوف بلایا جائے اس حال میں کہ اس نے بزدلی کی چادر اوڑھی ہوئی ہو تو تم دیکھو گے کہ دشمنوں کی لڑائی سے اس کے پاؤں میں مرض عقال پیدا ہو گیا ہے۔]

الغرض لفظ مولیٰ قرآن وحدیث وعربی اشعار میں بارہ تیرہ معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں اس سے مراد مالک حقیقی ہے، کہیں مجازی معنوں میں مالک و آقا، کہیں اس سے مراد رفیق، ناصر، دوست اور ساتھی کے ہیں تو کہیں اس سے مراد حلیف اور مُعاہد کے، کہیں یہ لفظ صہری رشتہ داروں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور کہیں پڑوسی اور ہمسایہ کے معنوں میں، کبھی مولیٰ آزاد کردہ کو کہتے ہیں، کبھی آزاد کنندہ کو، کسی مقام پر مولیٰ سے مراد چچازاد بھائی، عصبات اور ورثاء ہیں اور کہیں اس سے مراد دینی بھائی کے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ کثیر المعنیٰ لفظ قرآن وحدیث اور عربی شعر وادب میں مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ بعض اہلِ لغت نے معانی اور مفاہیم کے اعتبار سے لفظ مولیٰ کی اقسام اور درجہ بندی کر کے یہ معاملہ کافی حد تک سلجھا دیا ہے۔

اہل لغت کی درجہ بندی:

مشہور لغوی ابوعبیدہ معمر بن مثنیٰ ۲۰۸ھ مولیٰ کی درج ذیل چھ قسمیں بیان کرتا ہے:

۱۔ عصبات وورثاء: (بھائی، چچا، چچازاد بھائی اور بیٹا وغیرہ)

۲۔ ناصر، معین ومددگار

۳۔ ولی اور متولیِ امور

۴۔ مولی الموالات: (ایسا شخص جو کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلے اور اس سے موالات کرلے۔)

۵۔ مولیٰ نعمت: (یعنی، آزاد کنندہ، جس نے اپنے غلام کو آزاد

کر کے اس پر احسان کیا۔)

۶۔ مولیٰ: (یعنی، آزاد کردہ، آزادی کے بعد وہ برادر عم زاد کی طرح ہو جاتا ہے اور اس کی حمایت اس کے آزاد کنندہ پر واجب ہو جاتی ہے اور اگر ایسا شخص مرجائے اور کوئی وارث نہ چھوڑے تو یہ آزاد کرنے والا شخص بھی اس کا وارث ہوتا ہے۔)۲۹

دوسرے عالم لغت ابن سلام ۳۰ نے اس تقسیم کو مزید مختصر کیا ہے اور موالی کی درج ذیل اقسام کی نشاندہی کی ہے:

۱۔ مولیٰ فی الدین: جو دینی رشتے سے ساتھی اور رفیق ہو۔

۲۔ مولیٰ الحلف: عہد و پیمان باندھنے والا حلیف۔

۳۔ مولیٰ النعمت: جسے اس لیے مولیٰ کہا جاتا ہے کہ اس کا انتساب آزاد کنندہ کے نسب کے ساتھ ہوتا ہے۔۳۱

خلاصہ بحث یہ کہ مولیٰ سے متعلق مندرجہ بالا تمام معانی ومفاہیم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سہولت بحث کی خاطر اس کی مندرجہ ذیل قسمیں کی جاسکتی ہیں:

۱۔ مولیٰ القرابت والولادۃ: موالی کی اس قسم میں ہر وہ رشتہ دار شامل ہوتا تھا جس سے رشتہ داری کی وجہ یا تو ولادت ہوتی تھی یا زوجیت یعنی یا تو وہ خون کے رشتے سے ایک دوسرے کے مولیٰ ہوتے تھے یا پھر نکاح کے رشتے سے۔

۲۔ مولیٰ الحلف والیمین: معاہدہ اور عہد و پیمان کے ذریعے موالات قائم

کرنے والے اشخاص و قبائل آپس میں ایک دوسرے کے موالی ہوتے تھے۔

۳۔ موالی فی الدین: دینی ربط کی وجہ سے جو موالات اور دوستی قائم ہو جائے اس کی بنا پر بھی فریقین ایک دوسرے کے موالی ہوتے تھے۔ انہیں موالی الموالات بھی کہا جاتا ہے۔

۴۔ موالی العتق: انہیں موالی العتاقہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں آزاد کردہ غلام اور آزاد کنندہ آقا دونوں شامل ہیں۔ آزاد کردہ غلام "موالی من تحت" اور آزاد کنندہ "موالی من فوق" کہلاتے تھے۔ ۳۲



حوالہ جات:

۱ اسماعیل بن حماد جوہری (م ۳۹۸ھ)، تاج اللغة و صحاح العربیة، جلد ۶، ص ۲۵۲۸، دارالکتب العربی، مصر؛ ابن منظور افریقی، لسان العرب، جلد ۲۰، ص ۲۹۳، بولاق، مصر ۱۳۰۷ھ؛ سید مرتضیٰ حسین زبیدی حنفی (م ۱۲۰۵ھ) تاج العروس من جواہر القاموس، جلد ۱۰، ص ۳۹۸، مطبعہ خیریہ، مصر ۱۳۰۶ھ۔

۲ تاج العروس من جواہر القاموس، جلد ۱۰، ص ۳۹۹۔

۳ لسان العرب، جلد ۲۰، ص ۲۹۱؛ تاج العروس، جلد ۱۰، ص ۳۹۹۔

۴ ایضاً، ص ۲۹۳؛ تاج العروس، جلد ۱۰، ص ۳۹۸۔

۵ الجلالی، مولانا سید عبدالدائم، لغات القرآن، جلد ۵، ص ۲۷۲، ندوة المصنفین، دہلی، طبع اول ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۷ء، جلد ۵، ص ۲۷۲۔

۶ مقامات یہ ہیں (۱) البقرہ: ۲۸۶ (۲) النساء: ۳۳ (۳) الانعام: ۶۲ (۴-۵) الانفال: ۴۰ (ایک ہی آیت میں یہ لفظ دو مرتبہ آیا ہے) (۶) آل عمران: ۱۵۰ (۷) التوبہ: ۵۱ (۸) یونس: ۳۰ (۹) النحل: ۷۶ (۱۰) مریم: ۵ (۱۱) الحج: ۱۳ (۱۲-۱۳) الحج: ۷۸ (ایک آیت میں دو مرتبہ) (۱۴) الاحزاب: ۵ (۱۵-۱۶) الدخان: ۴۱ (ایک آیت میں دو مرتبہ) (۱۷-۱۸) محمدؐ: ۱۱ (ایک آیت میں دو مرتبہ) (۱۹) الحدید: ۱۵ (۲۰) التحریم: ۲ (۲۱) تحریم: ۴۔

۷ امام محمد بن اسماعیل بخاری (م ۲۵۶ھ) صحیح البخاری، جلد ۴، ص ۱۵۷، دار الکتب العلمیہ، لبنان؛ لسان العرب، جلد ۲۰، ص ۲۸۹۔ (معمولی لفظی تغیر کے ساتھ یہ حدیث سنن ترمذی، جلد ۵، ص ۴۲۸، (کتاب المناقب) میں بھی بیان ہوئی ہے۔

۸ امام ابوداؤد سلیمان ابن اشعث جستانی (م ۲۷۵ھ)، سنن ابی داؤد، جلد ۲، ص ۱۳۳، اسلامی اکادمی، لاہور، ۱۹۸۳ء، (لسان العرب میں "ایما امراۃ" کے الفاظ ہیں۔ یعنی جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا وہ نکاح باطل ہے۔ لسان العرب، جلد ۲۰، ص ۲۸۸۔)

۹ صحیح بخاری، جلد ۸، ص ۱۰ (کتاب الفرائض)؛ امام ابی الحسن، مسلم بن حجاج القشیری، صحیح مسلم، جلد ۲، ص ۱۱۴۶، (کتاب العتق)، دار احیاء التراث العربی، بیروت؛ ابی عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ (م ۲۹۷ھ)، سنن ترمذی (الجامع الصحیح)، جلد ۴، ص ۴۳۹ (کتاب الولاء والھبہ)، دار احیاء التراث العربی، بیروت (تاریخ ندارد)۔

۱۰ ابی عثمان عمرو بن بحر الجاحظ (م ۲۵۵ھ) البیان و التبیین، جلد ۲، ص ۱۶، قاہرہ، ۱۳۳۲ھ؛ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، جلد ۲، ص ۱۸۳، دار صادر، بیروت، ۱۹۵۸ء۔

۱۱ صحیح بخاری، جلد ۸، ص ۱۱ (کتاب الفرائض)۔

۱۲ ابن حزم اندلسی، جمھرۃ انساب العرب، ص ۱۳۲، ۲۲۵، دار المعارف، مصر، ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء۔

۱۳ ابن اثیر جزری، النھایۃ فی غریب الحدیث والاثر، جلد ۴، ص ۳۳۶، مطبعہ خیریہ، مصر، ۱۳۲۳ھ۔

۱۴ محمود شکری آلوسی (م ۱۳۴۳ھ)، بلوغ الارب، جلد ۱، ص ۳۰۵، مطابع دار الکتاب العربی، مصر، طبع ثانی ۱۳۴۲ھ۔

۱۵ زہیر بن ابی سلمٰی کے بیشتر قصائد ہرم بن سنان المری کی مدح میں ہیں، جس قصیدے سے یہ اشعار لیے گئے ہیں۔ وہ دیوان زہیر (طبع بیروت، ۱۳۷۹ھ/ ۱۹۶۰ء) میں موجود ہے اور اس کا مطلع یہ ہے:

لمن الديار بقنة الحجر   اقوين من حجج و من شهر

نیز بلوغ الارب، جلد۳، ص ۱۹۔

۱۶ ابوتمام حبیب بن اوس طائی (م ۲۳۱ھ)، دیوان حماسہ، جلد ۱، ص ۱۰۷، مصر ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۵ء۔

۱۷ فضل بن عباس بن عتبہ بن ابی لہب، بنو ہاشم کا ممتاز شاعر تھا وہ عہد اموی کے مشہور شعراء فرزدق، جریر اور عمر بن ابی ربیعہ کا معاصر تھا۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دربار سے وابستہ اور اس کے متوسلین خاص میں سے تھا۔ سلیمان بن عبدالملک کے ہاں اس کی پذیرائی نہ ہوئی اور وہ عطاء و کرم سے محروم رہا۔ (ابوعلی احمد بن محمد بن حسن مرزوقی (م ۴۲۱ھ)، شرح دیوان الحماسہ، لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر، مصر، جلد ۱، ص ۲۲۴؛ صدیقی، علی محسن، "لفظ موالی کی تشریح"، ماہنامہ المعارف، لاہور، اکتوبر ۱۹۸۱ء۔)

۱۸ دیوان الحماسہ، جلد ۱، ص ۱۱۵۔

۱۹ حصین بن حمام بنوغطفان کی مشہور شاخ بنو مرہ سے تعلق رکھتا تھا، اسے بالاتفاق عہد جاہلیہ کے کم گو شعراء میں سب سے عمدہ شاعر سمجھا گیا ہے۔ اس کا مشہور قصیدہ فخریہ ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے:

جزى الله افناء العشيرة كلها   بدارة موضوع عقوقا و مأثما

اس قصیدے کو مفضل ضبی نے "مفضلیات" میں، جو عہد جاہلی کے شعراء کا قدیم ترین مجموعۂ اشعار ہے، نقل کیا ہے۔ مندرجہ بالا شعر اسی قصیدے میں شامل ہے۔ حصین نے زمانۂ اسلام پایا اور عہد رسالت میں وفات پائی۔ ابن ماکولا کا خیال ہے کہ وہ صحابی تھا۔ (تبریزی، شرح دیوان الحماسہ، جلد ۱، ص ۲۱۵ و ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ)، الاصابہ، جلد ۲، ص ۱۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت؛ صدیقی، علی محسن، "لفظ موالی کی تشریح"، ماہنامہ المعارف، لاہور، اکتوبر ۱۹۸۱ء)

۲۰ دیوان حماسہ، جلد ۱، ص ۲۱۰۔

۲۱۔ شقران عہد اسلامی کا شاعر تھا، سلامان کا موالی تھا، جس کا تعلق بنو قضاعہ سے تھا۔

۲۲۔ بلوغ الارب، جلد ۱، ص ۵۶۔

۲۳۔ حماسہ، جلد ۱، ص ۱۷۲۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۲۸۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۳۲۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۳۲۴-۳۲۵۔

۲۷۔ عقال ایک مرض ہے جو گھوڑے کے پاؤں میں ہو جاتا ہے اور اس کو چلنے پھرنے سے روک دیتا ہے۔

۲۸۔ ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ اپنے عہد کا بہت بڑا لغوی، نساب اور مؤرخ تھا۔ وہ قریش کی شاخ بنی تیم کا موالی تھا۔ ۱۱۰ھ/ ۷۲۸ء میں بصرہ میں پیدا ہوا۔ ۱۸۸ھ میں ہارون الرشید کے وزیر فضل بن ربیع کی دعوت پر بغداد آیا اور یہیں ۲۰۹ھ/ ۸۲۴ء میں وفات پائی۔ اس نے دبستان بصرہ کے سربرآوردہ علمائے لسانیات، ابو عمرو بن العلاء اور یونس بن حبیب سے تعلیم پائی اور قواعد لغت اور لسانیات کے بعض مباحث پر متعدد رسائل تصنیف کیے جن میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہا۔ مذہبی اعتبار سے اس کا رجحان خارجیوں کے فرقۂ اباضیہ کی طرف اور رجحان کے اعتبار سے شعوبی تھا۔ اس نے عربوں کی برائی میں کئی کتابیں لکھیں۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے غریب حدیث پر کتاب تصنیف کی۔ اس کی دو سو کے قریب تصانیف میں سے صرف ایک کتاب الخیل موجود ہے جس کا موضوع ہے مشہور و معروف عربی گھوڑے۔ یہ کتاب ۱۳۵۸ھ میں حیدرآباد سے دائرۃ المعارف کی زیر نگرانی شائع ہوئی ہے۔ گھوڑوں پر اس کی کتاب الدیباجہ کو ابن قتیبہ نے بغیر کسی حوالے کے اپنی کتاب ادب الکاتب میں نقل کیا ہے۔ اس کے اقتباسات عیون الاخبار میں بھی موجود ہیں۔ جاحظ نے کتاب الحیوان میں بھی اس کے مباحث نقل کیے ہیں۔

اس کے تلامذہ میں ابو عبید قاسم بن سلام، ابو حاتم السجستانی، عمر بن شبہ جیسے علماء شامل ہیں، مشہور عباسی شاعر ابو نواس نے بھی اس کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ مبرد، جاحظ اور ابن قتیبہ نے اس کی شاندار الفاظ میں تعریف کی ہے۔ خطیب بغدادی نے اس کا تفصیل سے ذکر کیا

ہے۔ مشہور محدث دار قطنی نے اس کی روایتِ حدیث کو لینے کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی کہ "اس میں کوئی حرج نہیں، الا یہ کہ وہ کسی قدر خوارج کی ہم خیالی سے متہم ہے۔" (ابوعبیدہ، کتاب الخیل، دائرۃ المعارف الاسلامیہ، حیدرآباد، ۱۳۵۸ھ حواشی از سالم کرنکوی، ص ۴-۷۱۔۸۱؛ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱، ص ۸۵۶، مادہ ابوعبیدہ، مقالہ نگار ایچ۔ اے۔ آر۔ گب: صدیقی، علی محسن، "لفظ موالی کی تشریح"، ماہنامہ المعارف، لاہور، اکتوبر ۱۹۸۱ء)۔

۲۹۔ ابن منظور افریقی، لسان العرب، جلد ۲۰، ص ۲۸۹۔

۳۰۔ محمد بن سلام مشہور صحابی قدامہ بن مظعون کے موالی میں تھا۔ اس کی ولادت اور نشو و نما بصرہ میں ہوئی۔ اس کا شمار ماہرینِ لغت و ادبِ عربی میں ہوتا ہے۔ اس کے تلامذہ میں اس عہد کے بہت سے اہم اہل علم شامل ہیں جن میں نمایاں حیثیت مشہور لغوی ثعلبی کو حاصل ہے۔ طبقات الشعراء اس کی اہم تصنیف ہے جو عرب کے شعراء کے حالات میں قدیم ترین کتاب ہے۔ ابن سلام نے بغداد میں ۳۲-۲۳۱ھ میں وفات پائی۔ (صدیقی، علی محسن، "لفظ موالی کی تشریح"، ماہنامہ المعارف، لاہور، اکتوبر ۱۹۸۱ء)

۳۱۔ ابن منظور افریقی، لسان العرب، جلد ۲۰، ص ۲۸۸۔

۳۲۔ صدیقی، علی محسن، "عرب جاہلیہ میں موالی"، ماہنامہ آگہی، کراچی، شمارہ مارچ - اپریل، ۱۹۹۰ء، ص ۱۵۵۔



باب دوم

عہد جاہلیہ میں موالی

عہد جاہلیت[۱] میں جزیرہ نمائے عرب میں دو طرح کی معاشرت نظر آتی ہے اور یہ معاشرتی تفریق دراصل طرز معیشت کی بناء پر ہے۔[۲]

۱۔ حضری (یعنی اہل المدر)

۲۔ بدوی (یعنی اہل الوبر)

طرز معاشرت کے اس تفاوت کی وجہ سے ان کے مختلف ذرائع معاش اور مختلف وسائل حیات تھے۔ عربوں کے ایک گروہ کا پیشہ زراعت تھا جس کے لئے وہ مجبور تھے کہ جب تک فصلیں تیار نہ ہو جائیں وہ ایک جگہ قیام کریں اور گاؤں یا دیہاتوں کی بنیاد ڈالیں اور مقیم بن کر رہیں۔ یہ حضری گروہ، بدویوں کی نسبت کم تعداد میں تھا اسی لئے جزیرہ نمائے عرب میں شہروں کی تعداد بھی کم تھی۔ مثلاً حجاز میں مکہ، مدینہ طائف اور یمن میں صنعاء۔ شہروں کے رہنے والے حضری عرب تھے۔ یہ بات صرف عربی معاشرے کے لئے نہیں تھی، بلکہ جہاں بھی بدویت ہوگی وہاں شہروں کی تعداد کم ہوگی زیر نظر دور میں المغرب اور مشرقی افریقہ میں بھی شہروں کی کمی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے باشندے اہل البادیہ تھے۔[۳]

اگرچہ سرزمین عرب وسیع صحراؤں اور سنگلاخ پہاڑوں پر مشتمل تھی مگر ملک میں کہیں کہیں قابلِ کاشت زمینیں بھی تھیں۔ ساحلی مقامات خصوصاً سرسبز و شاداب تھے۔ مثلاً یمن، عمان، حضرموت وغیرہ۔ اس کے علاوہ نجد، خیبر، حجاز میں طائف اور مدینہ وہ علاقے تھے

جہاں زراعت ہوتی تھی۔

عربوں کے دوسرے گروہ کا پیشہ گلہ بانی تھا، یہ اہل البادیہ تھے۔ یہ منتشر اور مسافرت میں رہنے پر مجبور تھے۔ انہیں اپنے مویشیوں کے لئے نئی چراگاہوں اور نئے چشموں کی تلاش میں سرگرداں رہنا پڑتا تھا۔ یہ کثیر التعداد تھے، ان اہل البادیہ کے بھی دو گروہ تھے۔ ایک وہ جو صرف اونٹوں کو پالتا تھا، دوسرا گروہ وہ جو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ پر زندگی بسر کرتا تھا۔

اصل میں "بدوی" وہی تھے جو اونٹوں کو پالتے تھے۔ لفظ "بدوی" کا ٹھیک ٹھیک اطلاق دراصل انہی پر ہوتا تھا۔ اونٹ صحرا کے حالات سے بے حد مطابقت رکھتا ہے۔ اس میں پیاس برداشت کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے اور وہ طویل مسافت کو بہت تیزی سے طے کرسکتا ہے اور یہ بات بھی یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ بدوی عربوں کی قبائلی جنگوں میں اونٹ کو گھوڑے پر برتری حاصل ہوتی ہوگی کیونکہ طویل مسافتوں میں سواری کے اونٹ کی رفتار، گھوڑے سے تین گنا زیادہ ہوتی ہے۔ پھر یہ گھوڑوں کے مقابلے میں زیادہ بوجھ اٹھالیتا ہے۔ بہرحال عربوں کی بدوی زندگی اونٹ پالنے پر منحصر تھی۔ وہ اپنے اونٹوں کے ریوڑ کے سہارے زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ اونٹ کا دودھ، دہی اور گوشت ان کی غذا ہوتی اور اس کی کھال ان کا خیمہ۔

اس درجہ اونٹوں پر انحصار نے اہل البادیہ کے بالکل صحرائی مخلوق ہوجانے میں بہت مدد کی، کیونکہ صرف پہاڑوں کی پیداوار اونٹوں کی پرورش کے لئے کافی اور مفید نہیں تھی اس لئے یہ لوگ مجبور ہوگئے کہ صحرا کے اندر نفوذ کرکے نہ صرف وہاں کے خس و خار سے اونٹوں کو ان کی طبعی غذا مہیا کریں بلکہ کھاری پانی بھی انہیں پلائیں۔ اونٹوں کی صحت و عافیت کا انحصار اسی پر تھا۔ پھر چونکہ اونٹ سردی کی تکلیف کو برداشت نہیں کرسکتا اس لئے موسم سرما میں اس گروہ کے لئے اور بھی ضروری ہوجاتا تھا کہ وہ سرسبز و آباد مقامات کو چھوڑ کر ریگستانوں اور صحراؤں کی راہ لیں۔ پھر ایک اور بات جس کی طرف ابن خلدون اشارہ کرتا ہے، وہ یہ کہ ریتیلے اور ریگستانی علاقوں میں اونٹنی آسانی سے بچے دے دیتی ہے کیونکہ اونٹنی کے بچے بڑی مشکل سے پیدا ہوتے ہیں اور اس وقت اس کو گرم ماحول کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ ؎

یہ اہل البادیہ، حضارت و مدنیت سے دور بھاگتے تھے۔ یہ لوگ شہر اور قصبات کے باشندوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور انہیں غلام سمجھتے تھے۔ یہ بدوی اپنی آزادی کو انتہائی عزیز رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک کسی خاص مقام کو اپنا مسکن بنانا گویا اپنی آزادی کو خیر باد کہنا تھا کیونکہ جہاں مسکن معین ہو، وہاں غیر کا محکوم ہونا بھی لازم ہے۔ ۵

یہ بدوی کبھی مفتوح نہیں ہوئے۔ جس زمانے میں فینقیہ اور فلسطین سے بیش قرار خراج ایران کے بادشاہوں کو جایا کرتا تھا، اس وقت عرب ہی ایسے تھے جو خراج سے مستثنیٰ تھے۔ ۶ ان کے پڑوس میں دو بڑی مملکتوں کی موجودگی کے باوجود انہیں کوئی فتح نہ کرسکا۔ ان میں وحشت کا عنصر زیادہ تھا اور جنگجویانہ اوصاف کے حامل تھے۔ اسلحہ کا استعمال دن رات کا مشغلہ تھا، ریگستانی راہوں پر قافلوں اور مسافروں کو لوٹ لینا ان کی معاشی مجبوری تھی۔ وہ آرام و آسائش کی متمدن زندگی سے آشنا ہی نہیں تھے۔ ان کی معاشرت میں حیرت انگیز سادگی تھی۔ وہ خیموں میں زندگی گذارتے، پانی اور چارے کی تلاش میں گھومتے پھرتے رہتے اور لوٹ اور لڑائی پر زندگی بسر کرتے تھے۔

جزیرہ نمائے عرب کی آبادی کا غالب حصہ انہی بدوی قبائل پر مشتمل تھا اور ایسا ہونا کچھ عربوں کی خواہش پر مبنی نہیں تھا بلکہ عرب کے طبعی حالات کا یہی تقاضا تھا کہ ایک ایسا ملک جو وسیع صحراؤں، بے آب و گیاہ ریگستانوں اور طویل کوہستانی سلسلوں پر مشتمل ہو، جہاں کوئی دریا نہ ہو جس کے گرد منظم بستیاں بسائی جاسکیں اور زراعت کی جاسکے، وہاں کے باشندوں کا سب سے بڑا ذریعۂ معاش گلہ بانی ہی ہوگا اور وہاں کے لوگ چارے اور پانی کی تلاش میں خانہ بدوش رہیں گے۔

تاہم یہ طرز معاشرت پورے جزیرۃ العرب کا نہیں تھا۔ عرب کے بعض علاقے نہایت متمدن تھے اور ایک منظم ضابطے کے پابند تھے۔ اس ضمن میں سرفہرست یمن ہے تھا، جو ایک درخشاں تہذیب کا حامل تھا۔ یمن کے حکمرانوں نے وسیع سلطنتیں قائم کیں۔ جزیرہ نما کے باہر، بحر احمر کے دوسرے ساحل پر حبشہ میں اپنی نو آبادی کی بنیاد رکھی۔ اندرون ملک پہاڑوں کے درمیان مآرب ۷ کے مقام پر بند باندھ کر یمن کے وسیع علاقے کو قابل کاشت بنایا۔ جنوبی

عرب یعنی یمن اور حضر موت کی خوشحالی کا دار و مدار زراعت کے علاوہ تجارت پر بھی تھا۔ صدیوں تک جنوبی عرب کے ان تاجروں کو لوبان کی تجارت کی اجارہ داری حاصل رہی اور وہ ہندوستان اور یورپی ممالک کے درمیان آمد و رفت کے ذرائع پر بھی متصرف رہے۔ یہ لوگ اپنا تجارتی سامان خشکی کے راستوں سے بھیجتے تھے جو عرب کو جنوب سے شمال تک قطع کرتے تھے۔ شمالی عرب میں بھی نو آبادیاں قائم کر لی گئی تھیں اور مصر، بحیرہ ایجین اور خلیج فارس کے علاقوں میں بھی تجارتی سرگرمیوں کی شہادت ملتی ہے۔

جنوبی عرب خصوصاً یمن میں تمدنی ترقی عروج پر تھی۔ بہت سی شاندار عمارتوں کا پتہ چلتا ہے جس میں قصر غمدان کا تذکرہ بڑے طلسماتی انداز میں کیا گیا ہے، یہاں سے ملنے والے کتبے اس بات کی شہادت بھی دیتے ہیں کہ یہ لوگ لکھنے پڑھنے کے فن سے واقف تھے۔ ان کا سیاسی نظام انتہائی مستحکم تھا اور انتظامی ساخت مضبوط تھی۔

جنوب میں صرف یمن کی حکومت ہی متمدن نہیں تھی بلکہ شمالی علاقوں میں بھی تہذیب و تمدن کی سرگرمیاں ملتی ہیں۔ سرحد عراق پر حیرہ[9] یعنی مناذرہ (آل لخم) کی حکومت قائم تھی جو بحرین پر بھی برائے نام تسلط کی دعوے دار تھی۔ عربوں کی یہ حکومت، ایرانیوں کی طفیلی ریاست تھی۔ یہ شہر تمدن کے ایک خاص معیار تک پہنچ گیا تھا اور آراستگی اور خوبی میں دار السلطنت ایران اور قسطنطنیہ کا مقابلہ کرتا تھا۔[10] بادشاہوں کے دربار میں شعراء جمع رہتے۔ روایتوں میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حیرہ کا شہر عالیشان محلات، شاداب باغات اور نظر فریب نہروں کی وجہ سے اس عہد کا بارونق شہر سمجھا جاتا تھا۔

اسی طرح شام کی سرحد پر غسانہ[11] (آل جفنہ) کی حکومت رومیوں کے زیر اثر قائم تھی۔ قحطان کی ایک شاخ کہلان کے عربوں کی یہ ایک نیم خود مختار حکومت تھی جس کا پایہ تخت بصریٰ کا شہر تھا۔ یہ حکومت حوران اور بلقاء کے دونوں منطقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بھی اپنے وقت کی خاصی متمدن حکومت تھی۔ آثار قدیمہ کی جدید تحقیقات نے ان کی ترقی کی عظمت کو ثابت کر دیا ہے۔

تاہم عموماً شمالی اور جنوبی عرب کی ان متمدن ریاستوں کا کوئی خاص اثر وسطی عرب پر نہیں تھا۔ وسطی عرب کے بیشتر باشندے بدویانہ نظامِ زندگی کے خوگر تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شمالی، وسطی اور جنوبی عرب میں، جن میں سرحدی اتصال بھی تھا، تہذیب و تمدن کا اتنا واضح فرق کیوں نظر آتا ہے۔

دراصل اس کی سب سے قوی وجہ ان علاقوں کے مختلف جغرافیائی حالات وعوامل ہیں۔ کسی جگہ کی تہذیب وتمدن کے تشکیلی عناصر میں جغرافیائی عامل ایک طاقتور عامل سمجھا جاتا ہے۔ یہ انسانی خدوخال سے لے کر طرزِ معاشرت ومعیشت تک ہر معاملے میں حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ وسطی عرب کے ریگستانی علاقوں کے عربوں کا گلہ بان ہونا اور شمالی یا جنوبی عرب کے رہنے والوں کا اہلِ زراعت وتجارت ہونا، ان کی اپنی پسند یا صوابدید پر منحصر نہیں تھا بلکہ یہ وہاں کے جغرافیائی حالات کا تقاضا تھا کہ وہ ایسا کریں اور جہد للبقاء کے لئے انہوں نے ایسا کیا یا ایسا کرنے پر مجبور ہوئے۔

بہرحال جزیرۃ العرب کی خواہ حضری آبادی ہو یا اہل البادیہ ہوں، ان کا طرزِ زندگی "قبائلی" تھا۔ عہدِ جاہلیت میں قبیلہ ہی وہ وحدت تھی جس پر عربوں کی اجتماعی زندگی کا دار و مدار تھا۔ حضری عرب بھی اسی قبائلی طرزِ زندگی کے عادی تھے۔ یہ درست ہے کہ مکے میں قُصیؒ بن کلاب ۱۲ کے بعد ایک سیاسی نظام نظر آتا ہے۔ ان کا پیشہ تجارت تھا۔ ان کے تاجر حبشہ، عراق، ایران، شام بلکہ ایشیائے کوچک تک چلے جاتے تھے اور غیر ملکی تاجروں سے جو اُن کے شہر میں داخل ہوتے تھے وہ تجارتی ٹیکس بھی وصول کرتے تھے۔ یثرب میں بھی عرب قبائل کے علاوہ یہودیوں کی جماعت آباد تھی، جن کی ایک منظم معیشت تھی اور اپنا معاشرتی نظام تھا۔ ۱۳ یہودی تجارت پر قابض تھے تو اہلِ مدینہ زراعت پیشہ تھے، یہی حال طائف میں آباد مرفہ الحال بنوثقیف کا تھا۔ یہ شہر مکہ، مدینہ اور طائف وغیرہ جو کسی زمانے میں پہاڑوں کے مختصر دروں یا صحرا کے دامن میں کسی بڑے نخلستان کے سہارے آباد ہو گئے تھے، ان شہروں میں رہنے والے اگرچہ ایک ہی جگہ مستقل قیام کر چکے تھے مگر بدوی تہذیب وتمدن، عزتِ نفس اور حریت پسندی وغیرہ جملہ خصائل وعادات میں اپنے بادیہ نشین ہم وطنوں کے ساتھ پوری طرح

مشابہ تھے اور ان شہروں میں بھی قبائلی نظام چل رہا تھا۔ چنانچہ اگر مکہ کی شہری ریاست قبیلہ قریش کی ریاست تھی اور اس کے مختلف عہدے قبائل قریش کے درمیان تقسیم تھے اور ایک اعتبار سے یہ مناصب انہی بطون قریش میں موروثی تھے تو دوسری طرف یثرب کے عرب قبائل بھی اوس وخزرج کے متعدد بطون پر مشتمل تھے اور ان کا نظام بھی قبائلی ہی تھا۔ جو یہودی یہاں آباد تھے وہ بھی قبائل میں منقسم اور ایک دوسرے سے دست بگریباں رہتے تھے۔

گویا عرب کے صحرا ہوں یا شہر، طرز زندگی بہرحال قبائلی تھا اور جہاں قبائلیت ہوتی ہے وہاں سیاسی لامرکزیت ہوتی ہے۔ عرب معاشرے میں ہر قبیلہ ایک اکائی اور سیاسی اعتبار سے خودمختار تھا۔ پورے عرب میں کسی ایسی منظم حکومت کا پتہ نہیں چلتا جس کے سامنے سارے قبائل جوابدہ ہوں، اس لئے قبائل کو من مانی کرنے کی یک گونہ آزادی تھی، کسی مرکزی حکومت کی عدم موجودگی خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ملک میں معاشی وسائل محدود ہوں، آئے دن کی جنگوں کا باعث تھی۔ اصل میں ایک بدوی کی زندگی سخت نامساعد حالات میں بسر ہوتی تھی۔ اکثر اوقات خوراک کے وسائل وذرائع، آبادی کے اعتبار سے کافی نہیں ہوتے تھے چنانچہ ہر طاقتور کے ہاں یہ رجحان پایا جاتا تھا کہ کمزور کے پاس اس قسم کے جو ذرائع و وسائل مثلاً اونٹ، مویشی وغیرہ ہوں، ان پر قبضہ کرلیا جائے۔

بدوی جن کی معاش کا انحصار گلہ بانی پر تھا، چارے اور پانی کی تلاش ان کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ چراگاہوں اور پانی کے چشموں پر قبضے کے لئے ان میں آئے دن جنگ کا بازار گرم رہتا تھا۱۴۔ عرب قبل اسلام کی ان قبائلی جنگوں کو ایام العرب (عرب کے دن) کہتے ہیں۔۱۵ اگرچہ عرب جاہلیہ کی یہ تمام جنگیں صرف معاشی اسباب کی بنا پر ہی نہیں لڑی گئیں مگر ان میں سے بیشتر لڑائیوں کا محور یہی چراگاہیں، پانی کے کنویں، مویشی اور مال تجارت کی لوٹ تھی۔ ان لڑائیوں سے فاتح قبائل کو نہ صرف مال غنیمت کی شکل میں معاش کے نئے ذرائع حاصل ہوتے تھے بلکہ مغلوب قبائل کے افراد قتل یا قید کے باعث کم ہوکر ان کے معاشی دباؤ کو بھی کم کردیتے تھے۔ پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ اس قسم کی جنگوں کی وجہ سے عربوں میں عرب

قومیت کے جذبات فروغ نہیں پا سکے۔ ان کا سب کچھ ان کا قبیلہ ہی تھا۔ دیگر قبائل (حالانکہ وہ عرب ہی ہوتے تھے) کا مال و متاع ان کے لئے جائز تھا۔ ۱۶

یہ لوٹ مار صرف چراگاہوں اور چشموں پر قبضے کی غرض سے ہی نہیں کی جاتی تھی بلکہ تجارتی قافلوں کو لوٹ کر ان کے سامان پر قبضہ کرنے اور ان کے معتوب افراد کو غلام بنا لینے کو بھی عرب کی معاشرت کا کثیر الوقوع واقعہ خیال کیا جاتا تھا۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے قریش اور دیگر قبائل عرب نے تجارتی قافلوں کی بسلامت آمد و رفت کی غرض سے مختلف ممالک سے معاہدے بھی کیے تھے۔ ۱۷ اس کے علاوہ بعض مہینوں میں قتل و غارت گری کو حرام قرار دے دیا گیا تھا، مگر ان اَشْہُرِ حُرُمْ ۱۸ کی بھی بعض اوقات پروا نہیں کی جاتی تھی اور جنگیں ہوتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ عام تاجروں کے علاوہ بڑے بڑے سرداروں کے اسباب تجارت بھی بازاروں میں اسی وقت بحفاظت آ سکتے تھے، جب ان کی بار برداری اور صیانت کی ضمانت قرب و جوار کے قبائل نے لی ہو۔ ۱۹ یہ سب قوانین ضرورت کے مطابق بنائے گئے۔ ایسے معاشرے میں جہاں کوئی مستقل حکومت نہ ہو، ایک اکیلا شخص یا کوئی کمزور قبیلہ کس طرح زندہ رہے۔ لہٰذا ضرورتاً یہ عرف یا قوانین بنتے گئے جن کا اس معاشرے میں احترام کیا جاتا تھا۔ حالانکہ بظاہر کوئی قوت نافذہ موجود نہیں تھی لیکن ان کی معاشرتی و معاشی ضروریات ہی ان کے لئے قوت نافذہ کا کام دے رہی تھیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے خلاف بھی ہوتا رہا، جیسا کہ سطور بالا میں لکھا گیا۔

الغرض ایک ایسا معاشرہ جس کی بنیاد لاقانونیت، جس کا مزاج لامرکزیت اور جس کی معیشت غنائم پر ہو، اس میں ذاتی و اجتماعی حفاظت کے لئے جو طریقہ رائج ہوگا وہ قبائلی ہوگا۔ کسی مضبوط حکومت اور مذہب کی عدم موجودگی میں انفرادی اور اجتماعی بقا کی ضمانت قبائل کی باہمی عصبیت پر ہوگی۔ چنانچہ عرب جاہلیہ میں معاشرے کی ہیئت ترکیبی قبائلی نوعیت کی تھی اور قبائلی عصبیت کے باعث لوگ اپنی جان اور اپنے مال کو محفوظ تصور کر سکتے تھے۔ عربوں کی اس قبائلی عصبیت کی اساس اتحاد نسب تھی۔ چنانچہ ایک باپ کی نسل سے تعلق رکھنے والے افراد ایک رشتۂ اتحاد میں پروئے ہوئے ہوتے تھے۔ جب کسی قبیلے کی تعداد بڑھ جاتی تو وہ کئی

حصوں میں تقسیم ہو جاتا اور یہ تمام حصے الگ الگ آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرتے اور صرف خاص خاص موقعوں پر مشترکہ مفاد و حفاظت کے لیے یا کسی غیر معمولی فوجی مہم کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہو جاتے تھے۔

ان قبائل کے داخلی طبقات یہ تھے:

۱۔ شَعب: (جمع شعوب) یہ بعید ترین نسبی تعلق ہوتا تھا، اس کی مثال عدنان اور قحطان ہیں۔

۲۔ قبیلہ: (جمع قبائل) ایک شعب سے تعلق رکھنے والے مختلف نسلی گروہ الگ الگ شاخوں میں تقسیم ہو جاتے تھے، ان میں ہر شاخ ایک قبیلہ کہلاتی تھی، مثلاً عدنان کی نسل سے تعلق رکھنے والے دو بڑے قبائل میں تقسیم ہوئے جن میں ایک مُضَر تھے اور دوسرے ربیعہ۔ قبائل کو جماجم کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔

۳۔ عمارة: (جمع عمائر یا عمارات) ایک قبیلہ مختلف نسلی سلسلوں میں بٹ جاتا تھا، ان میں سے ہر سلسلے کو عمارہ کہا جاتا تھا، مثلاً مضر کا قبیلہ مختلف عمائر میں تقسیم ہوا جن میں سے ایک قریش اور دوسرے بنو غفار تھے۔

۴۔ بطن: (جمع بطون یا ابطن) عمارہ کی نسلیں مختلف شاخوں میں پھیل جاتی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کو بطن کہتے تھے مثلاً قریش کی متعدد شاخوں میں سے ایک بنو عبد مناف اور دوسری بنو مخزوم وغیرہ تھی۔

۵۔ فَخِذ: (جمع افخاذ) بطن کے متعدد انساب الگ الگ فخذ کہلاتے تھے۔ مثلاً بطن عبد مناف میں بنو ہاشم اور بنو امیہ کے فخذ تھے۔

۶۔ فصیلہ: (جمع فصائل) فخذ کی مزید تقسیم کو فصیلے کی اصطلاح سے ظاہر کرتے تھے، مثلاً فخذ بنو ہاشم میں بنو ابی طالب اور بنو عباس کے فصیلے تھے۔

۷۔ اُسرۃ یا عائلہ: فصیلہ متعدد خاندانوں میں تقسیم ہوتا تھا، ہر خاندان کو ایک الگ اُسرہ یا عائلہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا مثلاً آل ابی طالب کے اُسروں میں آل جعفر، آل علی اور آل عقیل کے نام ملتے ہیں۔ [۲۲] (دیکھیے نقشہ نمبر ۱)

(نقشہ نمبر۱)

قبائل کی داخلی تقسیم



قبائل کے ان طبقات کے درمیان اتحاد اور یکجہتی کا فقدان ہوتا تھا، تاہم جب دوسروں سے مقابلہ پیش آجائے تو یہ ایک ہوجاتے تھے، مثلاً ایک عائلہ کے افراد دوسرے عائلہ کے افراد کے مقابلے میں، ایک فصیلہ کے لوگ دوسرے فصیلے کے لوگوں کے مقابلے میں، ایک فخذ سے تعلق رکھنے والے فصیلے، دوسرے فخذ کے فصیلوں کے مقابلے میں، وعلیٰ ہذا القیاس۔

عربوں کا یہ قول مشہور تھا' میں اور میرا بھائی، چچا کے لڑکے سے جنگ کرسکتے ہیں لیکن غیر کے مقابلے میں، میں اور میرا چچازاد دونوں ایک ہیں۔ ۲۱ اس قبائلی عصبیت کی حد یہ تھی کہ ہر شخص اپنے بھائی کی مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا تھا خواہ اس کا بھائی ظالم ہو یا مظلوم۔ بقول ابن خلدون انسان کا یہ طبعی خاصہ ہے کہ وہ اپنے کسی عزیز، رشتہ دار پر ظلم ہوتے برداشت نہیں کرسکتا۔ ۲۲

اب ایسی حالت میں جبکہ طاقت وعصبیت کا دار ومدار قبائل پر ہو اور ملک میں عام لاقانونیت کا چلن ہو، کوئی مربوط سیاسی نظام بھی نہ ہو تو ہر قبیلہ اس بات کی کوشش کرے گا کہ اپنی قوت اور طاقت میں اضافہ کرے۔ قوت میں یہ اضافہ، کثرتِ تعداد ہی کی صورت میں ممکن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک اولادِ نرینہ کی کثرت انتہائی طمانیت کی بات تھی۔ عرب جاہلیہ میں سرداری لوازمات میں سے ایک کثیر العیال ہونا بھی تھا۔ جماعت کی تعداد، اکثریت کی قوت اور رشتہ داریوں کے زیادہ سے زیادہ پھیلنے کو عرب عزت وغلبے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے عرب متعدد عورتوں سے بیک وقت نکاح کیا کرتے تھے۔ ۲۳

ان نکاحوں کا غالب مقصد تولید ہوتا تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ بیٹے حاصل کیے جاسکیں، جو عزت، شرف اور طاقت میں اضافے کا باعث ہوں۔ جب رسول اللہ ﷺ کے دادا عبدالمطلب کا چاہ زم زم کھودنے کے معاملے پر قریش سے جھگڑا ہوا اور ان کو دبنا پڑا تو انہوں نے نذر مانی کہ اگر ان کے دس بیٹے پیدا ہوئے اور وہ ان کی زندگی میں سن بلوغ کو پہنچ کر ان کی حمایت کے قابل ہوگئے تو وہ، ان میں سے ایک کو کعبہ میں اللہ کے لئے قربان کردیں گے۔ ۲۴

یہ دوسری بات ہے کہ عبدالمطلب کے دس بیٹے تو ہوئے، تاہم ان کی زندگی میں

جوان نہیں ہوئے۔ حارث بہت پہلے مر چکے تھے اور حمزہ اور عباس عہد طفولیت میں تھے۔ تاہم ان کی نذر سے اس قبائلی معاشرے کے مزاج کا پتہ ضرور چلتا ہے۔

دراصل زمانۂ جاہلیت میں اعراب کی آبادی بہت کم تھی اور زیادہ سے زیادہ آٹھ ہزار محاربین کی جماعت فراہم ہوسکتی تھی، اسی لئے اگر کسی کا خاندان مختصر ہوتا تو وہ اسے وسیع کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا اور یہی سبب تھا کہ عہد جاہلیت میں ایک شخص بلاتعین جتنے چاہے نکاح کرسکتا تھا۔ عرب ان شادیوں کے ذریعہ ایک طرف تو بیٹے حاصل کرتے تھے دوسری طرف اجنبیوں کو اپنے موالی بنالیتے تھے۔ شادی کی بدولت دو قبائل کے مابین الفت و دوستی پیدا ہوجایا کرتی تھی۔ ۲۵

یوں تو عربی معاشرے میں عورتوں کی کوئی خاص عزت و مرتبہ نہیں تھا مگر صاحب اولاد خواتین کے شرف و عزت میں یقیناً اضافہ ہوجاتا تھا۔ عربوں میں کثیر الاولاد عورت کو ''ناتق'' کہتے تھے اور یہ عورتوں میں پسندیدہ صفت سمجھی جاتی تھی۔

نکاح و تولید کے علاوہ افرادی قوت حاصل کرنے کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ رشتۂ ولاء قائم کرکے زیادہ سے زیادہ موالی حاصل کیے جائیں جیسا کہ باب اوّل میں لکھا جاچکا کہ خونی رشتہ ہی کے زمرے سے ولاء اور معاہدہ کا رشتہ تھا، کیونکہ ان دونوں سے بھی قریب قریب وہی خلوص اور وہی محبت پیدا ہوجاتی تھی جو خونی رشتے سے ہوسکتی تھی۔ مولیٰ اپنے مولا پر اور حلیف اپنے حلیف پر ظلم برداشت نہیں کرتا تھا۔ ۲۶ عرب جاہلیہ میں موالی حاصل کرنے کے یہ طریقے معروف تھے:

۱۔ حِلف:

تحالف یا حِلف کسی ایک قبیلے کا دوسرے قبیلے کے ساتھ وفاق تھا۔ اس کی ضرورت کئی وجوہ سے پیش آئی تھی جن میں سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ کمزور قبائل اپنی حفاظت کے لئے طاقتور قبائل سے منسلک ہونا چاہتے تھے۔

عربوں میں حِلف کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ حلف الفضول کے نام سے ایک معاہدہ اسلام سے بہت پہلے ہوا تھا۔ یہ معاہدہ شہر مکہ کے اولین آبادکاروں میں طے ہوا تھا۔ قبیلہ جرہم کے تین سرداروں نے حلف لے کر اقرار کیا تھا کہ اگر کسی کمزور و بے بس پر ظلم ہوا تو ہم اپنے خاندان سمیت اس وقت تک مظلوم کی حمایت کریں گے جب تک ظالم، مظلوم کا حق ادا نہ کردے اور ضعیف کو قوی سے اور اجنبی کو مقامی سے اس کا حق نہ دلادیں۔ ۲۷ حلف الفضول کے نام سے دوسرا معاہدہ ہجرت سے قبل کا ہے اور تاریخ میں بہت مشہور ہے۔

عرب میں قبائل کا ڈھانچہ مسلسل بدلتا رہتا تھا۔ بعض قبائل خوشحال ہوجاتے تھے اور تعداد بڑھ جانے کے باعث جب ایک وحدت میں کام چلانا دشوار ہوجاتا تو دو یا دو سے زیادہ بطون میں تقسیم ہوجاتے، دوسری طرف جب ایک قبیلے کو خوشحالی نصیب نہ ہوتی تو اس کی تعداد میں کمی واقع ہوجاتی۔ اس صورت میں یا تو وہ کسی طاقتور قبیلے کا سہارا ڈھونڈتا یا دوسرے کمزور قبائل کا حلیف بننے کی کوشش کرتا، یہ قبائلی معاشرے میں اس کی بقاء کے لئے از بس ضروری ہوتا۔ اسی لئے مکے کے قریب چند کمزور قبائل زیادہ تر قریش کے دست نگر ہوکر رہ گئے تھے۔ چند قبائل جو اور بھی زیادہ کمزور تھے، آپس میں مدغم ہوگئے اور ان کا نام ''احابیش'' پڑ گیا تھا۔ ۲۸

کسی قبیلے کی عددی اکثریت اس کی قوت اور اس قبائلی نظام میں اس کی حیثیت اور عزت کا سبب بنتی تھی۔ اپنی عددی قوت میں اضافہ کرنے کے لئے عرب قبائل اجنبیوں کو موالی کی حیثیت سے قبول کرلیا کرتے تھے۔ حلیف و مولیٰ کی حفاظت کرنا اور ان کا انتقام لینا کسی بھی قبیلے کی عزت و ناموس کا سوال ہوا کرتا تھا، چونکہ دوسروں پر غلبہ پانے کے لئے اور اپنی تعداد کو بڑھانے کے لئے حلف وولاء کا سہارا لیا جاتا تھا لہٰذا معاہدہ کرنے میں اس امر کی تخصیص نہ تھی کہ حلیف قبائل کا تعلق کسی مخصوص نسلی گروہ سے ہو مثلاً دونوں قبائل عدنانی ہوں یا دونوں قحطانی ہوں یا دونوں کا تعلق مضر سے ہو یا ربیعہ سے۔ بلکہ بعض اوقات عربوں نے اس قسم کے معاہدے ان غیر عرب اقوام سے بھی کیے جو سرزمین عرب میں آکر بس جاتی تھیں۔ اس کی مثال یثرب میں ملتی ہے کہ یہود کے قبائل بنو قریظہ، بنو نضیر، بنی قینقاع عربوں کے بنو اوس و

بنو خزرج کے حلیف تھے۔

بعض اوقات یہ حلف یا معاہدہ دو قبائل کے درمیان ہوتا تھا اور بعض حالات میں ایک فرد (یا چند افراد) اور ایک پورے قبیلے کے درمیان ہوتا تھا۔ جب کوئی آزاد انسان کسی قبیلے کی حفاظت میں آنا چاہتا تو وہ اس کا مولیٰ بن جاتا۔ ایسے میں اس کے لئے دونوں قبائل (یعنی نسبی قبیلہ اور حلفی قبیلہ) کی طرف نسبت کرنا جائز سمجھا جاتا۔ مثلاً فلان التمیمی ثم الوائلی یا فلان الوائلی ثم التمیمی وغیرہ۔

ایسے حلیف جو اپنی حفاظت کی غرض سے کسی طاقتور قبیلے سے معاہدہ کر لیتے تھے یا تو عموماً اسی قبیلے کے اسیر ہوتے تھے اور آزادی کے بعد اس کے معاہد بن جاتے تھے یا پھر کسی دوسرے قبیلے کی گرفت میں ہوتے تھے اور معاہد قبیلے کا کوئی فرد انہیں آزاد کرا دیتا تھا۔ ان لوگوں میں ایسے آزاد افراد بھی شامل ہوتے تھے جو کسی وجہ سے اپنے قبیلے سے الگ ہوکر، کسی دوسرے قبیلے کی پناہ میں آکر ان کے پاس بس جاتے تھے، مثلاً حضرت یاسر بن عامر ۲۹؎ جو یمن کے قبیلے کہلان سے تعلق رکھتے تھے، مکہ آکر بنو مخزوم کے حلیف ہو گئے تھے اور وہ اور ان کی اولاد بنو مخزوم ہی کے افراد میں شامل ہوتی تھی اور یہ مخزوم کے حلیف یا موالی کہلاتے تھے۔

دراصل معاشرے کے قبائلی نظام کے پیش نظر کوئی شخص اپنی زندگی، مال و دولت اور عزت و آبرو کو محفوظ نہیں سمجھ سکتا تھا، جب تک کہ وہ کسی نہ کسی قبیلے سے کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ نہ ہوتا۔ پھر قبائل میں باہمی جنگ و جدل کا سلسلہ بھی چلتا رہتا تھا۔ اس لئے بعض اوقات ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے ساتھ یا بعض قبائل آپس میں مل کر تحالف (Confederation) کا رشتہ قائم کر لیتے تاکہ دشمن قبائل کی غارت گری کے مقابلے پر حلیف قبائل کا متحدہ محاذ پیش کر سکیں۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے حلف کو ممنوع قرار دیا اور فرمایا لَا حِلْفَ فِی الْاِسْلَامِ اس ممانعت کا باعث بھی یہی تھا کہ اسلام میں کل مسلمان باہم بھائی بھائی ہو گئے اس لئے قبائل کی جزوی اور متحاربانہ عہد بندی اسلام کی نظر میں مذموم تھی منشاء یہ تھا کہ قبائل کی اندرونی چپقلش کو ختم کر کے اسلامی اخوت کو مستحکم کیا جائے۔ حِلف کے سلسلے

میں رسول اللہ ﷺ کی ایک اور حدیث بھی مذکور ہے جس میں آپ ﷺ نے بعد از اسلام تو حلف کو بند کیا لیکن عہد جاہلیت کے معاہدوں کے ایفا پر زور دیا۔ یہ نکتہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ فرامین، اسلام کے شوکت کے زمانے، یعنی فتح مکہ کے زمانے کے ہیں۔ ۴۰

۲۔ اِستلحاق:

اس کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی شخص کسی شخص کو اپنے نسب میں داخل کر لیتا تھا، اس طور سے یہ نیا شخص اس خاندان کا فرد بن جاتا تھا، ایسے شخص کو مُستلحق اور دَعِیّ کہتے تھے۔ یہ مُستلحق اور دَعِیّ کبھی غلام، قیدی یا مولیٰ بھی ہوتا تھا۔ عہد جاہلیت میں اس کی ایک مثال ذکوان کی ہے جو بنی امیہ کے جد امیہ کا غلام تھا۔ امیہ نے ذکوان کا اپنے نسب سے استلحاق کر لیا اور اس کی کنیت ابوعمرو رکھی اس طرح ذکوان کا نام ابا عمرو بن امیہ پڑ گیا اور اسی نام سے وہ مشہور ہوا۔

عرب جاہلیہ میں ایسے ادعیاء کی کمی نہیں تھی۔ یہ ادعیاء اس بات کے بھی مجاز ہوتے تھے کہ دوسروں کو اپنا مستلحق اور دعی بنالیں۔ چنانچہ زیر نظر دور میں بنو خلیج کا پتہ چلتا ہے جو قریش کے ادعیاء تھے اور خود بنو خلیج کا دعی ابن ہرمہ تھا۔ ۴۱ یہ استلحاق انفرادی بھی ہوتا تھا اور اجتماعی بھی۔ آخر الذکر صورت میں پورا قبیلہ، بطن یا فخذ، رشتۂ استلحاق میں منسلک ہو جاتا تھا۔ استلحاق عموماً اس صورت میں وجود میں آتا تھا کہ ایک گروہ کسی قبیلے میں آکر مقیم ہو جاتا تھا یا پھر اپنے دشمنوں کے خلاف ان سے مدد طلب کرتا تھا۔ ایسے ادعیاء عموماً اپنے مُستلحق کے خاندان کے افراد سمجھے جاتے تھے اور صریح کی طرح اپنے مُستلحق کی وفات کے بعد میراث کے حقدار ہوتے تھے۔ ۴۲ استلحاق کے ذریعہ دونوں فریق فائدے میں رہتے تھے۔ ایک طرف تو مُستلحق یا دَعِیّ اغیار کی دست برد سے محفوظ ہو جاتے تھے تو دوسری طرف استلحاق کرنے والے قبائل کو اپنی تعداد میں اضافے کا موقع ملتا تھا۔ ۴۳

مستلحق کی ضد ''خلیع'' تھی۔ یعنی کسی شخص کو ناپسندیدہ امور کی وجہ سے قبیلے سے خارج کر دیا جاتا۔ ایسا شخص ''خلیع'' کہلاتا تھا۔ ۴۴

۳۔ مُواخاۃ:

حلف ہی سے مشابہ ایک اور رواج مواخاۃ کا تھا۔ یہ بھائی چارہ کبھی افراد کے مابین اور کبھی قبائل کے درمیان ہوتا تھا۔ رشتۂ مواخاۃ استوار کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ کمزور افراد و قبائل کو حامی اور محافظ مل جائیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ حامی اور محافظ قبائل و افراد کی عددی قوت میں اضافہ ہو۔ یوں اس مواخاۃ کا فائدہ مخصوص سماجی حالات کی وجہ سے دونوں فریقوں کو ملتا تھا۔ (یہ طریقہ اسلامی عہد میں بھی ملتا ہے۔) ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے انصار ومہاجرین کے مابین مواخاۃ قائم کر کے انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا تا کہ وہ ایک دوسرے کے مدمقابل آنے کے بجائے ایک دوسرے کا دست و بازو بن جائیں۔ ایک مواخاۃ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں بھی کرائی تھی، کیونکہ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے بہت سے مسلمان اپنے قبیلے کی اعانت و امداد سے محروم ہو گئے تھے۔

۴۔ استرقاق (یعنی غلامی):

غلامی نوعِ انسانی کی ہم عمر ہے۔ شاید اس کی وجہ انسانی فطرت کی استبدادیت ہے کہ وہ اپنے سے کمتر پر غلبہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ غلامی کا رواج قدیم سے قدیم معاشروں میں بھی ملتا ہے، قبلِ اسلام عرب میں غلامی کا اسی طرح رواج تھا جس طرح قرونِ قدیمہ و وسطیٰ میں اس کا رواج باقی دنیا میں پایا جاتا تھا۔ عرب میں غلاموں کی اکثریت سیاہ فام حبشی الاصل لوگوں پر مشتمل تھی تاہم کچھ غلام سفید فام اور غیر حبشی النسل بھی ہوتے تھے۔ دیگر بڑے شہروں کی طرح مکہ کی منڈی میں بھی ان کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ اس دور میں غلاموں کا سب سے مشہور تاجر عبداللہ بن جدعان تھا۔ ۳۵

اس دور میں غلام ان تمام معلوم ذرائع سے حاصل کیے جاتے تھے جو اس عہد کی متمدن اقوام میں رائج تھے، یعنی

...... جنگ میں ہاتھ آنے والے مغلوب افراد قیدی بنا لیے جاتے تھے۔

...... اکا دکا، بھولے بھٹکے اور تنہا سفر کرنے والے مسافروں کو بھی اغوا کر کے غلام بنا لینے کا رواج تھا۔

...... "خلیع" اگر چالاک لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتے تو انہیں بھی غلام بنا لیا جاتا تھا۔

...... عرب، حبشہ اور قرب و جوار کے ممالک سے غلاموں کی خرید و فروخت بھی کرتے تھے۔ قبیلۂ قریش میں بھی یہ تجارت جاری تھی، جب کوئی شخص کسی غلام کو خرید لیتا تو اس کے گلے میں رسی ڈال دیتا اور اسے رسی سے پکڑ کر گھر لے جاتا تھا۔ ۳۶ع

ایسے اسیران جنگ جو فاتح قبائل کے ہاتھ آتے تھے انہیں گرفتار کرنے والے عموماً ان کے بال کاٹ کر اپنے ترکش میں رکھ لیتے تھے اور جب تک ایسے لوگ اپنی آزادی خرید نہ لیں ان کے بال ان کے گرفتار کنندہ اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے۔ ۳۷ع

جاہلی معاشرے میں غلاموں کی کثرت تھی۔ خصوصاً امراء اور ملوک کے یہاں اس کی کوئی حد نہیں تھی۔ ان کے غلاموں اور کنیزوں کی تعداد سینکڑوں، ہزاروں سے متجاوز تھی چنانچہ جب ذوالکلاع حمیری کا وفد خلیفہ ابوبکر صدیقؓ کے پاس آیا تو اس کے خاندان اور قبیلے کے افراد کے علاوہ ایک ہزار غلام بھی اس کے ہمرکاب تھے۔ ۳۸ع الغرض، اشراف عرب میں کسی کا گھر غلاموں سے خالی نہ تھا۔

عرب کے لوگ باندیوں سے شادیاں بھی کرتے تھے اور ان سے جو اولاد ہوتی تھی انہیں بھی غلام ہی سمجھا جاتا تھا۔ البتہ اگر وہ کوئی بڑا کام انجام دیتے تو انہیں آزاد کر کے آقا اپنا بیٹا بنا لیتے تھے۔ پھر ایسے بیٹوں اور آزاد ماؤں کی اولاد میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ اس کی ایک مثال مشہور جاہلی شاعر عنترہ بن شداد العبسی کی ہے۔ ۳۹ع جس کا قصیدہ "سبعہ معلقات" میں شامل ہے۔

عرب جاہلیہ میں غلاموں کو آزاد کرنے کا بھی تصور تھا۔ آزادی کا ایک طریقہ "مکاتبت" تھا۔ کوئی غلام یا لونڈی اپنی آزادی کے لئے اپنے آقا کو ایک معاوضہ ادا کرنے کی پیشکش کرے اور جب آقا اسے قبول کرلے تو دونوں کے درمیان شرائط طے ہو جائیں۔

ضروری نہیں کہ معاوضہ مال ہی کی شکل میں ہو آقا کے لئے کوئی خدمت انجام دینا بھی معاوضہ بن سکتا تھا بشرطیکہ فریقین اس پر راضی ہوں۔

آزادی کا ایک طریقہ یہ تھا کہ آقا اپنے غلام کی آزادی کے لئے مرنے سے قبل وصیت کر دے تو آقا کے مرنے پر یہ غلام آزاد ہو جاتا تھا۔ یہ طریقہ ''تدبیر'' اور اس طریقے سے آزادی حاصل کرنے والا غلام ''مُدَبَّر'' کہلاتا تھا۔ غلام کو مُدَبَّر کرنے کے بعد عموماً آقا اس کو نہ اپنی زندگی میں فروخت کر سکتا تھا اور نہ بطور ہبہ و بخشش کسی کو عطا ہی کر سکتا تھا۔

آزادی کی ایک صورت یہ ہوتی تھی کہ غلام زرِ فدیہ ادا کر دے اور ایک صورت یہ تھی کہ آقا اس کی کسی خدمت پر خوش ہو کر اسے آزاد کر دے۔

حصولِ آزادی کے بعد یہ آزاد کردہ غلام ''موالی'' کہلاتے تھے اور ان کی نسبت ان کے آزاد کنندہ کے قبیلے کی طرف ہوتی تھی اور وہ مثل رشتہ دار کے سمجھے جاتے تھے اور وراثت میں بھی حصہ دار ہوتے تھے۔

اب تک کے بیان سے جو صورت حال سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ عرب جاہلیہ میں انفرادی و اجتماعی بقا کے لئے یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ ہر قبیلہ اپنی تعداد بڑھائے۔ تعداد میں اضافے کے کئی طریقے تھے جو اوپر بیان کیے گئے۔ یہی ضرورت گویا طریقہ وُلاء کی اساس تھی۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی تھی اور وہ یہ کہ ایسے ملک میں جہاں کوئی منظم حکومت نہ ہو اور جو شدید قسم کی لامرکزیت کا شکار ہو، ان لوگوں کی جان و مال کیسے محفوظ رہے جو یہاں کسی ضرورت یا کسی مجبوری کی وجہ سے آ رہے ہوں۔ اس غرض سے یہ طریقہ رائج کیا گیا کہ ایسے لوگوں کو موالات کے طریقے سے کسی قبیلے کا رکن بنا لیا جائے اور یہ طریقہ ادغامِ اغیار جیسا کہ آج کی دنیا میں بھی جاری ہے، اس عہد میں بھی رائج تھا۔[۲۴]

یہ نظامِ موالات جو عرب میں جاری تھا، بلاشبہ کوئی نیا نظام نہیں تھا بلکہ اُس عہد میں قریب قریب ہر قوم کو کم از کم غیر ملکی باشندوں اور ملک میں مفتوح، مغلوب اور آزاد شدہ غلاموں کے مسائل درپیش تھے، جسے مختلف اقوام نے اپنی سوچ اور فکر کے مطابق حل کیا؛ مثلاً قدیم اہلِ

ہند نے مفتوح ومغلوب اقوام کو جو غیر آریائی تھیں، عام انسانی حقوق سے بھی محروم کر کے انہیں اچھوت یا شودر کا نام دے کر معاشرے کا سب سے نچلا طبقہ بنادیا جن کی وجہِ تخلیق اور واحد ذمہ داری برتر ذاتوں کی خدمت گاری ٹھہری۔ وہ مر کر بھی اس غلامی سے آزاد نہیں ہو پاتے تھے۔ اسی طرح اہل یونان اور ان کے جانشین اہل روم نے اپنے زیر نگیں غیر اقوام کو کسمپرسی میں رکھا، ان کی حیثیت آزاد کردہ غلام سے زیادہ نہیں تھی اور وہ زندگی کی ان تمام سہولتوں سے قریب قریب محروم تھے جو روم و یونان کے عام شہریوں کو میسر تھیں۔ یہی حال ایران کا تھا جہاں غیر اقوام غلاموں کے درجے میں رکھی جاتی تھیں اور نسل ایرانی سے ہمسری اور ہم چشمی کی جرأت بھی جرم سمجھی جاتی تھی۔ ہندوستان، ایران اور یونان وروم میں غیر اقوام سے اس سلوک کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے فلسفیوں اور دانشوروں نے انہیں یہ نظریہ عطا کیا تھا کہ دیگر اقوام کے مقابلے میں انہیں ایک الوہی تقدس حاصل ہے اور انہیں دیگر اقوام پر حکومت کرنے کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہے۔[۱]

یہ عرب جاہلیہ کی کم مائگی تھی کہ ان میں ایسا کوئی مفکر پیدا نہیں ہوا جس نے سامی نسل کی برتری کا نعرہ لگایا ہو لہٰذا عربوں کے ذہن اس تنگ نظری سے خالی تھے۔ اُن میں ذہنی اعتبار سے بڑی وسعت اور فکری اعتبار سے بڑی سادگی تھی۔ اسی لئے جب اُس معاشرے میں غیر عرب یا آزاد کردہ غلام در آئے تو عربوں نے انہیں اپنے اندر ضم کرلیا اور یہ ادغام اتنا مکمل تھا کہ اس کے بعد عرب و غیر عرب کی کوئی تمیز باقی نہ رہی اور اس سرزمین میں جو بھی آیا وہ عرب ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب جاہلیہ میں یمن کے اُسرۂ حاکمہ، اَبنائے احرار[۲] اور حجاز کے یہود[۳] قبائل کے سوا تمام غیر عرب آباد کار خواہ ان کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو، اس طور سے باہم مل جل گئے تھے کہ عرب کے سوا گویا کوئی اور یہاں بستا ہی نہیں تھا۔

المختصر، عربوں نے غیر عربوں اور ایک قبیلے نے دوسرے قبیلے کو ان کی مرضی سے اپنے میں مدغم کرنے کی غرض سے "نظامِ ولاء" رائج کیا اور یوں اس محدود معاشرے میں جو قبائلی نوعیت کا تھا۔ ایک گونہ وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس پیمانِ ولاء سے وابستہ

دونوں ہی فریقوں کو فائدے پہنچے۔ وہ افراد جو کسی قبیلے سے عقدِ مُوالات کرتے تھے، ان کو جان و مال کی حفاظت کی ضمانت اور حامیوں کی ایک جماعت مل جاتی تھی۔ اسی طرح وہ قبائل جو ایسے افراد کو اپنا موالی بنا لیتے تھے انہیں اپنی تعداد بڑھانے اور اپنے حریفوں کے مقابلے میں طاقت بہم پہنچانے کا موقع مل جاتا تھا۔

عربی زبان میں ولاء کے معانی و مفاہیم سے جو بحث کی گئی ہے، وہ بابِ اوّل میں گزر چکی ہے، نیز آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبوی اور اشعارِ عرب کے حوالے سے موالی کی درجہ بندی بھی جا چکی ہے تاہم اب موقع ہے کہ موالی کی ان اقسام پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے۔

ا۔ موالی القرابت والولادت:

نسب و نسل سے قائم ہونے والی قرابت کا دائرہ عرب کے معاشرے میں بڑا وسیع تھا۔ دنیا کی شاید ہی کسی قوم نے اپنے شجرۂ نسب کی حفاظت میں اتنا اہتمام کیا ہو، جتنا عربوں نے کیا ہے۔ (صدر اسلام میں بھی اس علم کی جانب خصوصی توجہ دی گئی) علم انساب کی یہ اہمیت اس لئے تھی کہ اس کے ذریعے نسلی نجابت اور نسبی رشتوں کی حفاظت و صیانت ممکن تھی۔[۴۴] اسی نسب کے محور پر عرب جاہلیہ کی معاشرتی زندگی گردش کرتی تھی اور یہی رشتے اس کے سماج کے تانے بانے تھے۔ چنانچہ بوقتِ مفاخرت ان تعلقات پر فخر کرتے تھے۔ وہ محالفت و مُوالات جو اس طور سے وجود میں آتی تھی، دوسری تمام اقسام حِلف و ولاء سے زیادہ قوی اور موثر ہوتی تھی، اسی لئے چچازاد بھائی کو مَولیٰ کہا جاتا تھا، جو افراد کے مابین قریب ترین رشتہ اتحاد سمجھا جاتا تھا۔

موالی کی اس قسم کو دو مزید درجوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

(الف) موالیٔ قرابت　　　(ب) موالیٔ ولادت

(الف) موالیٔ قرابت:

یہ قرابت شادی اور نکاح کے ذریعے قائم ہوتی تھی۔ عرب جاہلیہ میں یہ طریقہ رائج

تھا کہ ایک فرد شادی بیاہ کے ناتے کسی غیر قبیلہ کا مولیٰ بن جاتا تھا۔ یہ ولاء جواز دواج کے تعلق سے وجود میں آتی تھی، اس میں قبیلے کے صریح اور غیر صریح دونوں ہی افراد شامل ہوتے تھے۔ اس طور سے داماد، خسر، سالے ایک دوسرے کے موالی بن جاتے تھے۔ ۴۵ء

(ب) مولیٰ ولادت:

یہ ولاء خون کے رشتے سے وجود میں آتی تھی۔ ایک مورثِ اعلیٰ کی نسل میں شامل افراد جو ابنائے عم ہوتے تھے، ایک دوسرے کے مولیٰ کہلاتے تھے، مثلاً بنو ہاشم اور بنو امیہ جو عبدِ مناف کی اولاد میں تھے، باہم رشتۂ مُوالات میں منسلک تھے اور ایک دوسرے کے مولیٰ کہلاتے تھے۔ محض دو بھائیوں کی اولاد ہی نہیں بلکہ اوپر سے سلسلۂ نسب کا اتحاد بھی ولاء کے انعقاد کا باعث ہوتا تھا۔ چنانچہ قریش اور بنو غفار کہ ان کا مورثِ اعلیٰ کنانہ تھا، بنو اعمام اور موالی ہوئے۔ ایسے موالی ایک دوسرے کے وارث بھی ہوتے تھے۔

۲۔ مولیٰ الحلف والیمین:

بعض وجوہ کی بنا پر کوئی شخص غیر قبیلے کے فرد سے معاہدہ کر لیتا تھا اور اس پیمان بندی کے ذریعے وہ اس قبیلہ کا مولیٰ بن جاتا تھا۔ ایسے شخص کو مولیٰ الحلف یا مولیٰ الاصطناع کہا جاتا تھا۔ یہ مُوالات متعدد طریقوں سے وجود میں آتی تھی۔ کبھی مُحالفت یعنی باہمی عہد و پیمان سے، کبھی مُخالطت یعنی کسی فرد کے قبیلہ میں ایک عرصہ تک قیام کرنے کے باعث، اور کبھی مُلازمت یعنی کئی پشتوں سے تعلقات کے نتیجہ میں ایک فرد کے کسی قبیلہ کے ساتھ وابستہ ہو جانے کے سبب سے ولاء کا انعقاد ہو جاتا تھا۔ ۴۶ء ابو البکیر بن عبد یالیل حضرت عمر فاروقؓ کے دادا نفیل بن عبد العزیٰ کے حلیف اور اس رشتہ سے ان کے مولیٰ تھے۔ ۴۷ء عبداللہ بن مسعودؓ کے والد مسعود بن غافل ہذلی، عہدِ جاہلیت میں عبداللہ بن الحارث کے، جن کا تعلق بنی زہرہ سے تھا، حلیف تھے۔ ۴۸ء نیز مرثد بن ابی مرثد الغنوی اور ان کے والد ابو مرثد دونوں حمزہؓ

بن عبدالمطلب کے حلیف تھے۔ ۴۹ وغیرہ۔

یہود یثرب مخالطت و ملازمت کے باعث اوس وخزرج کے موالی بن گئے تھے۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر، خزرج کے موالی تھے، جبکہ بنو قریظہ اوس کے موالی تھے۔ ۵۰ ان موالی کے حقوق کا تعین بھی کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ان کی موت کے بعد صلبی وارث نہ ہونے کی صورت میں ان سے موالات کرنے والا ان کا وارث بھی ہوتا تھا۔ اسی طرح اگر یہ لوگ مارے جاتے تو ان کی دیت بھی ان سے موالات کرنے والا وصول کرتا تھا۔ حقوق وفرائض میں انہیں مساوی سمجھا جاتا اور یہ اپنے موالات کنندہ خاندان میں شادی بیاہ بھی کرتے تھے اور یوں موالی الحلف والیمین کے ساتھ ساتھ یہ موالی القرابت بھی بن جاتے تھے۔ اس کی ایک مثال عبیداللہ ابن جحش کی ہے، یہ بنو امیہ کے سردار ابو سفیانؓ بن حرب کا موالی الحلف تھا۔ عبیداللہ کا نکاح ابو سفیانؓ کی صاحبزادی ام حبیبہ سے ہوا تھا۔ ۵۱

اس طرز کی موالات میں نہ مذہب کی قید تھی نہ نسل کی۔ اسی لئے رشتہ ولاء میں بت پرست، یہود و نصاریٰ بھی منسلک نظر آتے ہیں۔ ۵۲

۳۔ موالی النعمت:

آزاد کردہ غلام موالی النعمت کہلاتا تھا۔ غلاموں کی آزادی کے مختلف طریقے تھے، غلامی سے آزادی حاصل کرنے والے افراد کو معاشرے میں شامل کرنے کے لئے یہ طریقہ رائج کیا گیا تھا کہ انہیں اپنے آزاد کنندہ یعنی سابق آقا کی ولاء حاصل ہو جاتی تھی اور یوں وہ بے یار و مددگار نہیں رہتے تھے، بلکہ ان کی پشت پر ایک ایسی طاقت ہوتی تھی، جو بوقت ضرورت ان کی حامی و ناصر ہوتی۔ عموماً یہ ولاء جو سابق آقا کو اپنے سابق غلام کی ملتی تھی، ایک موروثی حق متصور ہوتی تھی۔ اور نہ صرف یہ کہ آزاد کنندہ اور آزاد شدہ افراد ایک دوسرے کے موالی کہلاتے بلکہ ان کے خاندان کو پشتہا پشت تک ایک دوسرے کا موالی کہا جاتا تھا۔ چنانچہ صبیح جو ابو احیحہ سعید بن عاص بن امیہ کے موالی تھے، سعید کے بعد اس کے بیٹوں کے اور ان کی اولاد سعید کے پوتوں کی موالی تھی۔

یہ بھی قاعدہ تھا کہ سابق آقا ایسے موالی کی ولاء کسی دوسرے شخص کی جانب منتقل کردیتے تھے اور یوں یہ موالات ایک نئے خاندان میں قائم ہوجاتی تھی۔

مکاتبت کی صورت میں اگر رقمِ کتابت، غلام کے علاوہ کوئی دوسرا فرد ادا کرتا تھا تو آزادی کے بعد ولاء، آزاد کنندہ سابق آقا کے بجائے، زرِ کتابت ادا کرنے والے شخص کو حاصل ہوجاتی تھی۔ ۵۳

زرِ کتابت اگر آزادی حاصل کرنے والا شخص اپنی محنت سے کمائی ہوئی رقم سے ادا کرتا تو ایسی صورت میں کبھی کبھی وہ سابق آقا سے موالات قائم نہ کرتا۔ کبھی سابق آقا خود اس بات کا اعلان کردیتا تھا کہ وہ حقِ ولاء سے دستبردار ہوتا ہے۔ ایسے آزاد شدہ شخص کو سائبہ کہتے تھے اور اسے پیمانِ ولاء باندھنے کی آزادی ہوتی تھی اور اس کے ترکہ سے سابق آقا کو کچھ نہ کچھ ملتا تھا۔ ایسے ہی سائبہ سالم ۵۴ مولیٰ ابوحذیفہؓ ۵۵ تھے۔

ایسے موالی حصولِ آزادی کے بعد بھی معاشرے میں دیگر افراد سے ایک طبقہ کم تر محسوب ہوتے تھے اور آزاد و غلام کے درمیانی طبقے میں شمار کیے جاتے تھے۔ وہ اس حیثیت سے آزاد تھے کہ انہیں فروخت نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن اس اعتبار سے وہ آزاد شخص سے فروتر تھے کہ نکاح و میراث میں آزادوں کی طرح انہیں آزادیٔ عمل حاصل نہ تھی۔ موالی کسی آزاد عورت سے شادی نہ کرسکتے تھے، اسی طرح ان کی دیت آزادوں کی دیت کے نصف کے بقدر تھی، گویا آزادی کے بعد بھی انہیں کمتر ہی سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح اگر ان پر قصاص واجب ہوجاتا تو آزادوں کے مقابلہ میں نصف دیت کی ادائگی پر پابند کیے جاتے تھے۔ ایسے موالی کی موت کے بعد ان کے سابق آقا اور حال موالی ان کے وارث بھی ہوتے تھے۔ انہیں موالی النعمت کہنے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اگرچہ سابق آقا ایسے موالی کے وارث ہوتے تھے مگر خود یہ اپنے آقاؤں کے وارث نہ ہوسکتے تھے۔

حاصلِ بحث یہ کہ عرب جاہلیہ کا معاشرہ تین طبقات میں منقسم تھا۔ ایک آزاد یا حُر، دوسرے موالی اور تیسرے غلام (عبد)۔ آزاد کا یہ طبقہ بھی دو ذیلی طبقات میں تقسیم تھا، ایک

صریح اور دوسرا غیر صریح۔ صریح وہ تھا جس کا متعلقہ قبیلے سے نسلی تعلق ہوتا تھا اور بزرگ قبیلہ سے خونی رشتہ رکھنے کی وجہ سے افراد قبیلہ سے اس کا تعلق خون کا ہوتا تھا، مثلاً حرب بن امیہ اور ابوسفیانؓ بن حرب، بنوامیہ کے صریح افراد تھے اور اس خاندان کے مورث اعلیٰ امیہ بن عبد شمس کی اولاد میں تھے۔ اسی طرح بنوعبدِ مناف اور قریش سے انہیں خونی رشتے کی بنا پر انتساب تھا۔ عبداللہ بن جحش اور عبید اللہ بن جحش مُحالفت کے ناطے سے حرب اور ابوسفیانؓ سے وابستہ تھے۔ اسی لئے بنوامیہ اور بنوعبدِ مناف وقریش سے ان کی وابستگی اُن بنیادوں پر نہ تھی، جن پر ان کے حلفاء، حرب وابوسفیان کی تھی اور وہ بنوامیہ، بنوعبدِ مناف اور قریش کے غیر صریح افراد تھے۔ ان قبائل میں ان کی حیثیت صریح افراد سے کمتر تھی۔ گو جملہ حقوق وفرائض میں وہ ان کے مساوی محسوب ہوتے تھے۔ صریح وغیر صریح دونوں ہی کی حفاظت جان، صیانت مال اور حمایت آبرو کی خاطر قبائل کی رگ انتقام پھڑک اٹھتی تھی اور ان کی تمام قوت عمل اس نقطۂ نظر پر مرکوز ہوجاتی تھی کہ اس کا انتقام لینا اور اس کی آبرو کی حفاظت کرنا ان کا انفرادی واجتماعی فریضہ ہے۔

جس طرح افراد قبائل اپنے بھائی، بھتیجے اور خون کے رشتے سے وابستہ افراد کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے تھے، اسی طرح وہ اپنے موالی کی خاطر بھی اپنی جان، مال اور عزت کو داؤ پر لگانے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ مگر فی الجملہ صریح کے مقابلے میں غیر صریح یا مولیٰ کو کسی قدر کمتر حقوق حاصل تھے جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے، مثلاً آزاد کے مقابلے میں مولیٰ کی دیت نصف ہوتی تھی۔ ارتکاب جرائم کی صورت میں اس پر جو قصاص لازم آتا تھا وہ بھی آزاد کے قصاص سے نصف ہوتا تھا۔ اگر اس کی صُلبی اولاد نہ ہوتی تو اس کے تمام ترکہ کا حقدار اس کا سابق آقا اور حال مولیٰ ہوتا تھا اور صلبی اولاد کی موجودگی میں اسے ترکے کا ثلث ملتا تھا۔

معاشرے کا سب سے کمتر طبقہ غلاموں کا تھا، جن کی تفصیل موضوع زیر بحث سے خارج ہے۔

خلاصۂ بحث:

عرب خواہ بدوی ہوں یا حضری، ان کا طرزِ معاشرت قبائلی تھا؛ عہدِ جاہلیت میں قبیلہ ہی وہ وحدت تھی جس پر عربوں کی اجتماعی زندگی کا دار و مدار تھا۔ جہاں قبائلیت ہوتی ہے وہاں سیاسی لامرکزیت ہوتی ہے۔ عرب معاشرے میں ہر قبیلہ ایک اکائی اور سیاسی اعتبار سے خودمختار تھا۔ پورے عرب میں کسی ایسی منظم حکومت کا پتہ نہیں چلتا جس کے سامنے سارے قبائل جوابدہ ہوں۔ مرکزی حکومت کی عدم موجودگی، خصوصاً ایسی حالت میں، جبکہ ملک میں معاشی وسائل محدود ہوں، آئے دن کی جنگوں کا باعث تھی، درحقیقت ایک عرب (خصوصاً بدوی عرب) کی زندگی سخت نامساعد حالات میں بسر ہوتی تھی، اکثر اوقات خوراک کے وسائل و ذرائع، آبادی کے اعتبار سے کافی نہیں ہوتے تھے، چنانچہ ہر طاقتور کے ہاں یہ رجحان پایا جاتا تھا کہ کمزور کے پاس جو وسائل حیات ہیں ان پر قبضہ کرلیا جائے۔ جس کی وجہ سے معاشرہ لاقانونیت کا شکار ہوگیا تھا۔

اب ایسی حالت میں جبکہ طاقت و عصبیت کا دار و مدار قبائل پر ہو، ملک میں عام لاقانونیت کا چلن ہو، کوئی مربوط سیاسی نظام بھی نہ ہو تو ہر قبیلہ اس بات کی کوشش کرے گا کہ اپنی قوت اور طاقت میں اضافہ کرے۔ قوت میں یہ اضافہ کثرت تعداد ہی کی صورت میں ممکن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عربوں کے نزدیک اولادِ نرینہ کی کثرت انتہائی ضروری تھی۔ عرب جاہلیہ میں سرداری کے لوازمات میں سے ایک کثیر العیال ہونا بھی تھی۔ ہر قبیلہ اپنی تعداد بڑھانا چاہتا تھا، جس کے لئے انہوں نے کئی طریقے اپنا رکھے تھے، مثلاً عرب بیک وقت متعدد عورتوں سے نکاح کیا کرتے تھے، تاکہ زیادہ سے زیادہ بیٹے حاصل کیے جاسکیں، نیز وہ دوسروں سے رشتۂ ولاء قائم کرکے اپنے لئے زیادہ سے زیادہ موالی حاصل کرتے تھے۔ عرب جاہلیہ میں موالی حاصل کرنے کے کئی طریقے تھے، مثلاً حلف، استلحاق، مؤاخاۃ اور استرقاق۔

عربوں نے غیر عربوں اور ایک قبیلے نے دوسرے قبیلے کو ان کی مرضی سے اپنے

میں مدغم کرکے اپنی طاقت بڑھانے کی غرض سے باقاعدہ "نظام ولاء" رائج کیا تھا۔ اس پیمان ولاء سے وابستہ دونوں ہی فریقوں کو فائدہ پہنچتا تھا۔

وہ افراد یا کمزور قبائل جو کسی طاقتور قبیلہ سے عقدِ موالات کرتے تھے، ان کو جان و مال کی حفاظت کی ضمانت اور حامیوں کی ایک جماعت مل جاتی تھی، اسی طرح وہ قبائل جو ایسے افراد اور کمزور قبائل کو اپنا موالی بنالیتے تھے، انہیں اپنی تعداد بڑھانے اور اپنے حریفوں کے مقابلے میں طاقت بہم پہنچانے کا موقع مل جاتا تھا۔

عرب جاہلیہ میں موالی کی چند اقسام تھیں مثلاً (۱) مولی القرابت: یعنی وہ موالی جو قرابتداری اور رشتہ داری کی وجہ سے حاصل ہوتے تھے۔ یہ ولا ازدواج کے تعلق سے وجود میں آتی تھی۔ اسی طور سے داماد، خسر، سالے، ایک دوسرے کے موالی بن جاتے تھے۔ (۲) مولی ولادت: یہ ولاء خون کے رشتہ سے وجود میں آتی تھی۔ ایک مورثِ اعلیٰ کی نسل میں شامل افراد ایک دوسرے کے مولیٰ کہلاتے تھے۔ (۳) مولی الحلف والیمین: بعض وجوہ کی بناپر کوئی شخص کسی غیر قبیلہ کے فرد سے معاہدہ کرلیتا تھا، اس پیمان بندی کے ذریعہ وہ اس قبیلہ کا مولی بن جاتا تھا۔ اس طرز کی موالات میں مذہب یا نسل کی قید نہ تھی۔ (۴) مولی العتق: غلاموں کو آزاد کرکے انہیں اپنا مولیٰ بنالیا جاتا تھا...... ہر قسم کے موالی کے حقوق و فرائض اور سماجی مرتبہ میں فرق تھا تاہم قبائلی معاشرہ میں نظامِ ولاء حصول طاقت کا ایک ذریعہ اور اہم ادارہ تھا۔



حوالہ جات:

۱۔ یہاں عہد جاہلیت سے مراد ہے دعوت اسلام سے پہلے خصوصاً ہجرت نبویؐ سے قبل کا زمانہ۔ کیونکہ اس عہد کے جزیرۃ العرب میں مشرکین عرب کا اجتماعی وسیاسی قانون موثر تھا جو کسی وحی یا الہام کے تابع نہیں تھا۔ اس لئے وہ زمانہ "جہل وھویٰ" کا زمانہ تھا۔ قرآن مجید میں جاہلیہ کا لفظ چار مرتبہ استعمال ہوا ہے: ۱۔ ظن الجاھلیہ (آل عمران: ۱۵۴) ۲۔ افحکم الجاھلیہ (مائدہ:

۵۰) ۳۔تبرج الجاهلیة الاولیٰ(الاحزاب:۳۳) ۴۔حمیة الجاهلیه(الفتح:۲۶)۔
جہل سے مراد لاعلمی کے علاوہ درشتی، تختی، بربریت، خشونت، اکھڑپن اور قوانین الٰہیہ اور خدا سے ناواقفیت اور حالت کفر و بت پرستی بھی ہے مشہور جاہلی شاعر عمرو بن کلثوم نے بھی اپنے معلقہ میں لفظ "جہل" درشتی کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

فنجهل فوق جهل الجاهلینا

(ہم اکھڑ لوگوں سے بھی بڑھ کر تختی اور درشتی سے پیش آئیں گے)

جہل کی ضد علم بھی ہے اور حلم بھی (الزمخشری، محمود بن عمر (م ۵۲۸ھ) الکشاف، (مطبعہ الاستقامہ، قاہرہ، طبع اول، ۱۹۴۶ء)، جلد ۳، ص ۵۳۷ و ۵۳۸۔ نیز بذیل تفسیر سورہ آل عمران، آیت ۱۵۴، المائدہ، آیت ۵۰، الفتح، آیت ۲۶۔)

۲۔ ابن خلدون، علامہ عبدالرحمٰن (م ۸۰۸ھ) مقدمہ (دار صادر، بیروت، س ن)، ص ۱۰۱۔

۳۔ ایضاً، ص ۲۹۸ - ۲۹۹۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۰۲۔

۵۔ موسیو گستاؤلیبان، تمدن عرب، مترجم سید علی بلگرامی (مقبول اکیڈمی، لاہور) ص ۱۹۱۔

۶۔ ایضاً، ص ۱۹۳۔

۷۔ عرب قدیم کا سب سے متمدن اور سرسبز خطہ یمن تھا جو کہ جزیرۂ عرب کے جنوب میں واقع ہے۔ وقتاً فوقتاً یہاں عمالیق، اہل معین، عاد، سبا اور حمیر کی عظیم الشان سلطنتیں قائم ہوئیں، جنہوں نے بڑی بڑی عمارتیں بنائیں جن کی عظمت کے آثار آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اہلِ یمن کے تجارتی تعلقات اہلِ ہند، ایران اور حبشہ کے ساتھ قائم تھے۔ یہاں ظہور اسلام سے صدیوں پہلے آل سبا کی حکومت قائم ہوئی۔ ان کے بعد انہیں کی نسل بنام آلِ حمیر حکمران ہوئی۔ یمن کی خودمختار حکومت کا خاتمہ ۵۲۵ء میں اہلِ حبشہ کے تسلط سے ہوا۔ یمن پر حبشیوں کی حکومت تقریباً ۷۰ سال تک رہی۔ ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایرانیوں نے حبشیوں کو شکست دے کر یمن پر قبضہ کرلیا اور ظہور اسلام تک یمن، ایرانی سلطنت کا ایک حصہ رہا۔ آخری ایرانی گورنر باذان نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت قبول کرلی اور اس کے ساتھ ہی یمن اسلام کی عمل داری میں آگیا۔ یمن کا سیاسی نظام خاصا ترقی یافتہ اور منظم تھا۔ (عبدالملک بن ہشام (م ۲۱۳ھ)،

السیرۃ النبویہ، مصطفیٰ بابی حلبی، مصر، ۱۳۵۵ھ، جلد ا، ص ۱۳ تا ۲۷۔ ندوی، سید سلیمان، تاریخ ارض القرآن، مجلس نشریات اسلام، کراچی، جلد ا، ص ۲۳۶ تا ۲۹۴۔)

(موسیو گستاؤلیبان نے قبل مسیح کے قدیم حوالوں سے یمن کی مدنیت، شہر مآرب اور سدِ مآرب کی تفصیل بیان کی ہے، جو عرب مورخین کے بیانات کی تصدیق کرتی ہے۔ دیکھئے تمدن عرب، ص ۱۹۲ تا ۱۹۵۔ نیز العرب قبل الاسلام از ڈاکٹر جواد علی۔)

۸ اہل یمن نے زراعت کی ترقی کے لئے وادیوں میں بارش کے پانی کو روک کر بڑے بڑے بند بنائے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور سدِ مآرب ہے، جس کا قرآن میں بھی ذکر ہوا ہے۔ (سورۂ سبا: ۱۵ - ۱۶) شہر مآرب کے جنوب میں دو پہاڑ ہیں جنھیں کوہ ابلق کہا جاتا ہے۔ دونوں پہاڑوں کے بیچ میں وادی اذنیہ ہے۔ پہاڑوں سے نیز ادھر ادھر سے پانی جمع ہوکر وادی میں ایک دریا سا جاری ہو جاتا ہے۔ سبا نے ان پہاڑوں کے بیچ میں تقریباً ۸۰۰ قبل مسیح میں سدِ مآرب کی تعمیر کی تھی۔ یہ بند تقریباً ۱۵۰ فیٹ لمبی اور ۵۰ فیٹ چوڑی ایک دیوار تھی۔ اس بند میں اوپر نیچے بہت سی کھڑکیاں تھیں، جو حسب ضرورت کھولی اور بند کی جاتی تھیں۔ بند کے دائیں بائیں دو بڑے بڑے دروازے تھے جن سے پانی تقسیم ہوکر چپ و راست کی زمینوں کو سیراب کرتا تھا۔ قدیم مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ حکومتِ آل حمیر تک یہ بند سلامت رہا۔ بعد میں جب ملک میں سیاسی انتشار پھیلا اور بند کی نگرانی کی طرف سے غفلت برتی گئی تو یہ بتدریج تباہ ہو گیا۔ اس بند کا کچھ حصہ آج بھی موجود ہے۔ بقول حمزہ اصفہانی ظہور اسلام سے چار سو سال قبل یہ بند تباہ ہوا۔ یاقوت حموی کا بیان ہے کہ یمن پر حبشیوں کے تسلط کے زمانے یعنی چھٹی صدی عیسوی میں یہ بند تباہ ہوا۔ اور ابن خلدون کا خیال ہے کہ بند کی تباہی پانچویں صدی عیسوی میں مکمل ہوئی۔ (جرجی زیدان، العرب قبل الاسلام، دار الہلال، مصر، ۱۹۰۸ء، ص ۱۵۰ تا ۱۶۰۔ ندوی، سید سلیمان، ارض القرآن، جلد اول، ص ۲۵۴۔)

۹ یہ عراق عرب میں قائم عربوں کی نیم خود مختار حکومت تھی۔ ایرانی بادشاہ، شاہ پور اول کے عہد (۲۴۰ء) میں حکومت ایران نے نہر فرات کے کنارے حیرہ کی مملکت کی بنیاد رکھ کر عمرو بن عدی کو اس کا امیر مقرر کیا تھا۔ یہ ایک طرح کی بفر اسٹیٹ تھی۔ حیرہ کی حکومت پر یہ ذمہ داری

عائد ہوتی تھی کہ وہ ایران پر اس کی سمت سے حملہ آور کی مدافعت کرے۔ اس کے عوض ایران نے اُسے ٹیکس کی ادائیگی سے معافی دے رکھی تھی۔ ایرانی حکومت عموماً حیرہ کے عربوں پر بنو قضاعہ کی ایک شاخ لخم کے کسی فرد کو مقرر کرتی تھی۔ اسی لئے اس کو آل لخم یا لخمی حکومت بھی کہتے ہیں۔ پایۂ تخت حیرہ کی مناسبت سے ملوک حیرہ اور متعدد حکمرانوں کے نام منذر ہونے کی وجہ سے مناذرہ کی حکومت بھی کہتے ہیں۔ حیرہ پر مناذرہ کے بائیس بادشاہوں نے تین سو چونسٹھ سال تک حکومت کی۔ قبیلہ لخم کی امارت کا نظام بوجوہ ۶۰۲ء میں ختم کردیا گیا۔ اس کے بعد یہاں ایرانی حکومت اپنی طرف سے ایرانی گورنر مقرر کرتی تھی جس کی اطاعت حیرہ کے تمام امرائے عرب کیا کرتے تھے۔ یہ دستور ۶۳۳ء تک باقی رہا جبکہ حیرہ کو حضرت خالدؓ بن ولید نے فتح کیا۔ (امین احمد المصری، فجر الاسلام، لجنۃ التالیف و الترجمہ و النشر، قاہرہ، ۱۹۶۵ء، ص ۱۷۔)

۱۰ تمدن عرب، ص ۱۹۶۔

۱۱ ابوالفداء کے بیان کے مطابق یہ حکومت تیسری صدی عیسوی میں وجود میں آئی اور اس کا خاتمہ ۶۳۳ء میں عہد فاروقی میں ہوا۔ یوں آل غسان کے حکمرانوں نے کم و بیش چار سو سال حکومت کی۔ ان حکمرانوں نے رومیوں کے زیر اثر عیسائیت اختیار کرلی تھی۔ اس حکومت کو حکومت غسانہ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یمن سے ہجرت کے بعد یہ لوگ تہامہ میں نہر غسان کے کنارے آباد ہوئے تھے۔ اسی نسبت سے وہ غساسنہ کے نام سے معروف ہوئے۔ انہیں بانی خاندان کے نام سے آل جفنہ بھی کہتے ہیں۔ (تاریخ ارض القرآن، جلد ۲، ص ۳۸۳)
غسانیوں کا آخری فرماں روا جبلہ بن ایہم تھا۔ دور عمر فاروقؓ میں شام کی فتح کے دوران جبلہ مسلمان ہوگیا بعد میں مسلمانوں کے جذبۂ مساوات کی تاب نہ لاتے ہوئے مدینہ سے بھاگ کر قیصر کے پاس چلا گیا اور قسطنطنیہ میں ہی ۲۰ھ میں فوت ہوا۔

۱۲ مکہ کی شہری ریاست کی بنیاد قصی بن کلاب نے ڈالی اور اسی سے قریش کی حقیقی عظمت کا آغاز ہوتا ہے۔ قصی نے قبائل قریش کو منظم کیا، مکہ سے بنو خزاعہ کو نکال کر وہاں قریش کی بستیاں بسائیں۔ اس نے مکہ میں جس یونانی طرز کی شہری ریاست کی بنیاد رکھی تھی اس کے چودہ عہدوں کی سربراہی دس بطون قریش میں منقسم تھی۔ خود قصی کی حیثیت رئیس اعلیٰ کی تھی۔ اس

ریاست کا ایوان حکومت کعبہ سے متصل دار الندوہ کی عمارت میں تھا۔ یہ شہری ریاست اپنے عہد کی ایک متمدن ریاست تھی اور قریش کی نسبتاً ترقی یافتہ سوسائٹی کی خبر دیتی تھی۔ دراصل قصی نے حدود شام میں تربیت پائی تھی۔ قریشِ عرب اس وقت تک بدوی تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قصی نے تہذیب زندگی، نظمِ حکومت اور تاسیسِ قومیت کے اصول شام ہی کے ملک سے سیکھے۔ اور جوانی کے بعد حجاز آکر اسی اصول پر قریش کے منتشر افراد کو یکجا کیا اور ان میں ایک چھوٹی سی جمہوری ریاست کی بنیاد ڈالی۔ بلکہ پروفیسر حمید اللہ، ابن قتیبہ کے حوالے سے یہاں تک کہتے ہیں کہ قصی کو خود قیصر روم نے مدد دی تھی، جس کے ذریعے اس نے مکے پر قبضہ حاصل کیا۔ دیکھئے ''رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی''، ص ۱۷۲، بحوالہ کتاب المعارف، طبع یورپ، ص ۳۱۳، تاہم یہ بات مجھے کتاب المعارف کے کسی نسخہ میں نہیں مل سکی۔ (ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، جلد ۱، ص ۱۳۰ تا ۱۳۲۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، جلد ۱، ص ۶۲، ۳۰-۷۷۔ تاریخ طبری، جلد ۲، ص ۲۵۸، ۲۵۹۔ ارض القرآن، جلد ۲، ص ۲۰۶ تا ۲۰۹۔)

۱۳ یثرب میں مکہ جیسی کوئی شہری ریاست تو نہ تھی مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہر قبیلے کی اپنی مجلس شوریٰ یا محلّہ وار مجالس ہوتی تھیں جسے سقیفہ کہتے تھے۔ (ڈاکٹر حمید اللہ، عهد نبوی میں نظام حکمرانی، اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۱، ص ۴۱۔)

۱۴ دیوان الحماسہ، جلد ۱، ص ۳۲۹۔

۱۵ المیدانی نے مجمع الامثال کے ۲۹ویں باب میں ''ایام العرب'' سے بحث کرتے ہوئے زمانہ قبل از اسلام کے ۱۳۲ ایام کا ذکر کیا ہے۔ یہ ایام کسی ایک نسلی گروہ کے مابین یا دو مختلف نسلی گروہوں کے درمیان ہی موجود نہ تھے بلکہ ایک ہی نسلی گروہ سے تعلق رکھنے والے قبائل آپس میں دست بہ گریباں ہوجاتے تھے۔ اسی طرح عرب وعجم کی متحارب جماعتیں بھی مصروف جنگ رہتی تھیں۔ چند مشہور ایام العرب میں سے ایک جنگ بسوس تھی جو ربیعہ کے دو قبائل بنو بکر اور بنو تغلب کے درمیان ہوئی اور جس کی اصل وجہ چراگاہ میں اونٹ کو چرانے کا حق تھا۔ دوسری مشہور جنگ حرب داحس والغبراء تھی جو دو گھوڑوں کی مسابقت اور شرط کی رقوم کی ہار جیت پر اختلاف ہوجانے کے باعث مضر کے دو قبائل عبس وذبیان کے درمیان ہوئی۔ تیسری

مشہور جنگ حرب فجار تھی جس میں ایک فریق قریش اور کنانہ تھے اور دوسرے فریق ہوازن (قیس عیلان) تھے۔ ایام العرب میں چوتھی قابل ذکر جنگ حرب ذی قار کے نام سے مشہور ہے جو ربیعہ کے قبائل اور ایران کی شاہی فوج کے مابین، شاہان حیرہ کے امانت رکھے ہوئے سامان کی واپسی کے تنازعہ پر ہوئی۔ (ابن ہشام، جلد ۱، ص ۱۹۵ تا ۱۹۸۔ نیز ص ۳۰۷۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، دار صادر، بیروت، ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء، جلد ۱، ص ۵۰۲ تا ۶۸۴۔)

۱۶ جوزف ہیل، دی عرب سویلائزیشن، ص ۱۱، نیز ص ۱۳-۱۵، انگریزی میں ترجمہ صلاح الدین خدا بخش، لاہور ۱۹۶۹ء۔

۱۷ کاروان تجارت کے بسلامت آمد و رفت کی غرض سے قریش نے بیرون و اندرون عرب متعدد معاہدے کیے تھے۔ مکہ میں عبد مناف کے بیٹوں میں ہاشم نے شاہان روم اور آل غسان سے، عبد الشمس نے نجاشی الاکبر سے، مطلب نے ملوک حمیر سے اور نوفل نے اکاسرۂ ایران سے، ان کے ممالک میں تجارتی قافلوں کی بحفاظت آمد و رفت اور عربوں کی نو آبادیوں کے لئے اجازت حاصل کی اور معاہدے کیے۔ اسی طرح رابیہ (حضر موت) میں قریش، ملوک کندہ کی حفاظت میں اپنا مال لے جاتے تھے۔ تمام قبائل عرب میں قریش سامان تجارت لے کر جاتے تھے اور ایک تو اس وجہ سے کہ وہ خانہ کعبہ کے متولی تھے اور دوسرے ان معاہدوں کی وجہ سے انہیں کوئی گزند نہیں پہنچائی جاتی تھی۔ (الطبقات الکبری، جلد ۱، ص ۷۵، ۷۸۔ تاریخ طبری، جلد ۲، ص ۲۵۲۔ صدیقی، علی محسن، "عرب جاہلیہ میں موالی"، مشمولہ ماہنامہ "آگہی"، جلد ۲، شمارہ ۵ بابت مئی ۱۹۹۰ء، ص ۶۷)۔

قرآن مجید میں سورۂ قریش میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی احسان کی طرف اہل قریش کو متوجہ کیا ہے۔ ایک تو حج کی وجہ سے قریش کو کھانے پینے کی فراغت تھی اور چونکہ وہ خانہ کعبہ کے متولی تھے اور کعبہ کی عظمت عام اہل عرب کے دلوں میں موجود تھی اس کی بناء پر وہ "جیر ان اللہ" یعنی خدا کے پڑوسی سمجھے جاتے تھے۔ لوگ ان کو نہیں ستاتے تھے اور ان کے تجارتی قافلے بے دھڑک گزرا کرتے تھے۔

۱۸ عربوں میں جن چار مہینوں میں جنگ حرام خیال کی جاتی تھی انہیں اشہر حرم کہتے تھے۔ اسلام میں بھی اس حرمت کو برقرار رکھا گیا۔ ان میں تین مسلسل مہینے یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور ایک علیحدہ مہینہ رجب تھا۔ مگر کئی دفعہ خود عربوں نے اشہر حرم کی حرمت کو پامال کیا۔ عربوں

میں اشہرِ حرم کا طریقہ سب سے پہلے حذیفہ بن عبد کنانی مضری نے رائج کیا۔ (ابن ہشام، جلد ۱، ص ۳۵، ۳۶۔) ان حرام مہینوں کو حلال کر کے ان میں جنگ کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ ہر تیسرے سال نسی کر کے تیرہویں مہینے کا اضافہ کر لیتے تھے جو ذوالحجہ اور محرم کے درمیان ہوتا تھا۔ اس کا اعلان حج کے موقع پر کیا جاتا تھا۔ یہ اضافہ شدہ مہینہ حرام نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی وجہ سے حرام مہینوں کا تسلسل بھی ٹوٹ جاتا تھا۔ حرام مہینوں کی تعداد پوری کرنے کی غرض سے آئندہ مہینے یعنی صفر کو حرام قرار دیتے تھے، جو عام حالات میں حرام مہینہ نہیں تھا۔ اسی نسی کے متعلق قرآن میں متنبہ کیا گیا ہے۔ (سورۃ التوبہ: ۳۷) اور اسی کی ممانعت رسول اللہ ﷺ نے خطبۂ حجۃ الوداع میں کردی تھی۔ (تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۱۵۰؛ ابی علی المرزوقی الاصفہانی، الازمنہ و الامکنہ، حیدرآباد دکن، ۱۳۳۲ھ، جلد ۲، ص ۱۶۶؛ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، عہد نبوی میں نظام حکمرانی، ص ۴۹ تا ۵۵؛ صدیقی، علی محسن، ''عرب جاہلیہ میں موالی''، ص ۶۸۔)

۱۹ عرب کے مختلف بازاروں میں اسباب تجارت کو بحفاظت پہنچانے کی غرض سے تاجروں کو ایک رقم دینا پڑتی جسے "خفارۃ" کہتے تھے۔ جس کے لفظی معنی ہیں کسی کو اپنی پناہ میں لینا۔ خواہ معاوضے کے ساتھ یا بلا معاوضہ۔ دومۃ الجندل کے بازار میں جو ربیع الاول کے پہلے پندرہواڑے میں لگتا تھا، تجار، بنوکلب و جدیلہ کی حفاظت میں خرید و فروخت کرتے تھے۔ مشقر کے بازار میں جو جمادی الآخرۃ میں لگتا تھا، بنوعبدالقیس اور بنوتمیم کا دخل تھا اور ان کی رضا مندی کے بغیر یہاں مال لانا ممکن نہ تھا۔ رابیہ (موت) میں بنوآکل المرار (ملوک کندہ) اور آل مسروق بن وائل حضرمی کے زیر خفارہ مال تجارت لایا جاتا تھا۔ عکاظ کا مشہور بازار جو اشہرِ حرم (ذوالقعدہ، ذوالحجہ) میں لگتا تھا، خفارہ سے پاک تھا۔ خفارہ کی رقم عشور کے علاوہ ہوتی تھی جو تجار کو بازار کی زمین استعمال کرنے اور راہداری کے عوض دینا پڑتی تھی۔ (الازمنہ و الامکنہ، جلد ۲، ص ۱۶۱، ۱۶۷۔ صدیقی، علی محسن، ''عرب جاہلیہ میں موالی''، ص ۶۹۔)

۲۰ ابن منظور، لسان العرب، جلد ۵، ص ۷۷ (قبائل کی اس تقسیم میں ابن عبد ربہ نے جزوی ترمیم کی ہے، ان کے مطابق فخذ کے بعد فصیلہ نہیں بلکہ عشیرہ ہوتا تھا۔ یعنی کسی شخص کے اہل خاندان مثلاً آل عباس و ابی طالب۔ اس کے بعد فصیلہ تھا۔ جو کسی شخص کے اہل خانہ (اہل

بیت) سے عبارت تھا۔ ابن عبد ربہ قرطبی، متوفی ۳۲۸ھ، العقد الفرید، طبع عامرہ، مصر، ۱۲۹۳ھ، جلد۲، ص ۵۵) قبائل کی درجہ بندی کے سلسلے میں علمائے انساب میں اختلاف ہے لہٰذا اس ضمن میں کوئی بات حتمی طور سے نہیں کہی جا سکتی۔

۲۱ جرجی زیدان، تاریخ تمدن الاسلامی، جلد۴، ص ۱۹، دار الہلال، قاہرہ، ۱۹۲۷ء۔

۲۲ مقدمہ، ص ۱۰۹۔

۲۳ عرب جاہلیہ میں نکاح کے متعدد طریقے رائج تھے:

۱۔ نکاح کا ایک طریقہ تو وہ معروف طریقہ ہے جسے بعد ازاں اسلام نے قائم رکھا، یعنی آدمی کسی عورت کے ولی کو نکاح کا پیغام دیتا، مہر ادا کرتا اور نکاح کر لیتا تھا۔ (سنن ابی داؤد، جلد۲، ص ۲۰۶۔)

۲۔ نکاح کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ شوہر اپنی منکوحہ بیوی سے کہتا کہ جب تم حیض سے پاک ہو جاؤ تو فلاں شخص کے پاس چلی جانا اور اس سے ہم بستری کرنا۔ ایسی عورت سے اس کا شوہر اس وقت تک جنسی تعلقات قائم نہیں کرتا تھا جب تک کہ اس نئے شخص سے اس کی بیوی حاملہ نہ ہو جائے۔ ایسا عموماً نجیب بچے کے حصول کے لئے کیا جاتا تھا۔ ایسے نکاح کو "نکاح استبضاع" کہتے تھے۔ (بلوغ الارب، جلد۲، ص ۴، نیز سنن ابو داؤد، جلد۲، ص ۲۰۶۔)

۳۔ دس سے کم افراد کسی عورت سے جنسی تعلقات قائم کرتے اور جب وہ عورت حاملہ ہو جاتی تو وضع حمل کے چند روز بعد وہ ان تمام مردوں کو جمع کر کے تو مولود کو کسی ایک مرد کی طرف منسوب کر دیتی اور وہ شخص اس انتساب کو قبول کر لیتا۔ یہ فقط اس صورت میں ہوتا جب لڑکا پیدا ہوتا، ورنہ یہ جانتے ہوئے کہ عرب لڑکیوں کو پسند نہیں کرتے، وہ عورت لڑکی کی پیدائش پر ایسا نہ کرتی تھی۔ (بلوغ الارب، جلد۲، ص ۴۔ نیز سنن ابو داؤد، جلد۲، ص ۲۰۶)

۴۔ عموماً آزاد شدہ لونڈیاں جن کا کوئی سرپرست نہ ہوتا یا کوئی خاندان وقبیلہ ان کا پشت پناہ نہ ہوتا تو یہ کسی گھر میں بیٹھ جاتیں اور کئی کئی مردوں سے بیک وقت ان کا معاہدہ ہو جاتا کہ وہ ان کو خرچ دیں گے اور ان سے اپنی جنسی ضروریات پوری کرتے رہیں گے۔ حاملہ ہو جانے کی صورت میں وضع حمل کے بعد وہ عورت سارے معاہد مردوں کو جمع کرتی اور قیافہ شناس اپنے علم کے ذریعے اس بچے کو جس مرد سے منسوب کر دیتا، وہ بچہ اسی کی ولدیت میں داخل ہو جاتا۔ ان

پیشہ ور عورتوں کو "جھنڈیوں والیاں" (صواحبات الرایات) کہا جاتا تھا۔ (بلوغ الارب، جلد ۲، ص ۵۔ سنن ابو داؤد، باب فی وجوہ النکاح التی کان یتناکح بہا اھل الجاھلیہ، جلد ۲، ص ۲۰۶، ۲۰۷)۔ یہ حدیث بخاری میں موجود ہے بروایت سیدہ عائشہؓ۔

۵۔ ایک طریقہ "نکاح المتعہ" کا تھا۔ یہ ایک عارضی نکاح ہوتا تھا جو ایک مقررہ مدت کے لئے کیا جاتا تھا اور مدت گزرنے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا تھا۔ اسلام نے اسے حرام کر دیا۔

۶۔ ایک نکاح "نکاح البدل" تھا۔ اس کی صورت یہ ہوتی کہ ایک شخص دوسرے شخص سے کہتا کہ تو میرے حق میں اپنی بیوی سے دستبردار ہو جا اور میں تیرے حق میں اپنی بیوی سے دست بردار ہوتا ہوں۔

۷۔ ایک طریقہ "نکاح الشغار" کا تھا۔ اس میں ایک شخص اپنی بیٹی، بہن یا بھتیجی کی شادی کسی شخص کے ساتھ اس شرط پر کرتا کہ دوسرا بھی اپنی بیٹی، بہن یا بھتیجی کی شادی اس سے کر دے گا۔ اس طرز کے نکاح میں مہر نہیں رکھا جاتا تھا۔ (بلوغ الارب، جلد ۲، ص ۵۔)

۲۴ ابو جعفر محمد بن جریر، طبری (م ۳۱۰ھ)، تاریخ الرسل و الملوک، جلد ۲، ص ۲۳۰، دار المعارف، مصر، ۱۹۶۳ء۔

۲۵ اس کی ایک بڑی اچھی مثال خالد ابن یزید بن معاویہؓ (م ۸۵ھ) کی ہے۔ وہ سخاوت اور فصاحت میں قریش کے اکابر میں سے تھا۔ ابن زبیرؓ کے قتل کے بعد خالد حج کے لئے گیا وہاں اس نے رملہ بنت زبیرؓ بن العوام سے شادی کر لی (رملہ کے علاوہ اس کی دو بیویاں ام کلثوم بنت عبداللہ بن جعفرؓ بن ابی طالب اور آمنہ بنت سعید بن العاص بن امیہ بھی تھیں۔ بعد میں آمنہ کو خالد نے طلاق دے دی تھی تو اس نے ولید بن عبدالملک سے شادی کر لی تھی۔ الکامل للمبرد، جلد ۱، ص ۲۰۳)۔ خالد کو رملہ سے بڑی محبت ہو گئی، اس کا کہنا تھا "میرے دل میں جس قدر آل زبیرؓ کے خلاف بغض تھا اس قدر کسی کے خلاف نہ تھا۔ حتیٰ کہ میں نے انہی کی دوشیزہ رملہ سے شادی کر لی۔ چنانچہ آل زبیرؓ میرے لئے محبوب ترین لوگ بن گئے۔ اسی رملہ کے متعلق خالد کہتا ہے۔

احب بنی العوّام طرّاً لا جلھا ومن اجلھا احببت اخوالھا کلبا

[میں رملہ کی خاطر تمام بنی عوام سے محبت کرتا ہوں اور اسی کی خاطر، اس کے ماموؤں یعنی بنی کلاب سے محبت کرتا ہوں۔] بلوغ الارب، جلد ۲، ص ۷۔ الکامل للمبرد اور

المعارف لابن قتیبہ میں پہلا مصرعہ یوں ہے "احب بنی العوام طراً لحبها" (الکامل للمبرد، جلد ا، ص ۳۰۲، المعارف، ص ۹۷)۔

۲۶ مقدمہ ابن خلدون، ص ۱۰۸۔

۲۷ لسان العرب، جلد ۱۰، ص ۳۹۹ تا ۴۰۲۔

۲۸ مکہ کے نواح میں ایک پہاڑی ہے جسے حبشی کہتے ہیں۔ اسی پہاڑی کے دامن میں بعض قبائل نے جن میں حارث بن عبدالمناۃ بن کنانہ، عضل، قارہ، دیش اور المصطلق شامل تھے، انہوں نے ایک دوسرے کی مناصرت ومعاونت پر قسمیں کھائی تھیں۔ قسم کے الفاظ یہ تھے کہ "جب تک رات کی شان یہ ہے کہ رات اندھیری ہو، جب تک دن کا منظر یہ ہے کہ روشن رہے۔ جب تک کوہ حبشی اپنی جگہ قائم رہے گا، ہم لوگ غیروں کے مقابلہ میں یکدست رہیں گے۔" اسی مناسبت سے یہ "احابیش قریش" کے نام سے مشہور ہوئے۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد ۲، ص ۲۴-۲۵۔)

۲۹ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، جلد ۳، ص ۱۳۶۔ نیز ابو عمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر، الاستیعاب، دارالجیل، بیروت، ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء، جلد ۳، ص ۱۱۳۵-۱۱۳۶۔

یاسر بن عامر بن مالک اور ان کے دو بھائی حارث اور مالک اپنے ایک بھائی کی تلاش میں یمن سے مکہ آئے۔ حارث اور مالک تو واپس یمن چلے گئے یاسر مکہ میں ہی رہ گئے انہوں نے بنو مخزوم کے ابو حذیفہ بن مغیرہ سے حلف کر لیا۔ ابو حذیفہ نے ان سے اپنی باندی سمیہ بنت خیاط سے نکاح کر دیا۔ ان سے عمار پیدا ہوئے جنہیں ابو حذیفہ نے آزاد کر دیا تھا۔ ابو حذیفہ کے انتقال تک یاسر اس کے ساتھ رہے۔ جب اسلام لائے تو بنو مخزوم نے انہیں گرفتار کر کے شدید اذیتیں دیں۔ (الاستیعاب، جلد ۴، ص ۱۵۸۸-۱۵۸۹، نیز جلد ۴، ص ۱۸۶۳-۱۸۶۴۔)

۳۰ لسان العرب، جلد نمبر ۱۰، ص ۳۹۹۔

۳۱ جرجی زیدان، تاریخ التمدن الاسلامی، جلد ۴، ص ۲۵۔

۳۲ ایضاً۔

۳۳ صدر الاسلام میں استلحاق کی ایک مثال زیاد بن ابیہ کی ہے جس کو بذریعہ استلحاق حضرت امیر معاویہؓ نے اپنا بھائی قرار دیا تھا، یہ تاریخ اسلام کا معلوم ومشہور واقعہ ہے، دیکھئے ابن خلدون، تاریخ، جلد ۳، ص ۷۔

۴۴۔ خلیع (یا لعین) یعنی ذات باہر وہ شخص ہوتا تھا جس کے شر کی وجہ سے اس کے اہل خاندان اسے عاق کر دیتے تھے اور اس بات کا اعلان خلیع کا باپ ایام حج کے موقع پر کرتا تھا کہ وہ اور اس کا قبیلہ اس شخص سے دست بردار ہوتا ہے اور اس کے کسی بھی فعل کی ذمہ داری اس پر یا اس کے قبیلے پر نہیں ہوگی۔ ایسے شخص کو قتل کر دینے پر قاتل کے اوپر کسی قسم کی دیت لازم نہیں آتی تھی۔ یہ خلیع آبادی سے دور تنہا یا گروہ بنا کے رہتے تھے۔ کبھی یہ کسی کے ہتھے چڑھ جاتے تو غلام بن جاتے اور کبھی یہ لوگ بھی دوسروں کو قتل کر دیتے اور سامان تجارت لوٹ لیتے۔ ایسے عاق شدہ لوگ صحرا میں کسی جگہ جمع ہو کر ایک گروہ بنا لیتے تھے اور لوٹ مار کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ حضریوں کے مقابلے میں بدویوں میں یہ رواج زیادہ تھا۔ (صدیقی، علی محسن، "عرب جاہلیہ میں موالی"، ص ۲۷۔)

۴۵۔ عبداللہ ابن جدعان چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں قبیلہ تیم بن مرہ کا ایک ممتاز قریشی تھا۔ اس نے کاروانی تجارت اور غلاموں کی خرید و فروخت سے اتنی دولت جمع کر لی کہ مکے کے متمول اشخاص میں اس کا شمار ہونے لگا۔ شاندار ضیافتیں کھلانے میں اس کی دریا دلی ضرب المثل تھی۔ وہ اپنے عز و وقار کی وجہ سے سیاسی معاملات میں بھی دخل رکھتا تھا۔ ابن ہشام (جلد ۱، ص ۱۴۱) اور یعقوبی (جلد ۲، ص ۱۷) کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ مکے کے قبائلی اتحاد کا جو "حلف الفضول" کے نام سے مشہور تھا، محرک عبداللہ بن جدعان ہی تھا۔

۴۶۔ جرجی زیدان، جلد ۴، ص ۲۷۔

۴۷۔ آلوسی، محمود شکری، بلوغ الارب، جلد ۳، ص ۱۵۔ نیز جرجی زیدان، تاریخ التمدن الاسلامی، جلد ۴، ص ۲۷۔

۴۸۔ جرجی زیدان، جلد ۴، ص ۲۷۔

۴۹۔ عنترہ کے باپ نے عنترہ کو خاصی بڑی عمر کا ہو جانے کے بعد اپنا بیٹا تسلیم کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عنترہ ایک سیاہ فام لونڈی "زبیبہ" کے بطن سے تولد ہوا تھا۔ جاہلی دور میں یہ عربوں کا دستور تھا کہ لونڈی کے بطن سے پیدا ہونے والے بیٹے کو غلام بنا کر رکھتے تھے۔ عنترہ کے دوسرے ماں جائے بھائی سب غلام تھے۔ ایک بار ایک عربی قبیلے نے بنی عبس کے کچھ لوگوں پر چھاپا مارا اور ان کا مال لوٹ لیا۔ بنی عبس کے بعض افراد نے ان کا پیچھا کیا اور دونوں میں جنگ شروع ہوگئی۔ انہی میں عنترہ بھی تھا۔ اس کے باپ شداد نے اس سے کہا، عنترہ حملہ کر۔

عنترہ نے جواب دیا۔ غلام کیا حملہ کرے گا، وہ تو دودھ دوہنا جانتا ہے۔ اس پر اس کے باپ نے کہا حملہ کر، تو آزاد ہے۔ اس پر عنترہ نے ان سے جنگ کی اور ان کے قبضے سے تمام مال غنیمت چھڑا لیا۔ اس واقعہ کے بعد اس کے باپ نے اسے بیٹا تسلیم کر لیا۔ (بلوغ الادب، جلد ۲، ص ۱۲۶۔ صدیقی، علی محسن، "عرب جاہلیہ میں موالی"، ص ۷۳)

۴۰ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، عہدِ نبوی میں نظام حکمرانی، ص ۷۰-۷۱۔

۴۱ امیر علی، سید، Spirit of Islam، ص xxx، (مقدمہ)، طبع لندن، ۱۹۵۳ء نیز صدیقی، علی محسن، "عرب جاہلیہ میں موالی"، ص ۷۳۔

۴۲ یمن پر اہل حبشہ کے تسلط کو ختم کر کے جب ایرانی یہاں قابض ہو گئے تو انہوں نے یہاں رہ کر مقامی لوگوں میں شادی بیاہ کے تعلقات بھی قائم کیے، لیکن اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لئے ان ایرانیوں نے اپنے لئے "ابناء الملوک" (بادشاہوں کی اولاد) کا نام تجویز کیا جو مختصر ہو کر "ابناء" رہ گیا۔ ابناء نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا اور اسلام قبول کیا۔ فتنہ ارتداد میں بھی ان کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ صدر الاسلام میں وہب بن منبہ، ہمام بن منبہ اور طاؤس بن کیسان جیسے جلیل القدر تابعی انہیں ابناء سے تعلق رکھتے تھے۔ (صدیقی، علی محسن، "عرب جاہلیہ میں موالی"، ماہنامہ "آگہی" ص ۷۴، شمارہ بابت مئی، ۱۹۹۰ء۔)

۴۳ یثرب کے یہود قبائل نے بنو اوس و خزرج سے مخالفت و موالات کے باوجود اپنی انفرادیت باقی رکھی۔ ان کے محلے اور گڑھیاں الگ، ان کے رسم و رواج الگ اور ان کے نسلی غرور و امتیاز باقی رہے اور وہ انصار یا دوسرے قبائل عرب میں مدغم نہیں ہوئے۔ (احمد امین المصری، فجر الاسلام، ص ۲۳۔ نیز صدیقی، علی محسن، "عرب جاہلیہ میں موالی"، ص ۷۴۔)

۴۴ بلوغ الادب، جلد ۳، ص ۱۸۲، ۲۱۰۔ جرجی زیدان، تاریخ التمدن الاسلامی، جلد ۳، ص ۳۵۔ صدیقی، علی محسن، "عرب جاہلیہ میں موالی"، ماہنامہ آگہی، کراچی، جلد ۲، شمارہ ۳، ۴، مارچ، اپریل، ۱۹۹۰ء، ص ۱۵۵۔)

۴۵ ابو الفرج الاصفہانی (م ۳۵۶ھ)، کتاب الاغانی، جلد ۱۳، ص ۱۵۶، مصر ۱۳۲۳ھ۔ (سدیف بن میمون بنو خزاعہ کا موالی تھا۔ اس نے یا اس کے باپ نے آل ابی لہب میں ان کی ایک مولاۃ سے شادی کر لی تھی، جس کی بناء پر آل ابی لہب کی ولاء کا دعویٰ کیا اور ان کے موالی کے زمرے میں شامل

ہوگیا۔)

۴۶ ابوالفرج الاصفہانی، کتاب الاغانی، جلد ۱۹، ص ۹۷۔

۴۷ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، جلد ۳، ص ۳۸۸، الاستیعاب، جلد ۲، ص ۷۸۸۔

۴۸ الاستیعاب، جلد ۳، ص ۹۸۷۔

۴۹ ایضاً، جلد ۳، ص ۱۳۸۳۔ جلد ۲، ص ۷۵۵۔

۵۰ ابن ہشام، جلد ۲، ص ۱۸۹۔

۵۱ ابن سعد، جلد ۳، ص ۸۹؛ ابن ہشام جلد ۱، ص ۳۳۶؛ الاستیعاب، جلد ۳، ص ۸۷۷۔

۵۲ ابن قتیبہ الدینوری (م ۲۷۶ھ)، المعارف، ص ۱۱۹، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ابن ہشام جلد ۱، ص ۹۱، ۹۲۔

۵۳ اس ضمن میں بریرہؓ کا واقعہ بہت مشہور ہے جس کا زر کتابت حضرت عائشہؓ نے ادا کیا تھا۔ (اس ضمن میں مشہور حدیث ہے "فانما الولاء لمن اعتق"، صحیح مسلم، جلد ۲، ص ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، کتاب العتق۔)

۵۴ سالمؓ، اصطخر کے باشندے اور حضرت ابوحذیفہؓ کی بیوی ثبیہ انصاریہ کے غلام تھے۔ انہوں نے سالم کو سائبۃً آزاد کردیا۔ ابوحذیفہ نے انہیں اپنا متبنیٰ اور مولی بنالیا تھا اور ان کی شادی اپنی بھتیجی فاطمہ بنت ولید بن ربیعہ بن عبدشمس سے کردی۔ انہوں نے ابوحذیفہؓ کے ساتھ ابتدا ہی میں اسلام قبول کرلیا تھا۔ ہجرت کے بعد قبا میں قیام کیا اور چونکہ وہاں موجود صحابہ میں قرآن کا علم سب سے زیادہ انہی کو تھا، اس لئے مسجد قبا میں امامت نماز کے فرائض یہی انجام دیتے تھے۔ مدینہ میں جب مواخاۃ قائم کی گئی تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کا بھائی بنادیا۔ ۱۲ھ میں مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ یمامہ میں مہاجرین کے علم دار یہی تھے۔ اسی جنگ یمامہ میں اپنے آقا کے ساتھ شہید ہوئے۔ ان کی میراث، ان کی سابق مولاۃ (مالک) کے پاس بھیجی گئی، مگر انہوں نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کردیا کہ میں نے سالم کو سائبۃً آزاد کیا تھا۔ حضرت سالمؓ کی جلالت کا یہ عالم تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ نے بوقت استخلاف فرمایا تھا کہ "اگر آج سالم زندہ ہوتے تو میں انہیں مسلمانوں کا امیر نامزد کردیتا۔" (ابن سعد، جلد ۳، ص ۸۵، ۸۸، ۳۴۳؛ ابن ہشام، جلد ۲، ص ۱۲۲؛ الاستیعاب، جلد ۲، ص

۱۷۷-۱۷۹؛ صدیقی، علی محسن، ''عرب جاہلیہ میں موالی''، ماہنامہ آگہی، مئی ۱۹۹۰ء، ص ۷۶۔)

۵۵ ابو حذیفہؓ کا نام ہشیم یا ہشم تھا۔ وہ سردار قریش عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس کے بیٹے تھے۔ نہایت قدیم الاسلام تھے۔ حبشہ کی دونوں ہجرتوں میں شامل رہے۔ یہ ہجرت انہوں نے اپنی بیوی سہلہ بنت سہیل بن عمرو کے ساتھ کی۔ حبشہ میں ہی ان کا بیٹا محمد پیدا ہوا۔ مدینہ میں ان کی مؤاخاۃ عبادۃؓ بن بشیر انصاری سے کی گئی۔ غزوۂ بدر، احد، خندق اور حدیبیہ میں شامل رہے۔ ۱۲ھ میں جنگِ یمامہ میں شہید ہوئے، اس وقت ان کی عمر ۵۳ یا ۵۴ سال تھی، نہایت صاحب فضل و شرف تھے۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد ۳، ص ۸۴، ۸۵؛ الاستیعاب، جلد ۴، ص ۱۶۳۱، صدیقی، علی محسن، عرب جاہلیہ میں موالی، ص ۷۷۔)



باب سوم: فصل اوّل

اسلامی معاشرے کا قیام

عہد جاہلیت اور عہد رسالت میں وہی فرق ہے جو "اسلام" اور "جہالت" میں ہے یعنی حق و باطل، دن اور رات، سفید و سیاہ کا فرق۔ جہالت اسلام کی ضد ہے۔ قرآن اپنے پیش کردہ دین کو "اسلام" اور اس سے پہلے کے زمانے کو "جاہلیت" کہتا ہے۔ اس لئے کہ یہ نام دونوں زندگیوں اور ذہنیتوں کی دو انتہاؤں کے پورے فرق کو ظاہر کرتے ہیں۔ جہالت کے معنی حماقت، نادانی، خود پسندی، تکبر، عصبیت و حمیت کے ہیں چونکہ اسلام سے قبل عربوں میں ایک قسم کی عصبیت، قبائلی منافرت اور ظلم و تعدی پائے جاتے تھے اسی بنا پر اس دور کو عہدِ جاہلیت کہا جاتا ہے جبکہ اس کے برعکس اسلام امن و صلح اور عدل و رواداری کا پیغام ہے۔ اسلام کے معنی ہیں سلامتی، صلح پسندی، رواداری اور خدا کی اطاعت اور یہی خصوصیات اس دین کی بنیاد ہیں۔

عرب کے بت پرست معاشرے میں اسلام پیامِ انقلاب تھا۔ اسلام اور جاہلیت کے عقائد و خیالات ایک دوسرے کے متضاد تھے۔ عرب معاشرے میں اسلام کی اشاعت کا صرف یہ مطلب نہ تھا کہ چند وحشیانہ رسوم و عادات کو مٹا دیا جائے بلکہ جاہلی خیالات و تصورات اور جاہلی مزاج کو یکسر تبدیل کر دینا اس کا مقصدِ اعلیٰ تھا۔

جہالت اور اسلام کے فرق کو عمرو بن اہتم[1] کے قول سے بہ خوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

عمرو بن اہتم نے حضرت عمرؓ کے سامنے مفاخرت کرتے ہوئے خود کو احنف ابن قیس ۲؎ پر ترجیح دینے کے لئے اپنی تعریف میں کہا تھا (جبکہ وہ دونوں سرداری کے مقابلے میں امیدوار تھے) "جب ہم تم زمانۂ جاہلیت میں تھے تو اُس وقت برتری جہالت کرنے والے کے لئے تھی۔ چنانچہ اس وقت ہم نے تمہارے خون بہائے، تمہاری عورتوں کو قید کر کے لونڈیاں بنایا اور آج ہم اسلام میں ہیں جس میں تفوق اور برتری، تحمل اور بردباری کرنے والے کے لئے ہے۔ سو میری دعا ہے کہ خدا تمہیں اور ہمیں بخش دے۔" ۳؎ اس طرح وہ احنف ابن قیس کی خودستائی اور فخر کے مقابلے میں بازی لے گیا۔

یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ اسلام نے مخصوص عربی ذہنیت اور طرزِ فکر میں عظیم انقلاب برپا کر دیا تھا۔ جاہلی عرب اور سماج کے سامنے کچھ ایسے بلند اصول پیش کیے جو اُن کے سابقہ متداول اصولوں کے مخالف اور ان کے مسلّمہ اقدار سے متصادم تھے۔

مکے کی وادی غیر ذی زرع میں رسول اکرم محمد (ﷺ) کا ظہور، بعثت کے بعد کے مصائب، مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت اور پھر مدینے میں پہلی اسلامی ریاست کا قیام اور توسیع، گو کہ یہ راتوں رات آنے والا انقلاب نہیں تھا مگر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے لئے صدیوں کے فاصلے طے کیے گئے اور نسلوں کا خراج دیا گیا۔ یہ سب کچھ جس میں حضری عربوں کی اکثریت کی ذہنی و فکری کایا پلٹ کے ساتھ ساتھ ان کا حیرت انگیز سیاسی و علمی سفر بھی نظر آتا ہے، صرف تیئیس سال کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اتنے بڑے انقلاب کے لئے یہ مدت بہت کم ہے۔ شاید اسی لئے قرآن کو معجزہ کہا گیا ہے۔ یہ قرآن کا معجزہ ہی تھا جس نے بادیہ نشین عربوں کو صدیوں کے لئے کئی براعظموں کا حکمران بنا دیا تھا۔ یہ حکمرانی صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ علمی اور فکری بھی تھی۔

دیکھا جائے تو زمین وہی تھی، آب و ہوا وہی تھی، ذرائع معیشت وہی تھے، لوگ بھی وہی تھے، لیکن ان کے رویوں میں بنیادی فرق آ گیا تھا۔ ان کی فکر کی ان اساسی تبدیلیوں کی وجہ قرآنی تعلیمات تھیں۔ قرآن کے فلسفۂ اخلاق نے انہیں ایک بالکل مختلف انسان بنا دیا تھا۔

چنانچہ ہجرت کے بعد مدینے میں جب پہلی اسلامی ریاست قائم ہوئی اور ایک اسلامی معاشرہ تشکیل پایا تو نہ اس میں وہ معاشرتی طبقات قائم رہ سکے جو عہدِ جاہلیت میں تھے اور نہ وہ اقدار ہی پنپ سکیں جو جاہلی معاشرے میں جاری و ساری تھیں۔ ''قبائلی امتیازات مٹا دیے گئے اور آزاد و غلام کی جاہلانہ تفریق بھی کم ہوگئی۔''[۲۴]

اسلام نے جو تصور معاشرت دیا وہ جاہلی تصور معاشرت سے بالکل جداگانہ تھا۔ قرآن کہتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ (النساء:۱)

[اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک وجود سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں پھیلا دیں اور ڈرو اس اللہ سے جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو اور ڈرو (یعنی بچو) قطعِ رحمی سے۔]

اس آیت سے ایک اصول تو یہ واضح ہوتا ہے کہ تمام انسان نفس واحدہ سے پیدا ہوئے لہٰذا برابر ہیں اور دوسرا اصول یہ نکلتا ہے کہ اس اخوت کا قیام اور دوام تعلق باللہ پر منحصر ہے۔ مدینے کا اسلامی معاشرہ انہی اصولوں پر قائم کیا گیا تھا۔ اسلام کی معاشرتی سوچ یہ تھی کہ جملہ نوعِ انسانی ایک برادری کے مانند ہے، جس میں سب کو زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کا حق حاصل ہے۔

نسل انسانی کی وحدت کے استحکام کے لئے روحانی دعوت کو خاص اہمیت دی گئی۔ کیونکہ صرف مادی وسائل کے ذریعے جو شیرازہ بندی ہوتی ہے وہ دیرپا نہیں ہوسکتی۔ اس لئے روحانی عقائد کے ذریعہ وحدت و تنظیم پر زور دیا گیا۔ یہ کام انبیائے کرام کرتے رہے اور اس سلسلے کی آخری دعوت رسول اللہ ﷺ کی تھی۔ آپؐ نے جس اسلامی معاشرے کی بنیاد مدینے میں رکھی اس کی اولین خصوصیت یہ تھی کہ رنگ، نسل اور ذات برادری کو ترک کرکے تقویٰ کو

معیار فضیلت قرار دیا گیا۔ دوسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ بنیادی انسانی ضرورتوں میں سب کے ساتھ برابری کا سلوک روا رکھا گیا اور تیسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ انسانی حاکمیت کی جگہ اللہ کی حاکمیت قائم کر کے سب انسانوں کے لئے عدل و انصاف کی سہولت مہیا کی گئی۔ چنانچہ مدینہ میں جو اسلامی معاشرہ وجود میں آیا، وہ رنگ و نسل کے تعصبات سے پاک تھا اور بزرگی و فضیلت صرف متقی کے لئے تھی۔ قرآنِ کریم میں ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۔

(الحجرات:۱۳)

[اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔] ۵

یعنی یہ شعوب و قبائل کا اختلاف محض تعارف اور شناخت کے لئے ہے، ایک دوسرے پر فخر کرنے یا ایک دوسرے سے لڑنے کے لئے نہیں ہے۔ چنانچہ اس نسلی اختلاف میں انسان کو اپنی اصل نہیں بھولنی چاہئے اور انسان کی اصل یہی ہے کہ وہ اولادِ آدم ہے اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔ فتح مکہ (۸ھ) کے دوسرے دن رسول اللہ ﷺ نے جو خطبہ دیا اس میں فرمایا:

"اے قریش! جاہلیت کی نخوت اور اپنے آباؤ اجداد پر فخر و غرور کو اپنے سے دور کر دو کیونکہ تمام انسانوں کے باپ آدمؑ تھے اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔" ۶

خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اے لوگو! تمہارا رب ایک، تمہارا مورثِ اعلیٰ ایک، تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ کا خمیر مٹی سے اٹھا تھا۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ فوقیت ہے تو صرف تقویٰ کی بنیاد پر۔" ۷

اسی حج کے موقعہ پر ایک خطبے میں آپؐ نے فرمایا:

''اچھی طرح سمجھ لو کہ ہر مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔'' ۹

انسانی معاشرے کو مختلف قسم کے امتیازات قائم کر کے طبقات میں تقسیم کرنے کے عمل کو قرآن نے فرعونیت قرار دیا ہے:

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ (القصص:۴)

[فرعون نے ملک میں سرکشی اختیار کی اور اس نے وہاں کے باشندوں کو طبقات میں تقسیم کر دیا۔ ایک گروہ کو وہ کمزور کرتا تھا۔]

اس قسم کے قرآنی بیانات، مساوات بین المسلمین کے قیام کے لئے دو واضح اعلانات پر مشتمل ہیں۔ ایک وحدۃ الرب اور دوسرا وحدۃ الاب۔

یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا مناسب ہوگا کہ یہ سب اعلانات رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے آخری سالوں کے ہیں۔ یعنی ۸ھ تا ۱۰ھ کے، جبکہ رسول اللہ ﷺ کو اسلام کی تبلیغ کرتے ۲۲ برس گزر چکے تھے۔ اسی طرح سورۃ الحجرات ۱۰ کے جو بیانات بالائی سطور میں نقل کیے گئے یہ بھی عام الوفود ۹ھ میں نازل ہوئی۔ نولدیکی (*Noldeke*) اور اس کی خوشہ چینی کرتے ہوئے لیوی (*Levy*) بھی یہ نکتہ اٹھاتا ہے کہ یہ تعلیمات رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے آخری برسوں کی ہیں۔ ۱۱

اس کی وجہ یہ تھی کہ عربوں کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام کی بنیاد قبیلہ تھا، قبائلیت اور قبائلی عصبیت، ان کے لئے یک گونہ ضروری بھی تھی اور عربوں کی معاشرتی زندگی کے تار و پود سے اس طرح گندھی ہوئی تھی کہ اس کو یک لخت ختم نہیں کیا جاسکتا تھا، اس کو ختم کرنے کے لئے ''تدریج'' کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ وہ تمام معاملات جو انسانی نفسیات کے نازک پہلوؤں سے متعلق تھے، انہیں بڑی احتیاط سے تدریجاً چھیڑا گیا، مثلاً نماز تو ابتداء ہی میں

فرض ہوگئی (جبکہ ابھی ہجرت بھی نہیں ہوئی تھی) روزہ بھی ہجرت کے بعد فرض قرار دیا گیا۔ یہی حال جہاد کا تھا کہ عرب ایک جنگجو قوم تھی اور لڑنا بھڑنا ان کے معمولات زندگی میں شامل تھا، مگر زکوٰۃ کو سب سے آخر میں فرض کیا گیا۔ کیونکہ انسان جو کچھ کماتا ہے اس پر صرف اپنا حق سمجھتا ہے اور مال کی محبت عام حالات میں انسانوں میں کافی شدید ہوتی ہے چنانچہ زکوٰۃ کے احکامات میں تدریج کا خیال رکھا گیا۔ مکی زندگی میں پہلے صدقات (انفاق فی سبیل اللہ) کی طرف رغبت دلائی گئی تاہم فرضیت کا حکم نہیں تھا، پھر مدینہ منورہ میں آکر صدقہ فطر واجب ہوا۔ یعنی یہ سال میں ایک دن عید کی نماز سے قبل ہر مسلمان سیر، سوا سیر غلہ راہ خدا میں خیرات کرے۔ یہ ایک معمولی سی سالانہ ادائیگی تھی۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی تاکید کی جاتی رہی۔ یہ سب زکوٰۃ کی فرضیت کی راہ میں اختیار کیے جانے والے تدریجی مراحل تھے۔ اس طرح اسلام اپنے ماننے والوں کے دلوں سے مال کی محبت کی شدت کو ختم کرنے کی کوشش کرتا رہا تا آنکہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے آخری برسوں میں، فتح مکہ کے بعد زکوٰۃ مسلمانوں پر فرض قرار دی گئی۔

یہی حال ''عصبیت'' کا تھا۔ قبائل اور قبائلی عصبیت عربوں کی معاشرتی زندگی کا ایسا جزو لاینفک تھا جس کو مناسب حد تک کم کرنے کے لئے بھی اسلام نے ''تدریج'' کا راستہ اختیار کیا۔ انہیں وقتاً فوقتاً اس قسم کی اخلاقی تعلیمات دی جاتی رہیں کہ آباء و اجداد پر فخر و غرور اور نسلی تفاخر اور حد سے بڑھی ہوئی قبائلی عصبیت، آثار جاہلیت میں سے ہیں جنہیں ترک کر دینا چاہئے اور بالکل آخری برسوں میں حتمی طور پر یہ اعلان کر دیا گیا کہ حسب نسب کسی کام کے نہیں، اصل چیز تقویٰ ہے۔ چنانچہ مسلمانوں میں اگر باہم فرق ہو سکتا ہے تو صرف ایمان و تقویٰ کی بنیاد پر۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

> ''اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلی عصبیت اور آباء پر فخر کا طریقہ ختم کر دیا ہے۔ اب یا تو مومن متقی ہوگا، یا فاجر شقی، تمام لوگ آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں بجز تقویٰ کے۔'' [۱۲]

رسول اللہ ﷺ اپنے خاندان اور قبیلے پر بھی اس معاملہ میں سخت تھے کہ مبادا رسول اللہ ﷺ سے نسبت ان میں بے جا فخر و غرور کے جذبات پیدا کردے اور وہ اسلامی مساوات کے اس راستے سے ہٹ جائیں جس کی طرف رسول اللہ ﷺ ہر مسلمان کو دعوت دے رہے تھے۔ اس سلسلے میں آپ کا وہ قول قابل غور ہے، جو فاطمہ بنت محمد کو مخاطب کرتے ہوئے آپؐ نے کہا تھا "اے فاطمہ بنتِ محمدؐ! اپنے لئے نیک عمل کرلو، میں تمہیں اللہ کی گرفت سے نہیں بچا سکتا۔" اسی طرح دوسرے افراد خانہ کو مخاطب کرکے آپؐ نے فرمایا "اے آل محمدؐ! ایسا نہ ہو کہ لوگ میرے پاس نیک اعمال لے کر آئیں اور تم حسب نسب لے کر آؤ۔ تم عمل کرو، میں تمہیں اللہ کی گرفت سے نہیں بچا سکتا۔" ۱۳

ایک حدیث میں ہے: لا تفتخروا بآبائكم۔ [اپنے آبا پر فخر نہ کرو] (مسند احمد، رقم: ۲۷۳۹)

ایک دوسری حدیث میں ہے: التعيير في الاحساب من امر الجاهليه ۱۴ بلکہ مسند ہی کی ایک حدیث میں تو اسے کفر قرار دیا گیا ہے۔ اسلامی اخوت و اتحاد کو مستحکم کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے اَلطَّعْنُ فِي النَّسَب سے بھی منع کیا ہے۔ بلکہ صحیح مسلم کی حدیث کی رو سے اَلطَّعْنُ فِي النَّسَب بمنزلہ کفر کے ہے۔ ۱۵ تاہم اپنے بزرگوں کے اچھے اوصاف کی یاد منع نہیں کی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: "اپنے احساب جاننے اور خاندانی رشتوں کی طرف سے عائد ہونے والے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اپنا نسب یاد کرو۔" ۱۶

ان تمام بیانات کی روشنی میں یہ اصول متعین کیا جاسکتا ہے کہ اسلام تمام مسلمانوں کے درمیان معاشرتی مساوات کا قائل ہے اور انہیں طبقات میں تقسیم کرنا نہیں چاہتا۔ وہ تمام مسلمانوں کو کافروں کے مقابلے میں ایک امت واحدہ کے طور پر دیکھتا ہے۔

گولڈزیہر *Ignaz Goldziher* رسول اللہ ﷺ کے اس انسانیت نواز اصول کی تعریف کرتا ہے، لیکن روحانی دعوتوں کے الوہی سرچشموں سے طبعاً و تمدناً انکاری ہونے کی وجہ سے وہ اس اصول کو ایک سیاسی ضرورت قرار دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے ۱۷ کہ مساوات و اخوت کا یہ اصول آپؐ نے انصار کو خوش کرنے اور قریش مکہ کو، جو کہ آپ کے دشمن تھے،

مرعوب کرنے کے لئے اختیار کیا حالانکہ یہ تجزیہ درست نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ اقدام انسانیت کی خاطر تھا اور اس وقت بھی یہ جاری رہا جب نہ انصار کو خوش کرنے کی ضرورت تھی، نہ کسی کی تالیف قلب مطلوب تھی اور نہ قریش مکہ کو مرعوب کرنے کی ضرورت باقی رہ گئی تھی کہ مکہ فتح ہو چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ یہ اصول آپؐ کے بعد خلفاء راشدینؓ نے بھی اسی سختی سے اپنایا دراں حالیکہ وہ اسلام کی شوکت کا زمانہ تھا۔

المختصر یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ مدینہ کے اسلامی معاشرے میں انسانی طبقات کی درجہ بندی وہ نہیں تھی، جو عہد جاہلیت میں تھی۔ عہد جاہلیت میں حُر، موالی اور غلاموں کے طبقات موجود تھے جبکہ اسلامی معاشرے میں ان تینوں طبقات کی قلب ماہیت کرکے انہیں نئے معنی عطا کیے گئے اور تمام مسلمانوں کو ایک ہی طبقے اور ایک ہی برداری سمجھنے پر زور صرف کیا گیا۔ یوں صدر اسلام میں صرف دو ہی طبقات تھے، ایک مسلم طبقہ، دوسرا غیر مسلم طبقہ۔ مسلم طبقے کی مزید درجہ بندی اگر ممکن تھی تو صرف ان کے تقویٰ کی وجہ سے اور یا پھر شناخت کی وجہ سے جیسا کہ قرآن نے بعض کو "السابقون الاولون" ۱۸، بعض کو "مولفۃ القلوب" اور بعض کو "اَعراب" کا نام دیا۔ بعض کو "انصار" ۱۹ کا اور بعض کو "مہاجرین" کا نام دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے فی الحقیقت جو نیا سماجی ماحول مدینے میں پیدا کیا تھا، اس کے باوجود کہ رسول اللہ ﷺ نے قبائلیت پر براہ راست ضرب نہیں لگائی تھی، مگر آپؐ نے مرکز قوت کو قبائل سے امت کی طرف منتقل کرکے قبائلیت کا سد باب کرنا چاہا تھا۔ ۲۰ اس نئے نظام کا تقاضا یہ تھا کہ انصار و مہاجرین کے مقامی اور نسبی رشتوں کے مقابلے میں محکم دینی اور روحانی رشتہ قائم ہو۔ لہٰذا "مواخاۃ" کے ذریعے آپؐ نے نہ صرف انصار کو باہم بلکہ انصار و مہاجرین کو بھی باہم یکساں کر دیا۔ چنانچہ اگر ایک طرف اس مواخاۃ سے مہاجرین کی آبادکاری اور انصار کی تربیت کا انتظام کیا گیا تو دوسری طرف نسبی رشتہ داری کے مقابلے میں دینی تعلق اور روحانی رشتہ پیدا کرکے، عربوں کے عصبی مزاج کا رخ موڑنے کی کوشش کی گئی، چنانچہ اس مواخاۃ کے بعد انصار و مہاجرین ایسے رہے جیسے وہ ایک ہی خاندان کے فرد ہوں۔ خود اوس و

خزرج کو اپنی دیرینہ عداوت ختم کرنی پڑی۔

یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مواخاۃ مکہ میں قائم کی تھی ایک اور ایک مدینے میں مہاجرین و انصار کے مابین۔ یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ دین کے مقابلے میں نسب کی اہمیت نہیں ہے، اگر دین ایک ہے تو نسبی اعتبار سے حقیقی بھائی کی کمی یا غیر موجودگی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس کمی کو دینی بھائی سے پورا کرنے کی کوشش کی گئی اور مواخاۃ کا نظام قائم کیا گیا۔ مکے میں آپؐ نے اپنی مواخاۃ حضرت علیؓ سے قائم کی۔ زیدؓ ابن حارثہ کو اپنے چچا (اور رضاعی بھائی) حمزہ بن عبدالمطلب کا بھائی بنایا۔ یہ کوئی معمولی رشتہ نہیں تھا۔ بلکہ ان دینی بھائیوں کی نسلوں نے بھی اس رشتہ کی حرمت کو نبھایا۔

ان نظریاتی بنیادوں پر اٹھایا جانے والا مدنی معاشرہ ایک عادل و متوازن معاشرہ تھا۔ اس معاشرے میں جو چیز از روئے قرآن حرام تھی وہ سب کے لئے حرام تھی اور جو چیز از روئے قرآن حلال تھی، اس کی حلت ہر مسلمان کے لئے تھی خواہ وہ سردار قبیلہ ہو یا نکٹا، چپٹا، حبشی غلام۔ جب بنی مخزوم کی ایک اعلیٰ نسب خاتون فاطمہ نے چوری کی تو قریش کو یہ بات شاق گذری کہ رسول اللہ ﷺ اسے سزا دیں گے۔ لہٰذا انہوں نے طے کیا کہ اسامہ بن زید موالی رسول اللہ ﷺ، جنہیں رسول اللہ ﷺ بہت محبوب رکھتے تھے، ان کے ذریعے سفارش کرائی جائے۔ اسامہ نے رسول اللہ ﷺ سے بات کی، جس پر آپ سخت ناراض ہوئے اور کہا ''تم حدود اللہ کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟'' اس کے بعد لوگوں سے کہا ''تم سے پہلے کی اقوام اسی لئے تباہ ہو گئیں کہ ان کی نظر میں جو معزز تھے ان میں سے اگر کوئی جرم کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے اور اگر کوئی ادنیٰ درجے کا شخص جرم کرتا تو اسے سزا دیتے۔ خدا کی قسم اگر فاطمہؓ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔'' ۲۲ دراصل قانون کی یکسانی سے زیادہ بنی نوع انسانی کو مثالی وحدت کی طرف لانے والی کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ اسی طرح قانون کے تفاوت سے زیادہ اپنوں کو بیگانہ بنانے والا کوئی امر نہیں ہوتا۔

مدینے کے اسلامی معاشرے کی یہ نمایاں خصوصیت تھی کہ اس زمانے میں ٹھیک ٹھیک

اسلام کے اصولوں اور اس کی روح کے مطابق قبائلی، نسلی اور وطنی عصبیتوں سے بالاتر ہو کر تمام لوگوں کو برابری کا درجہ عطا کیا گیا۔ یہ بات تو نہیں تھی کہ مسلمانوں نے اپنی لغت سے غلام اور غلامی کے الفاظ کھرچ کر نکال دیے تھے۔ یہ الفاظ، اپنے سابقہ معانی و مفاہیم کے ساتھ اس معاشرے میں بھی استعمال ہوتے تھے مگر ان الفاظ میں جو ذلت اور کمتری تھی اسے ختم کرنے کے لیے پورا اخلاقی زور لگایا۔ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ غیر عرب نو مسلموں کو کسی حقارت کی وجہ سے "موالی" کا نام نہیں دیا گیا تھا، یہ صرف ایک تعارفی یا شناختی معاملہ تھا۔ عہد جاہلیت میں متبنی بنانے کا رواج تھا۔ اگر کوئی شخص کسی کو اپنا متبنی بنالیتا تو اس کو اسی کی نسبت سے پکارا جاتا (جیسے زید ابن حارثہ کو زید ابن محمد کہا جانے لگا تھا) اس کے مرنے کے بعد اس کا متبنی (بیٹا) اس کا وارث بھی ہوتا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ:

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْۤا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ مَوَالِیْكُمْ ؕ. (الاحزاب: ۵)

[ان کو ان کے باپوں کے نام سے پکارو، یہی اللہ کے نزدیک بہتر ہے۔ اگر تم ان کے باپوں کو نہ جانو تو وہ تمہارے دینی بھائی اور موالی ہیں۔]

اس حکم کے بعد ایک تو یہ ہوا کہ تبنیت کی رسم ختم ہو گئی اور ہر شخص کو اس کے اصل باپ کے نام سے پکارا جانے لگا (چنانچہ زید ابن محمد، دوبارہ سے زید ابن حارثہ ہو گئے، رسول اللہ ﷺ انہیں اپنا دینی بھائی اور مولیٰ کہنے لگے۔ صحیح بخاری، جلد ۳، ص ۲۱۳۔) دوسرے یہ ہوا کہ وہ سب افراد جن کے نسب کا زیادہ علم نہیں تھا، جن میں نو مسلم بھی شامل تھے، انہیں موالی (اخوان فی الدین) کہا جانے لگا۔ یہ شناخت کا ایک طریقہ تھا اس میں حقارت کا کوئی پہلو شامل نہیں تھا۔

یہ دعویٰ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ عہد رسالت وخلافت راشدہ کے معاشرے میں قبائلی تفاخر کلیتہً ختم ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب قبیلہ موجود تھا تو قبائلی عصبیت وتفاخر اس سے وابستہ ایک ایسی نفسیاتی کیفیت تھی جس کا مظاہرہ ہوتا رہتا تھا۔ البتہ اب عصبیت و مفاخرت کے

موضوعات بدل گئے تھے۔ اب اس میں شرف آدمیت کو شامل کر دیا گیا تھا۔ مثلاً ایک بار قبیلۂ اوس وخزرج میں مفاخرت ہوئی، تو اوس نے کہا ''ہم میں حنظلہ ابن الراہب ہیں جن کو فرشتوں نے غسل دیا تھا، ہم میں عاصم بن الافلح ہیں جن کے جسم کو بھڑوں نے کفار کی دستبرد سے محفوظ رکھا تھا۔ ہم میں سعد بن معاذ ہیں جن کی موت پر عرش الٰہی ہل گیا تھا، ہم میں خزیمہ بن ثابت ہیں جن کی شہادت (گواہی) کو رسول اللہ ﷺ نے دو شہادتوں کے برابر قرار دیا تھا۔''

اس کے جواب میں خزرج نے بھی اپنے چار افراد کا نام لے کر مفاخرت کی اور کہا کہ ''ہم میں چار اشخاص ہیں جنہوں نے عہد نبوت میں قرآن یاد کر لیا تھا، یعنی سید القراء ابی بن کعب، معاذ ابن جبل، زید ابن ثابت اور ابو زید۔'' ۴۳

اسی طرح اگر کوئی کسی سے اس کا حسب نسب پوچھتا تو جواب ملتا میں تمہارا دینی بھائی ہوں، تاہم اگر تم میرے باپ دادا کے بارے میں پوچھ رہے ہو تو میں فلاں ابن فلاں ہوں۔ ابوبکرہ ثقفی سے کسی نے یہی سوال پوچھا تو انہوں نے جواب دیا ''انا من اخوانکم فی الدین و انا مولیٰ رسول اللہ۔'' ۴۴ ایک موقع پر کسی نے حضرت سلمان فارسی سے پوچھا، ''آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟'' تو انہوں نے جواب دیا ''انا سلمانُ ابنُ الاسلام من بنی آدم۔'' ۴۵ [یعنی میں سلمان ابن الاسلام ہوں اور میرا تعلق بنی آدم سے ہے۔]

مدینے میں قائم ہونے والے اس اسلامی معاشرے میں اب اصل اہمیت اس بات کو حاصل نہیں تھی کہ کس کا تعلق کس بڑے قبیلے سے ہے بلکہ اصل بات یہ ہو گئی تھی کہ کس نے خدا کی راہ میں ہجرت کی۔ یا کس نے مہاجرین کی مدد کی، یا کس نے غزوۂ بدر میں شرکت کی، یا کون سابقین اولین میں شامل ہے۔ اسلامی معاشرے کی نئی درجہ بندی اسی نہج پر ہوئی تھی، اسی اعتبار سے عہدِ فاروقی میں انہیں وظائف دیے گئے اور اسی معیار کے مطابق سقیفۂ بنو ساعدہ میں مسلمانوں کے پہلے امیر (خلیفہ) کا فیصلہ ہوا اور بنو تیم کے نسبتاً کم معروف قبیلے میں خلافت چلی گئی۔ اگر حسب نسب ہی دیکھا جاتا (جیسا کہ عہد جاہلیت میں دیکھا جاتا تھا) تو یہ خلافت بنوامیہ، بنو ہاشم، بنو مخزوم یا بنو ثقیف کے کسی صریح عرب کو ملتی۔

نئے قائم ہونے والے اسلامی معاشرے میں جو عزت و مرتبہ سابقین اولین کو حاصل تھا، قطع نظر اس کے کہ وہ حُر تھے یا غلام، وہ بڑے بڑے صاحب حسب نسب شرفائے مکہ کو نصیب نہ ہوسکا۔ چنانچہ اس نوزائیدہ اسلامی معاشرے میں جو حیثیت بلال بن ابی رباح موالی ابوبکر صدیق، عامر بن فہیرہ موالی ابوبکر صدیق، زید بن حارثہ موالی رسول اللہ ﷺ، سالم موالی ابوحذیفہ، سلمان فارسی موالی رسول اللہ ﷺ، صہیب بن سنان رومی، عمار بن یاسر ۲۶، خباب بن الارت، ابوذر غفاری اور عبداللہ ابن مسعود جیسے کمزور لوگوں کو حاصل تھی، وہ حیثیت نامی گرامی اشراف کو حاصل نہ ہوسکی، کیونکہ نئے اسلامی معاشرے میں نسب سے کہیں زیادہ اس بات کی اہمیت تھی کہ کس نے آوازِ نبوت پر پہلے لبیک کہا، اس کے لئے مصائب برداشت کیے، مال خرچ کیا اور قربانیاں دیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مورخین کی وہ تقسیم درست معلوم ہوتی ہے، جو انہوں نے صحابہؓ کرام کے مراتب کے مطابق انہیں مختلف طبقات میں تقسیم کردینے میں برتی ہے۔ چنانچہ بعض مؤرخین نے صحابہ کرام کو بارہ طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ جن میں آخری طبقہ ان لوگوں کا ہے جو فتح مکہ کے دن اسلام لائے۔ ۲۷

اسلامی معاشرے کی اہم بنیاد، یعنی مساوات بین المسلمین کی روح ہمیں اسلامی عبادات میں بھی نظر آتی ہے۔ ہر عبادت میں حیرت انگیز مساوات و رواداری کا سبق دیا گیا ہے۔ نماز (صلوٰۃ) میں سب برابر ہیں جو پہلے آیا ہے اسے اگلی صف میں جگہ ملے گی خواہ موالی ہو یا غلام۔ چنانچہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ آقا کا سر، اگلی صف میں کھڑے اس کے غلام کے قدموں میں ہوتا۔ بلاذری نے بیان کیا ہے کہ فتح مکہ سے قبل جب سردار مکہ ابوسفیان مسلمانوں کے پاس آئے تو انہوں نے مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے دیکھا۔ مساوات واطاعت گذاری کے اس نظارے نے انہیں ششدر کردیا اور انہوں نے کہا خدا جانتا ہے کہ میں نے آج کی طرح کبھی کسی قوم کی ایسی فرمانبرداری نہیں دیکھی جو ادھر اُدھر سے آکر جمع ہوگئی ہو۔ نہ معزز فارسیوں اور نہ پُرشکوہ رومیوں میں ایسی اطاعت گذاری کا نمونہ دیکھا ہے۔

اسی طرح رمضان کے روزے ہیں، جن میں بعض افعال سے بچنا ہے آقا کو بھی اور غلام کو بھی۔ دونوں کے لئے روزے کے قوانین یکساں ہیں۔ حج مساوات بین المسلمین کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے حج کے موقع پر مختلف اقوام اور مختلف افراد کی شخصی حیثیت کالعدم ہو جاتی ہے۔ غسانی امیر جبلہ بن الایہم، جس نے حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں اسلام قبول کرلیا تھا، ایک بار حج کے دوران کعبے کا طواف کر رہا تھا کہ اچانک اس کی چادر کے گوشے پر ایک بدوی کا پاؤں پڑ گیا، جبلہ نے طیش میں آکر اس بدوی کے ایک تھپڑ مار دیا۔ اس بدوی نے یہ معاملہ خلیفہ وقت حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے فیصلہ دیا کہ جواباً بدوی بھی امیر جبلہ کے ایک تھپڑ مارے۔ اس پر جبلہ سخت چیں بجبیں ہوا اور کہا کہ ہم تو وہ ہیں کہ اگر کوئی شخص ہم سے گستاخی کے ساتھ پیش آئے تو وہ قتل کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے جواباً کہا "جاہلیت میں تو ایسا ہی ہوتا تھا مگر اسلام نے شاہ و گدا اور پست و بلند کو ایک کر دیا ہے۔" جبلہ نے کہا "اگر اسلام ایسا مذہب ہے جس میں اعلیٰ و ادنیٰ کا کوئی امتیاز نہیں تو میں اس سے باز آتا ہوں۔" ۲۸ یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو نکٹے حبشی کی اطاعت اختیار کرنے کے لئے تیار کیا۔ صحیح مسلم میں ام الحصین سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان امر علیکم عبد مجدع حسبتھا قالت اسود یقود کم بکتاب اللہ تعالیٰ فاسمعوا لہ و اطیعوا۔ ۲۹

[اگر تم پر ایک سیاہ فام نکٹے غلام کو امیر بنا دیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کا فریضہ انجام دیتا ہو تو اس کی بات سننا اور اس کی اطاعت کرنا۔]

عبادات و امارت تو کسی نظام کا انتہائی اہم معاملہ ہوتا ہے، اس نئے اسلامی معاشرہ میں معمولی سے معمولی باتوں میں بھی اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ سابقہ جاہلی عصبیت و رعونت پلٹ کر نہ آنے پائے۔ لہٰذا عہد اسلامی میں شعار (یا نعرۂ جنگ) کی صورت بھی یکسر بدل گئی۔ قبائلی نعرے متروک ہو گئے۔ غزوۂ بدر میں مسلمانوں کا نعرہ اَحَد، اَحَد تھا، غزوہ احد میں اَمِت، اَمِت وغیرہ ۳۰ اسی طرح فتح مکہ اور حنین و طائف میں مہاجرین کا شعار یا بنی

عبدالرحمن اور انصار کا شعار یا بنی عبداللہ تھا۔

بہر حال یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام نے قبائلی مفاخرت ومنافرت کی جگہ اسلامی اخوت اور مساوات کی فضا پیدا کی۔ قرآن نے اسے نعمت الٰہی سے تعبیر کیا:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (آل عمران: ۱۰۳)

[اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے۔]

اسلامی تعلیمات نے عربوں کے عقلی رجحانات کو بڑی حد تک تبدیل کر دیا۔ اسلام نے جاہلی معیار خیر و شر کو بدل دیا تھا، زمانۂ جاہلیت کی بہت سی پسندیدہ اقدار، اسلامی معاشرے میں ناپسندیدہ ہو گئیں، مثلاً عربوں کی اسراف کی حد تک بڑھی ہوئی سخاوت، صحیح یا غلط اپنے قبیلے سے مکمل وفاداری۔ وغیرہ۔

تاہم جو اسلامی معاشرہ اسلامی تعلیمات کے نتیجے میں جزیرہ نمائے عرب میں قائم ہوا تھا اس میں سارے ہی افراد تقویٰ کے مطلوبہ معیار تک پہنچے ہوئے نہیں تھے۔ بلکہ یہ ایک ملا جلا معاشرہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مختلف افراد یا گروہ افراد نے اسلامی تعلیمات کو مختلف پیمانے پر قبول کیا۔ اس سلسلے میں ایچ۔ اے۔ آر۔ گب ایک نہایت معقول تجزیہ پیش کرتا ہے:

"In Muhammad's own life time, it (Islam) was received at three different levels. The first was at the level of total conversion, producing religious personalities, whose activities and decisions were motivated by a complete inward acceptance of its spirit and principles. This group, the nucleus of the future religious institution, was in the nature of the case relatively small to begin with but steadily increased with the expansion of the community.

The second was that of formal adhesion, of willing acceptance of the outward presumptions and duties without assimilation of their spirit, but because of the advantages to be gained by incorporation in the new community, its leading representatives were the later Meccan adherents, to whose mercantile temper the external demands of Islam were eminently suited requiring only the dedication to religious duties of a proportion of time and wealth and leaving the rest free for personal activities and interests. A further commendation of Islam in Meccan eyes was the firm control which is established over the Bedouins, whose acceptance was on the third level, that of enforced adherence maintained by threat (and after Muhammad's death by the application) of the military sanctions."[۱۳]

اس معاشرے میں بعض وہ لوگ تھے جنہوں نے پوری آمادگی اور صمیم قلب سے اسلام کی دعوت، ابتدائی سالوں میں ہی قبول کر لی۔ یہ السابقون الاولون تھے۔ انہیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ رہنا نصیب ہوا لہٰذا ان کی قلب ماہیت ہوگئی۔ یہ لوگ قلیل التعداد تھے۔ دوسرے وہ لوگ تھے جنہوں نے قدرے تاخیر سے اسلام قبول کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی براہ راست صحبت انہیں قدرے کم نصیب رہی مگر یہ اچھے مسلمان ثابت ہوئے۔ ان کی تعداد اول الذکر گروہ سے زیادہ تھی۔ تیسرا گروہ وہ تھا جو اسلام کے آخری ایام میں اسلام لایا، صرف اس لئے کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اسلام اس وقت کی پھیلتی بڑھتی ہوئی سیاسی اور فوجی قوت تھی، مکہ فتح ہو چکا تھا، گرد و نواح کے قبائل اسلام کے دامن میں پناہ لے چکے تھے، لہٰذا کوئی راستہ نہ پا کر انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ زیادہ تر اہل البادیہ تھے جن کو قرآن ''اعراب'' کا نام دیتا ہے۔ یہ سب سے کثیر التعداد گروہ تھا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی

مقررہ کردہ حدود سے بہت زیادہ بیگانہ تھے جن کے کچھ سربرآوردہ رہنما دین کو برحق سمجھتے ہوئے نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کے بعد آپ کی جانشینی کے خیال سے اسلام لائے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے اس بیان سے ساری صورت حال واضح ہو جاتی ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے مجھے جو ہدایت وعلم دے کر بھیجا ہے اس کی مثال بارش کی سی ہے، جو ایسی زمین پر برسے جس کا ایک قطعہ قابل کاشت اور زرخیز ہو، جو پانی اپنے اندر جذب کر لے پھر وہاں سبزہ و نباتات بکثرت پیدا ہو جائے۔ دوسرا قطعہ سخت پتھریلا نشیبی ہو جہاں پانی ٹھہر جائے اور اس پانی سے خدا لوگوں کو فائدہ پہنچائے کہ وہ اس میں سے خود پئیں نیز اپنے جانوروں اور کھیتوں کو سیراب کریں اور ایک قطعہ زمین بالکل سپاٹ اور چٹیل ہو جس میں نہ پانی رکے نہ گھاس اگے۔" ۳۲

ہم دیکھتے ہیں کہ صورت احوال بعینہٖ یہی تھی چنانچہ سب سے آخر میں ایمان لانے والے بدو، جنہیں قرآن اعراب کہتا ہے، ان کا یہی حال تھا کہ ہجو گوئی، بے جا تعصب، اپنے آباء پر فخر اور مے خواری جیسی عادتوں میں مبتلا رہے۔ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے ساتھ ہی ارتداد رونما ہوا جو دراصل قبائلی تعصبات کی ہی دوسری شکل تھی۔



حوالہ جات:

۱۔ عمرو بن الاہتم بن سمی تمیمی المنقری، بنو تمیم کا ایک مشہور شخص تھا جو شعر و خطابت میں اپنی نمایاں قابلیت کی وجہ سے نیز اپنے حسن و جمال کی وجہ سے بھی مشہور تھا اور اسی وجہ سے اس کا لقب المکحل (سرگیں چشم) ہو گیا تھا۔ وہ ہجرت سے چند سال قبل پیدا ہوا اور ۹ھ/ ۶۳۰ء میں اپنے قبیلے کے ایک وفد کے ساتھ مدینہ آیا۔ (الاستیعاب، جلد ۳، ص ۵-۱۱۶۳، ابن عبد البر نے اس کے ارتداد کا ذکر نہیں کیا۔) وہ ۱۱ھ/ ۶۳۲ء میں مرتد ہو گیا تھا اور سجاح (مدعیہ نبوت) کی پیروی اختیار کر لی تھی، تاہم بعد میں وہ پھر اسلام لے آیا اور اسلامی فتوحات میں شرکت کی۔

اس کی وفات ۵۷ھ/ ۶۷۷ء کے لگ بھگ ہوئی۔ اس نے رشہر کی فتح کی منظوم خبر حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ حضرت عثمانؓ کے خلاف بلوائیوں کی جو ٹولی کوفہ سے گئی تھی، یہ اس کا سردار تھا۔ (البدایہ و النہایہ، جلد ۷، ص ۱۷۴۔)

۲۔ احنف بن قیس، بصرے کے تمیمی سردار تھے۔ ان کا نام ابو بحر صخر اور بقول بعض ضحاک بن قیس بن معاویہ التمیمی السعدی المنقری تھا۔ ہجرت سے تین سال قبل پیدا ہوئے بچپن ہی میں والد کے سائے سے محروم ہو گئے، کسی عمل جراحی کی وجہ سے ان کے ایک پاؤں میں ٹیڑھ تھا، اسی لئے انہیں ''احنف'' کہتے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پایا مگر آپؐ سے ملے نہیں۔ اس کے بعد وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش ہوئے۔ بصرے کے اولین باشندوں میں شمار ہوتے تھے۔ جہاں وہ بہت جلد ان کے ترجمان اور ان کے سردار بن گئے۔ ان کی شخصیت اس انداز کی تھی کہ لوگ کہتے تھے کہ جب وہ غضب ناک ہوتے تو ان کے غصے کی وجہ سے ایک لاکھ تلواریں تڑپ کر باہر آ جایا کرتیں، یہ جانے بغیر کہ احنف کو کس بات پر غصہ آیا ہے۔ ایران اور ترکستان کی فتوحات میں ان کا نمایاں حصہ ہے۔ جنگ جمل میں وہ غیر جانبدار رہے تاہم صفین میں حضرت علیؓ کی طرف سے لڑے۔ ان کا انتقال ۶۷ھ میں کوفہ میں مصعب بن زبیر کے عہد امارت میں ہوا۔ ان کی اصل شہرت ان کی دانشمندی کی وجہ سے ہے، جس کا اظہار ان کے کہے ہوئے ان حکیمانہ اقوال سے ہوتا ہے جن میں سے بعض ضرب الامثال بن گئے ہیں ان کے حلم کا مقابلہ حضرت امیر معاویہ کے حلم سے کیا جاتا ہے چنانچہ مثل مشہور ہے کہ احلم من الاحنف (احنف سے بھی زیادہ حلیم) امیر معاویہ کے دربار میں انہیں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ (احمد امین المصری، فجر الاسلام، قاہرہ)

۳۔ زیات، احمد حسن، تاریخ ادب العربی، ص ۸۲، دار نہضۃ، مصر۔

۴۔ Joseph Hell, ***The Arab Civilization***, translated from the German, by S. Khuda Bakhsh, p 20, Lahore, 1969.

۵۔ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ طبری نے کئی احادیث نقل کی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تم سے حسب نسب کے بارے میں نہیں پوچھے گا بلکہ اللہ کے نزدیک افضل وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔'' (طبری، ابو جعفر بن جریر، جامع

البیان، عن تاویل آی القرآن، جلد ۲۶، ص ۱۴۰، مصطفیٰ بابی حلبی، مصر، ۱۳۸۳ھ/۱۹۵۴ء۔)

۶۔ الطبقات الکبریٰ، جلد ۲، ص ۱۳۳۔ تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۶۱ (تاریخ طبری میں ہے کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے سورۃ الحجرات کی تیرھویں آیت تلاوت کی تھی۔ تاریخ ابن خلدون، جلد ۳، ص ۲، پر اس کو حدیث کے طور پر لکھا گیا ہے)۔

۷۔ "عجمی" کے لغوی معنی کند زبان یا گونگے کے ہیں کیونکہ غیر ممالک کے لوگ عرب جا کر وہاں کی زبان نہیں بول سکتے تھے اس وجہ سے اہل عرب انہیں عجمی یعنی "گونگے" کہا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں یہ لفظ وہ کم شائستہ اجنبی کے لئے بھی بولتے تھے۔ "عجمہ" عربی لفظ "فصاحت" کی ضد ہے۔ عہد جاہلیت میں چونکہ عربوں میں غیر عربوں کے مقابلے میں احساس تفاخر اور احساس برتری بہت بڑھا ہوا تھا لہٰذا لفظ عجمی حقارت کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔ تاہم اس لفظ کا مفہوم اس کے استعمال کرنے والے کے مخصوص نقطہ نظر پر منحصر ہوتا تھا۔ لہٰذا اس لفظ میں، عہد عباسی میں، ایک تہذیبی دلکشی نظر آنے لگی۔ اس وقت یہ لفظ ذلت کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا اور اس میں شک نہیں کہ اس لفظ کی حقارت کو زائل کرنے میں ایرانیوں کے ماضی سے زیادہ اسلامی تعلیمات کا دخل تھا۔ صرف "عجمی" ہی نہیں بلکہ اسلام نے کئی الفاظ کی حقارت کو عمدگی سے زائل کیا۔

۸۔ الجاحظ، البیان و التبیین، جلد ۲، ص ۱۵-۱۶۔

۹۔ تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۱۵۱۔

۱۰۔ الحجرات، قرآن کی مدنی سورت ہے۔ اس سورت میں اسلامی معاشرے کے افراد میں اخوت و مساوات اور محبت و خلوص پیدا کرنے کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلے مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کی ذات سے عقیدت و محبت اور انتہائی ادب و احترام کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ملت اسلامیہ کو اُن صورتوں کی نشاندہی کرائی گئی ہے جن سے افتراق، عداوت، بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً بلا تحقیق کسی کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا جائے، متحارب گروہوں میں صلح کرادی جائے۔ کسی کی تحقیر نہ کی جائے، جاسوسی اور بدگمانی سے باز رہا جائے۔ سب سے آخر میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ سب انسان اولادِ آدم ہیں، کسی کو کسی پر فخر و فضیلت نہیں۔ اللہ کے ہاں عزت و برتری اور دنیاوی اور اخروی کامیابی کا مستحق صرف وہ ہے جو متقی اور پرہیزگار ہے۔

۱۱ R. Levy, ***The Social Structure of Islam***, Cambridge, 1957, p. 55.

۱۲ مسند احمد میں ہے کہ "تمہارے یہ نسب نامے کوئی کام دینے والے نہیں، تم سب برابر ہو اور آدمؑ کی اولاد ہو، کسی کو کسی پر فضیلت نہیں بجز تقویٰ کے۔" (تفسیر ابن کثیر، جلد ۵، ص ۱۵۵)

۱۳ صحیح بخاری، باب ۱۹، کتاب الوصایا (ھل یدخل النساء و الولد فی الاقارب)، محمد سعید اینڈ سنز، کراچی (تاریخ طبع ندارد)۔

۱۴ مسند احمد بن حنبل، جلد ۲، ص ۲۹۱۔

۱۵ صحیح مسلم، جلد ۱، ص ۸۲ (کتاب الایمان)۔

۱۶ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۸، ص ۱۸۶۔

۱۷ Ignaz Goldziher, ***Muslim Studies, (Muhammedanische Studien)***, Vol. 1, pp 54-55, translated by C. R. Barber & S. M. Stern, London, 1967.

۱۸ السابقون الاولون کے بارے میں مختلف روایتیں ملتی ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک، انصار و مہاجرین میں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ وہ ابتدائی مسلمان ہیں جو جنگ بدر میں شریک ہوئے اور بعض کے خیال میں السابقون الاولون وہ ہیں جو بیعت الرضوان میں شامل تھے۔ (الاستیعاب، جلد ۱، ص ۲، ۳، ۱۰، ۱۳-۱۴)

۱۹ غیلان بن جریر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالک سے پوچھا کہ آپ لوگ انصار کے لقب سے خود اپنے آپ کو پکارتے تھے یا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ لقب دیا تھا۔ انہوں نے جواب دیا، اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ لقب دیا ہے۔ (بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ۱) قرآن مجید نے سورۂ توبہ میں مدینہ کے مسلمانوں کو "انصار" کا نام دیا۔ اس سے قبل یہ اوس و خزرج کے ناموں سے یاد کیے جاتے تھے جن میں شدید قبائلی عصبیت کی وجہ سے طویل جنگیں ہوئی تھیں۔ تاہم اسلامی تعلیمات کی وجہ سے اوس و خزرج کی باہمی عداوت رفتہ رفتہ ختم ہو گئی اور حضرت ابوبکرؓ کے منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد تو ان کی باہمی عداوت کا ذکر ہی سننے میں نہیں آیا۔

۲۰ *A.R. Nicholson, A Literary Hiostory of the Arabs, p. 173, Cambridge, 1953.*

۲۱ الاستیعاب، جلد ۳، ص ۱۰۹۸۔

۲۲ الطبقات الکبریٰ، جلد ۴، ص ۷۰، نیز ذہبی، شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان (م ۷۴۸ھ)،

سیرُ اعلام النبلاء، (دار المعارف، مصر)، جلد ۲، ص ۲۵۶۔

۲۳ بلوغ الادب، جلد ۱، ص ۲۸۷۔ ۲۴ الاستیعاب، جلد ۴، ص ۱۹۱۵۔

۲۵ ایضاً، جلد ۲، ص ۲۳۳۔

۲۶ عمار بن یاسر بن مالک بن کنانہ عنسی ثم المذحجی کی کنیت ابوالیقظان تھی، بنو مخزوم کے حلیف تھے، ان کے خاندان کو اسلام قبول کرنے پر سخت عذاب دیا گیا۔ انہوں نے دو ہجرتیں کیں، دو قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، جنگِ بدر اور دیگر مشاہد میں شریک رہے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں کوفہ کا والی مقرر کیا تھا۔ جنگ صفین (۳۷ھ) میں حضرت علیؓ کی طرف سے جنگ لڑی اور شہید ہوئے۔ (الاستیعاب، جلد ۳، ص ۱۱۳۵، ۱۱۴۱۔)

۲۷ احمد امین المصری، فجر الاسلام، (مکتبہ نہضۃ، مصر، ۱۹۶۵ء) ص ۸۲۔ (ابوالفداء نے طبقات صحابہ میں ایک طبقے کا اور اضافہ کیا ہے جس میں ان اصحاب کو شمار کیا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں کمسن تھے۔)

۲۸ البدایہ و النہایہ، جلد ۸، ص ۶۳ تا ۶۶۔ الطبقات الکبریٰ، جلد ۱، ص ۲۶۵۔ امام ابوالحسن البلاذری، فتوح البلدان، (دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء)، ص ۱۳۲۔

۲۹ صحیح مسلم، جلد ۲، ص ۹۴۳ (کتاب الحج)، نیز جلد ۳، ص ۱۴۶۸ (کتاب الامارۃ)۔

اس طرح کی روایتیں بخاری اور مسلم میں اور بھی ملتی ہیں مثلاً ابوذر غفاریؓ روایت کرتے ہیں کہ مجھے میرے دوست (رسول اللہ ﷺ) نے وصیت فرمائی کہ "اگر تم پر ایک نکٹے حبشی کو امام بنا دیا جائے تو اس کی اطاعت کرتے رہنا۔" بخاری میں ایک اور جگہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اگر تم پر حبشی کو امام بنا دیا جائے، جس کا سر منقی جیسا ہو تو بھی اس کی بات سننا اور اس کے اطاعت شعار رہنا۔"

۳۰ ابن ہشام، جلد ۲، ص ۲۸۷۔

۳۱ H.A.R. Gibb, ***Studies on the Civilization of Islam***, p. 5, London, 1962.

۳۲ احمد حسن زیات، ص ۱۵۵۔



باب سوم: فصل دوم

اسلام میں غلامی کا تصور

جیسا کہ باب اول میں لکھا جا چکا ہے کہ عربوں کے یہاں آزاد کردہ غلاموں کو بھی ''مولیٰ'' کا نام دیا جاتا تھا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اسلام میں غلامی کی حقیقت کو سمجھا جائے۔ اور ان سوالات کے جوابات تلاش کیے جائیں کہ کیا اسلام نے غلامی جیسے انسانیت سوز ادارے کو ختم کیا یا باقی رکھا؟ اگر ختم کیا تو کیسے؟ اور اگر باقی رکھا تو کیوں؟

بعثت محمدیؐ کے وقت عرب اور بیرون عرب، دنیا بھر کے معلوم معاشرے غلاموں سے بھرے ہوئے تھے اور ان قوموں کا سارا معاشی اور معاشرتی نظام انہی غلاموں کے سہارے چل رہا تھا۔ ایک شخص کا اپنے ہی جیسے دوسرے شخص پر دولت، قوت یا کسی اور ذریعے سے تسلط حاصل کر لینا اور اس کی زندگی اور موت کا مالک بن جانا، اس کو اس کے تمام حقوق سے محروم کر دینا، ایک ایسا سماجی رواج تھا جو معلوم زمانے سے انسانی معاشروں میں مروج چلا آ رہا ہے۔ اسلام نے غلامی کے اس مسئلے کو اس حد تک حل کیا جس حد تک ایسے مسائل، جو دو قوموں کے درمیان ہوں، حل کیے جا سکتے ہیں۔

داخلی طور پر اسلام نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ غلام بنانے کی تمام مروجہ صورتوں کو سخت ناپسندیدہ بلکہ جرم قرار دے کر عملاً اور حکماً انہیں ختم کر دیا۔ غلام بنانے کی مروجہ صورتوں میں سے ایک صورت تو یہ تھی کہ بھولے بھٹکے یا کم تعداد میں سفر کرنے والوں کو اغواء

کر کے غلام بنا لیا جائے، جیسے حضرت سلمان فارسیؓ کو بنو کلب نے دھوکے سے غلام بنا لیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ صراحتاً اس ظلم کی ممانعت کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

قال اللہ تعالیٰ ثلاثة انا خصمهم يوم القيامة رجل اعطى بي ثم غدر و رجل باع حرًا فا کل ثمنه و رجل استاجر اجيرًا فاستوفى منه ولم يعطه اجره.''[۴]

[اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، تین قسم کے لوگوں پر میں قیامت کے دن مقدمہ کروں گا، ایک وہ شخص جس نے مجھ کو عہد دیا اور پھر غداری کی اور ایک وہ شخص جس نے آزاد کو غلام بنا کر فروخت کیا اور اس کی قیمت کھائی اور ایک وہ جس نے کسی مزدور سے اجرت پر پورا کام کرا لیا مگر اس کو اجرت نہ دی۔]

دوسری طرف اسلام نے جوئے اور قمار بازی کو حرام[۵] قرار دے کر غلام بنائے جانے کی یہ صورت خود بخود ختم کر دی کہ کوئی شخص داؤ پر لگے اور ہار کر کسی دوسرے کی غلامی میں چلا جائے۔

قرض کی عدم ادائیگی کی صورت میں بھی قرض دار کو غلام بنا لیا جاتا تھا۔ چنانچہ قرآن یہاں بھی واضح ہدایت دیتا ہے۔

وَاِنْ کَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰی مَیْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (البقرہ:۲۸۰)

[تمہارا قرض دار تنگ دست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اسے مہلت دو اور جو صدقہ کر دو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔]

یہی نہیں بلکہ مصارف زکوٰۃ میں ایک مد ادائیگی قرض اور گردن چھڑانے کی بھی رکھی ہے[۶] تاکہ معاشرے کے مقروض افراد کا قرض معاشرے کی اجتماعی ذمہ داری بن جائے اور قرض کی عدم ادائیگی کی صورت میں ان کے غلام بنا لیے جانے کا امکان ختم ہو جائے۔

قرآن نے والدین اور اولاد کے حقوق و فرائض متعین کیے۔ ذیل کی آیت قرآنی[۷]

والدین کے لئے وہ راستہ بند کر دیتی ہے کہ وہ غربت و افلاس سے خوفزدہ ہو کر اپنی اولاد کو قتل یا فروخت نہ کریں۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا. (بنی اسرائیل:۳۱)

[اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی، درحقیقت ان کا قتل ایک بہت بڑی غلط کاری ہے۔]

غرض اس طرح غلام بنانے کی تقریباً تمام ہی مروجہ صورتیں حکماً یا عملاً ختم کر دی گئیں مگر جنگی قیدیوں کی حد تک بہرحال اس بات کی گنجائش تھی کہ انہیں غلام بھی بنایا جا سکتا تھا گو کہ یہ بات حکماً نافذ نہیں کی گئی مگر حکماً منع بھی نہیں کی گئی۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ زیر نظر عہد میں جنگوں میں گرفتار ہونے والے قیدیوں کو غلام اور باندیاں بنانے یا انہیں قتل کر دیے کے سوا اور کوئی صورت نہیں تھی، لیکن اسلام نے اس کے علاوہ اور صورتوں کی گنجائش نکالی۔ سورہ محمد میں جنگی قیدیوں کے بارے میں یہ حکم آیا ہے:

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ڎ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاۗءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (محمد:۴)

[پس جب ان کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھ لو۔ اس کے بعد (تمہیں اختیار ہے) احسان کرو یا فدیہ کا معاملہ کر لو۔ تا آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے۔]

اس آیت میں قیدیوں سے متعلق دو ہی صورتیں بتائی گئی ہیں۔

۱۔ یا تو ان پر احسان کیا جائے۔

۲۔ یا قیدیوں کو فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے۔

تاہم مشرک قیدیوں کو قتل کر دینے کی بھی گنجائش ہے۔

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوْهُمْ (التوبہ:۵)

[جہاں کہیں بھی تم مشرکین کو پالو انہیں قتل کر ڈالو۔]

احسان میں چار چیزیں شامل ہیں۔

۱۔ قید کی حالت میں ان سے اچھا برتاؤ۔

۲۔ قتل یا دائمی قید کے بجائے ان کو غلام بنا کر مسلمانوں کے حوالے کر دیا جائے۔

۳۔ جزیہ لگا کر ذمی بنا لیا جائے۔

۴۔ بلا معاوضہ رہا کر دیا جائے۔

فدیہ کا معاملہ کرنے کی بھی دو صورتیں تھیں۔

۱۔ یہ کہ مالی معاوضہ لے کر یا کوئی خاص خدمت لے کر انہیں رہا کر دیا جائے۔

۲۔ قیدیوں کا تبادلہ کر کے اپنے افراد چھڑا لیے جائیں۔

ان میں سے ہر ایک کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا عمل موجود ہے۔

جنگ کی صورت میں جنگی قیدیوں کو غلام بنا لینا اس وقت تمام اقوام میں رائج تھا۔ اس آیت میں نہ تو جنگی قیدیوں کو غلام بنالینے کا صراحتاً حکم دیا جارہا ہے اور نہ منع ہی کیا جارہا ہے۔ تاہم رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کا واضح رجحان مفتوحہ آبادیوں کو غلام نہ بنانے کی طرف تھا اور جہاں اس کی ضرورت محسوس کی وہاں انہیں مسلسل قید خانوں یا عقوبت گاہوں میں رکھنے کے بجائے مسلمان گھرانوں پر تقسیم کر دیا گیا جس کا دوطرفہ فائدہ ہوا۔ ایک فائدہ حکومت وقت کو ملا کہ اس کے جنگی قیدیوں کا مسئلہ حل ہوگیا اور بیت المال پر اضافی بوجھ بھی نہیں پڑا۔ دوسرا فائدہ جنگی قیدیوں (غلاموں) کو ہوا جب انہیں قید خانوں کی سخت اور پابند زندگی گزارنے کے بجائے مسلمان گھرانوں میں ان کے ایک فرد کے طور پر رہنے کا موقع ملا تو ان پر ان کے مسلمان آقاؤں کی پاکیزہ سیرتوں کے اثرات مرتب ہوئے۔ چنانچہ تاریخ میں ایسے متعدد واقعات موجود ہیں کہ ان غلاموں نے اپنے آقاؤں کی سیرتوں سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرلیا، ان کا اسلام قبول کرنا اکثر ان کے لئے پروانہ آزادی ثابت ہوتا۔ آزادی کے

باوجود ولاء کے رشتے سے وہ اپنے آقا کے موتی بن کران سے وابستہ رہتے۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں پھیلایا جانے والا یہ تاثر ایک عام غلط بیانی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ساری زندگی جنگ و جدل، خون خرابے اور لوٹ کھسوٹ میں گذر گئی، بستیوں کی بستیاں لونڈی غلام بنائی گئیں۔ افسوس کی بات ہے کہ یہاں غلطی مستشرقین سے ہی نہیں، خود مسلمان مورخین سے بھی ہوئی، جنہوں نے گشتی دستوں کو بھی غزوات یا سرایا کے عنوان سے پیش کر کے معمولی صورت حال کو گمبھیر بنادیا اور بیشتر مستشرقین نے اس بات کو مسلمان مورخین سے بعینہٖ لے کر حقِ تحقیق ادا نہ کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ عہد رسالت میں ایسے غزوات وسرایا کی تعداد جن میں جنگی قیدی ہاتھ آئے، چھبیس (۲۶) ہے۔ مخالفین کے کل افراد جو مسلمانوں کے ہاتھوں قید یا گرفتار ہوئے، ان کی تعداد ساڑھے سات ہزار کے لگ بھگ ہے۔ اس میں سے ۶۸ جنگ بدر کے قیدیوں کو زر فدیہ لے کر رہا کیا گیا جبکہ ساڑھے چھے ہزار سے زائد قیدیوں کو احساناً بغیر کسی زر فدیہ کے رہا کیا گیا۔ اس اعتبار سے عہد رسالت کے جنگی قیدیوں کی تعداد ایک ہزار سے بھی بہت کم ہے۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی عام حکمت عملی یہ رہی کہ آپ کثرت سے قیدیوں کو رہا کر دیا کرتے تھے اور مسلمانوں کے لئے آپ کا یہ عمل حکم کے درجہ میں آگیا تھا۔[۶]

جنگِ بدر کے بعد غزوہ بنو مصطلق (شعبان ۶ھ) میں بڑی تعداد میں قیدی ہاتھ آئے تھے۔ انہی میں قبیلۂ بنو مصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار الخزاعی کی بیٹی برۃ (ام المومنین جویریہؓ) بھی تھیں، جو ایک مسلمان ثابت بن قیس شماس کے حصے میں آئی تھیں۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے مکاتبت کی درخواست کی، رسول اللہ ﷺ نے ان کی درخواست پر انہیں ان کے مالک (ثابت بن قیس) سے خرید کر آزاد کر دیا۔ نیز بنو مصطلق کی تالیف قلب اور تکریم کی خاطر ان کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ ان کے پہلے شوہر جنگ میں مارے گئے تھے (اس جنگ میں بنو مصطلق کے دس آدمی مارے گئے تھے)۔ اس صہری رشتے کی وجہ سے صحابہ کرامؓ نے بنو مصطلق کے تمام قیدیوں کو، جن کی تعداد سو

سے زائد تھی، آزاد کر دیا اور بنی مصطلق کی کوئی عورت ایسی نہ تھی جو اپنی قوم میں واپس نہ چلی گئی ہو۔ ۸

صلح حدیبیہ کے موقع پر مکہ کے اسی (۸۰) آدمی تنعیم کی طرف سے آئے اور فجر کی نماز کے قریب انہوں نے آپ کے کیمپ پر اچانک شب خون مارنے کا ارادہ کیا، وہ سب کے سب پکڑ لیے گئے لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں احساناً چھوڑ دیا تاکہ اس نازک موقع پر یہ معاملہ لڑائی کا موجب نہ بن جائے۔

فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے چند آدمیوں کے سوا تمام اہل مکہ کو جو مفتوح و مغلوب تھے، احساناً معاف کر دیا اور جنھیں مستثنیٰ کیا تھا ان میں سے بھی تین چار کے سوا کوئی قتل نہ کیا گیا۔ فاتح ہونے کے باوجود آپؐ نے نہ مفتوحین مکہ کے مال کو اسلامی لشکر کے لئے حلال (غنیمت) ۹ قرار دیا اور نہ انہیں لونڈی غلام بنایا بلکہ عام معافی کی صورت میں انہیں جان و مال، عزت و آبرو کی امان نصیب ہوگئی۔ حالانکہ انہی اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے ساتھ مکہ میں کیسا بہیمانہ سلوک کیا تھا، تاریخ کا یہ کوئی ڈھکا چھپا واقعہ نہیں ہے۔

جنگ حنین کے بعد جب قبیلہ ہوازن کا وفد اپنے قیدیوں کی رہائی کے لئے حاضر ہوا تو سارے قیدی لشکر میں تقسیم کیے جا چکے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے سب مسلمانوں کو جمع کر کے فرمایا، یہ تائب ہو کر آئے ہیں اور میری رائے یہ ہے کہ ان کے قیدی ان کو واپس دے دیے جائیں۔ تم میں سے جو بخوشی اپنے حصے میں آئے ہوئے قیدی کو بلا معاوضہ چھوڑنا چاہے وہ اس طرح چھوڑ دے اور جو معاوضہ لینا چاہے اس کو ہم بیت المال میں آنے والی پہلی آمدنی سے معاوضہ دیں گے۔ چنانچہ چھ ہزار قیدی رہا کر دیے گئے۔ ۱۰

آپؐ نے بعض قیدیوں کو تبادلے میں بھی رہا کیا۔ مثلاً ایک سریہ جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سرکردگی میں بنو کلاب کی طرف نجد میں بھیجا گیا تھا (۷ھ) اس میں چند افراد قید ہوئے۔ ایک قیدی لڑکی سلمہ بن الاکوع کے حصے میں آئی، جسے رسول اللہ ﷺ نے بہ اصرار مانگ کر مکہ بھجوا دیا اور اس کے بدلے دو مسلمان قیدیوں کو جو قریش مکہ کے قبضے میں تھے، رہا

کروالیا۔ [11] اسی طرح بنو ثقیف کے حلیف بنی عقیل کا ایک آدمی مسلمانوں کے پاس گرفتار ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو طائف بھیج کر اس کے بدلے دونوں مسلمانوں کو رہا کروالیا۔ جنگ بدر کے ایک قیدی عمرو بن ابی سفیان کے بدلے ایک مسلمان سعد بن نعمان کو رہا کرانے کا واقعہ ابن ہشام نے بیان کیا ہے۔ [12]

یوں ایک طرف تو اسلام نے غلامی کی مروجہ صورتوں کو حکماً ختم کیا تو دوسری طرف جہاں بہ امر مجبوری جنگی قیدیوں کی حد تک غلامی کو روا رکھا وہاں بھی روح یہ کارفرما تھی کہ گنجائش کی حد تک احساناً قیدیوں کو رہا کر دیا جائے لیکن جہاں گنجائش نہ ہو وہاں انہیں غلام بنانا ناگزیر تھا۔ اسلام کو یہ اجازت اسی وجہ سے دینی پڑی کہ جنگ ہمیشہ کم از کم دو قوموں کے مابین معاملہ ہوتا ہے۔ ان میں سے اگر ایک فریق جنگی قیدیوں پر تصرف سے باز آجائے تو دوسرا فریق کھل کھیلے گا اور اپنے حریف کو ہلاکت میں ڈال دے گا۔ چونکہ یہ دو طرفہ معاملہ تھا لہٰذا اسلام "لا رق فی الاسلام" کا یک طرفہ فیصلہ سنا ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس طرح مسلمان تو کبھی کسی جنگی قیدی پر قابض نہ ہو سکتے، جبکہ مد مقابل کفار مسلمانوں کو اندھا دھند قیدی بنا کر اسلامی ریاست پر زبردست سیاسی، معاشی اور اخلاقی دباؤ بڑھا سکتے تھے۔ چنانچہ اسلام کو غلامی کی یہ شکل مجبوراً اس وقت تک برداشت کرنی پڑی جب تک فریق ثانی اس سلسلہ میں ایک ہی لائحہ عمل پر متفق نہ ہو جائیں۔ یوں جنگی قیدیوں کا معاملہ اسلامی حکومت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔

تاہم عہد جاہلیت کے ثمرہ کے طور پر عربی معاشرے میں جو غلام پہلے سے موجود تھے، ان کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے ایک طرف اسلام نے غلاموں کے حقوق متعین کیے تو دوسری طرف ان کی آزادی کے لئے ایک تحریک سی چلا دی۔ فَکُّ رَقَبَہ کی اس تحریک کے نتیجے میں سینکڑوں، ہزاروں غلام آزاد ہوئے اور معاشرے کے باعزت شہری (موالی) بنے۔

فَکُّ رَقَبَہ کی تحریک کیا تھی۔ یہ دراصل وہ اسلامی احکام و قوانین تھے جن کے ذریعے مسلمانوں کو اس بات کی ترغیب دی گئی کہ وہ زیادہ سے زیادہ غلام آزاد کریں۔ قرآن

نے غلاموں کو آزاد کرنا ایک انتہائی نیکی کا عمل بتایا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

وَهَدَيْنَٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِىْ يَوْمٍ ذِىْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ (البلد: ۱۰-۱۶)

[اور کیا ہم نے نہیں دکھا دیئے (انسان کو) دونوں نمایاں راستے۔ مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہ کی اور تم کیا جانو کیا ہے وہ دشوار گزار گھاٹی۔ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔]

اس سلسلے میں بہت سی احادیث بھی ملتی ہیں۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ایما الرجل اعتق امرأ مسلماً استنقذ اللہ بکل عضو منہ عضواً منہ من النار ۱۳

[جس شخص نے ایک مومن غلام کو آزاد کیا اللہ تعالیٰ اس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں آزاد کنندہ کے ہر عضو کو دوزخ کی آگ سے بچا لے گا۔]

حضرت علی بن حسینؓ (امام زین العابدین) نے اس حدیث کے راوی سعد بن مرجانہ سے پوچھا: کیا تم نے یہ حدیث ابو ہریرہؓ سے خود سنی ہے۔ انہوں نے کہا: ''ہاں''۔ اس پر علی بن حسینؓ نے اپنے سب سے قیمتی غلام کو، جس کی قیمت ان کو عبداللہ بن جعفر دس ہزار درہم (یا ایک ہزار دینار) دینے کو تیار تھے، بلایا اور اسی وقت آزاد کر دیا۔ ۱۴

بیہقی کی روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کوئی ایسا عمل بتائیں جو جنت میں لے جائے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ''غلام آزاد کر اور گردن چھڑا۔'' اور جب ابو ذر غفاریؓ نے پوچھا ''حضور کس غلام کو آزاد کرنا سب سے افضل ہے؟'' تو آپؐ نے جواب دیا ''جس کی قیمت سب سے زیادہ ہو اور جو مالک کو زیادہ پسند ہو، اسے آزاد کرنا اللہ

کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔" ۱۵

اسلام نے صرف ترغیبات سے ہی کام نہیں لیا اور اسے محض ایک اخلاقی مسئلہ ہی نہیں سمجھا بلکہ اس کے لئے عملی اقدامات کیے اور غلاموں کو بندِ غلامی سے چھڑانے کے لئے متعدد ذرائع نکالے۔

اسلام نے غلاموں کی آزادی کا ایک طریقہ یہ نکالا کہ بعض جرائم سرزد ہو جانے کی صورت میں مسلمانوں کو کفارے کے طور پر غلام آزاد کرنے کا حکم دیا چنانچہ اگر کوئی شخص قسم کھا کر توڑ دے تو اس کے کفارے کی ایک صورت غلام کو آزاد کرنا ہے۔ ۱۶ اسی طرح ظہار کے کفارے میں بھی ایک صورت غلام کو آزاد کرنا ہے۔ ۱۷ اگر کوئی مسلمان غلطی سے کسی مسلمان کو قتل کر دے تو اس کا کفارہ بھی غلام کو آزاد کرنا ہے۔ ۱۸ اگر مسلمان نے کسی معاہد کافر ملک یا غیر معاہد کافر ملک میں رہنے والے مسلمان کو قتل کر دیا تو اس کا کفارہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا ہے۔ ۱۹ رسول اللہ ﷺ کا یہ فیصلہ تھا کہ اگر کوئی شخص اپنے غلام سے متعلق فرائض ادا کرنے میں کوتاہی کرے تو اس کی سزا یہ ہوگی کہ اس کا غلام آزاد کر دیا جائے گا۔ ۲۰ غلاموں کی آزادی کے لئے "تدبیر" اور "مکاتبت" کے قوانین عہد جاہلیت میں موجود تھے۔ اسلام نے نہ صرف ان کو باقی رکھا بلکہ اس ضمن میں انہیں احسان کی تلقین کی۔ یعنی قرآن مسلمانوں کو صرف یہی تاکید نہیں کرتا کہ غلاموں کی درخواست پر انہیں مکاتبت کر لینی چاہیے۔ ۲۱ بلکہ انہیں احسان کرنے کی بھی تاکید کرتا ہے کہ مال کتابت میں سے کچھ نہ کچھ معاف کر دیا کریں۔ چنانچہ متعدد روایات سے ثابت ہے کہ صحابہ کرامؓ اپنے مکاتبوں کو مال کتابت کا ایک معتد بہ حصہ معاف کر دیا کرتے تھے۔

اس ضمن میں کسی بھی قسم کے لیت و لعل کو ہمیشہ ناپسند کیا گیا بلکہ مسلمان خلفاء نے اس بارے میں بعض اوقات راست اقدامات کیے۔ مثلاً حضرت عمرؓ کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ابوسعید المقبری نے اپنے مالک سے مکاتب کی اور مدت مقررہ سے پہلے ہی مال کتابت فراہم کر کے مالک کے پاس لے گیا۔ مالک نے کہا میں تو وقت مقررہ سے قبل نہیں لوں گا۔ ابوسعید

نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ انہوں نے اپنے موالی یرفاء کو حکم دیا کہ مکاتبت کی رقم بیت المال میں جمع کر دے اور ابو سعید سے کہا کہ جا تو آزاد ہے، اب تیرا موالی (یعنی مالک) چاہے گا تو یہ مال ہم سے لے لے گا اور چاہے گا تو چھوڑ دے گا۔ ۴۲

دوسرا واقعہ بھی اسی نوعیت کا ہے جو زیادہ دلچسپ ہے۔ مشہور فقیہ اور محدث حضرت محمد ابن سیرین کے والد سیرین نے اپنے آقا حضرت انس بن مالک سے مکاتبت کی درخواست کی، انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ سیرین نے جا کر حضرت عمرؓ سے شکایت کر دی۔ حضرت عمرؓ نے حضرت انس پر درّہ اٹھایا اور فرمایا ''اللہ کا حکم ہے کہ مکاتبت کر لو۔'' ۴۳

قرآن مجید میں زکوۃ کے جو مصارف بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک گردنوں کو غلامی سے رہا کرانا بھی شامل ہے۔ ۴۴ چونکہ عموماً کسی غلام کو آزاد کرنے کی پوری قیمت یا اس کی آزادی کا زرِ فدیہ ادا کرنا ہر شخص برداشت نہیں کر سکتا اس لئے زکوۃ یا صدقہ اور فے کی مجموعی رقم سے اجتماعی طور پر اس فرض کو ادا کرنے کی صورت تجویز کی گئی ہے۔ ۴۵ زکوۃ کی اس رقم کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے مزید ہدایت کی کہ غلاموں کو زرِ کتابت ادا کرنے کے لئے قرض دیا جائے۔

اس کے علاوہ شارع اسلام نے لونڈیوں کی آزادی کی ایک راہ یہ نکالی کہ ''ام ولد'' ۴۶ کی بیع ناجائز قرار دے دی گئی۔ نہ تو اس کا آقا اسے بیچ سکتا ہے اور نہ کسی کو ہبہ کر سکتا ہے۔ آقا کے مرنے کے بعد ''ام ولد'' خود بخود آزاد ہو جائے گی۔ اس کے بطن سے پیدا ہونے والا اس کے آقا کا بچہ پیدائشی آزاد سمجھا جاتا تھا۔ مزید برآں وہ اپنے باپ کی جائیداد کا وارث بھی ہوتا تھا اور یہ ساری صورت حال عہد جاہلیت سے بالکل مختلف تھی۔

ام ولد کی بیع کو ناجائز قرار دینے کو مشہور مورخ ابن اثیر، حضرت عمرؓ کی اولیات میں شمار کرتے ہیں۔ ۴۷ تاہم واقعہ یہ ہے کہ یہ حکم عہد نبوی سے جاری تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی ملک یمین ماریہ قبطیہ ۴۸ سے ابراہیم تولد ہوئے تو آپؐ نے فرمایا ''لما ولدت ام ابراھیم، ابراھیم، اعتق ام ابراھیم ولدھا.'' ۴۹ [یعنی ابراہیم کی ماں

کو ان کے بیٹے ابراہیم نے آزاد کردیا۔]

محض حصول لذت کے لئے جاریہ سے جنسی تعلق کو پسند نہیں کیا گیا یہی وجہ ہے کہ جاریہ کے حق میں آقا کو "عزل" سے منع کیا گیا ہے۔

لونڈیوں سے تمتع کے بارے میں اسلام کو بڑی لعنت ملامت کی جاتی ہے اور اسے ایک طرح کی داشتہ بازی سمجھا جاتا رہا ہے۔ لہٰذا اس کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں شریعت کا فیصلہ یہ ہے کہ جنگ میں ہاتھ آنے والی عورتیں اسلامی حکومت کے حوالے ہوں گی۔ اس کے بعد حکومت کو اختیار ہوگا کہ:

(الف) یا تو انہیں احساناً یونہی چھوڑ دے، جیسا کہ زید بن حارثہ اور ان کی فوج کا حسمی کی جانب جمادی الآخر ۶ ھ میں جو سریہ ہوا تھا، اس میں سو عورتیں اور بچے گرفتار ہوئے تھے، رسول اللہ ﷺ نے بعد میں ان سب کو بغیر فدیہ لیے احساناً رہا کر دیا تھا۔ اسی طرح غزوۂ حنین میں بنو ہوازن کے چھ ہزار قیدیوں کو جن میں عورتوں اور بچوں کی بڑی تعداد تھی، بغیر فدیہ لیے رہا کر دیا۔ ۳۰ غزوۂ بنی مصطلق کے قیدیوں کو بھی آپؐ نے بغیر زرفدیہ لیے چھوڑ دیا تھا۔ ۳۱

(ب) یا انہیں زرفدیہ لے کر چھوڑ دے۔

(ج) یا ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے قبضے میں ہوں۔ جیسا کہ غزوۂ بنی فزارہ میں ہاتھ آنے والی ایک باندی کے عوض رسول اللہ ﷺ نے قریش مکہ سے اپنے چند قیدی رہا کروائے تھے۔

(د) اور خواہ انہیں اپنے سپاہیوں میں تقسیم کردے، جیسا کہ غزوۂ بنو قریظہ اور غزوۂ خیبر میں گرفتار کی جانے والی عورتیں اور بچے مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔

آخر الذکر صورت میں مسلمان سپاہی اس عورت سے تمتع کرسکتا ہے جو حکومت کی طرف سے باقاعدہ عطا کی گئی ہو (تاہم کسی دوسرے کو اسے ہاتھ لگانے کی قطعی اجازت نہیں) یہ نکاح جیسا ہی ایک قانونی فعل ہے۔ چنانچہ جس طرح کسی عورت کا ولی اس کا نکاح کر دینے

کے بعد اسے شوہر سے واپس لینے کا حقدار نہیں رہتا، بالکل اسی طرح اسیران جنگ میں سے کسی عورت کو کسی مسلمان کی ملکیت میں دینے کے بعد پھر حکومت اسے واپس لینے کی مجاز نہیں ہوتی۔ اس عورت کے ساتھ آقا اس وقت تک جسمانی تعلق قائم نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ ایک مرتبہ حیض سے پاک نہ ہوجائے ۳۲؎ اور یہ اطمینان نہ ہوجائے کہ وہ حاملہ نہیں ہے، اگر حاملہ ہے تو وضع حمل سے قبل اس سے خلوت کرنا ناجائز ہے۔ اسے از روئے شرع اِستبراء کہا جاتا ہے۔ اس وجوب کی بناء رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد پر ہے جو آپؐ نے غزوہ حنین کے فوراً بعد بمقام اوطاس، اسیرانِ جنگ کے متعلق جن میں عورتیں بھی شامل تھیں، فرمایا تھا کہ حبالی (حاملہ) سے وضع حمل اور حیالی (غیر حاملہ) سے اِستبراء سے پہلے مقاربت نہ کی جائے۔ اس حکم کی حکمت یہ تھی کہ اولاد کا نسب مختلط نہ ہونے پائے۔ ۳۳؎

اگر کوئی آقا اپنی باندی کسی دوسرے کے نکاح میں دے دے تو پھر مالک کو اس سے دیگر خدمات لینے کا حق تو باقی رہتا ہے لیکن جنسی تعلق کا حق باقی نہیں رہتا۔ قرآن کا منشا تو یہ رہا ہے کہ آقا خود ہی اپنی باندی کو اچھی تعلیم و تربیت دے کر آزاد کر کے اس سے خود ہی نکاح کرلے۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ابو موسیٰ اشعری کی روایت سے یہ حدیث درج ہے کہ "من كانت له جارية فعالها فاحسن اليها ثم اعتقها و تزوجها كان له اجران." ۳۴؎

[جس کے پاس لونڈی ہو اور وہ اس کی اچھی پرورش کرے پھر اس کو آزاد کرے اور اس سے نکاح کرے تو اس کے لئے دوہرا ثواب ہے۔]

قیدی عورتوں کی حفاظت اور معاشرے میں ان کی وقعت کو قائم رکھنے کے لئے اس سے بہتر صورت ان حالات میں ممکن بھی نہیں تھی۔

مندرجہ بالا طریقوں کے علاوہ غلاموں کی حریت و آزادی کے چند اور راستے نکالے گئے۔ مثلاً اگر ایک غلام میں کئی افراد شریک ہیں۔ ان میں سے ایک شریک اپنا حصہ آزاد کردے تو پورا غلام آزاد ہوگا بشرطیکہ آزاد کرنے والا دوسرے شرکاء کو بھی ان کا حصہ ادا

کرے اور اگر وہ اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو غلام کو سعی وکسب کی اجازت دی جائے گی تا کہ وہ خود اپنی قیمت کے بقدر ادا کر کے آزادی حاصل کر لے۔ ۳۵ع

اسی طرح دارالکفر سے نکل کر دارالاسلام میں داخل ہونے والا غلام آزاد تصور کیا جائے گا اور اسلامی حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ اس فیصلے کو نافذ کرے۔ غزوۂ حدیبیہ میں صلح سے پہلے مکہ کے کچھ غلام بھاگ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس چلے آئے، ان کے مالکوں نے آپ کو لکھا کہ بخدا یہ لوگ آپ کے دین کی طرف رغبت رکھنے کی وجہ سے نہیں بھاگے بلکہ غلامی کی پابندیوں سے بھاگے ہیں۔ کچھ صحابہؓ نے آپ کو مشورہ دیا کہ ان غلاموں کو واپس کر دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ یہ مشورہ سن کر ناراض ہوئے اور آپؐ نے ان غلاموں کو واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ ۳۶ع جب یہ غلام مدینے کے شہری بنے تو آزاد تھے۔

اسی طرح محاصرہ طائف کے دوران (۸ھ) اہل طائف کے چند غلام رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا۔ بعد میں جب اہل طائف بھی مسلمان ہوگئے اور انہوں نے اپنے غلاموں کے بارے میں بات کی تو آپؐ نے فرمایا: ''یہ لوگ خدا کے آزاد کیے ہوئے ہیں۔'' ۳۷ع

ہمیں اسلام میں حصول آزادی کے طریقوں کو اور زیادہ وسعت دینے کا رجحان نظر آتا ہے کم کرنے کا نہیں، مثلاً ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کسی شخص کے قبضے میں ایک عاقل، بالغ نوجوان لڑکا ہو اور وہ دعویٰ کرے کہ یہ لڑکا میرا غلام ہے اور لڑکا اس کی تکذیب کرے اور قسم کھائے تو اس صورت میں وہ لڑکا آزاد سمجھا جائے گا۔ ۳۸ع فقہا کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اگر دو اشخاص کو جن میں سے ایک مسلمان ہو اور دوسرا کافر، ایک لاوارث بچہ ملے، اس بچے کے بارے میں مسلمان کا دعویٰ ہو کہ وہ اس کا غلام ہے اور کافر کا دعویٰ ہو کہ وہ بچہ اس کا بیٹا ہے تو اس صورت میں فیصلہ کافر کے حق میں ہوگا تا کہ بچہ آزاد رہے۔

غلاموں کو آزاد کرنے کے اس وسیع عملی پروگرام کے تحت سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں

غلام آزاد ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے تریسٹھ غلام آزاد کیے۔ تمام مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو آپؐ نے نہ کوئی لونڈی چھوڑی اور نہ غلام۔ ۳۹ آپؐ ملنے والے سارے غلام اور لونڈی اپنی زندگی میں ہی آزاد کر چکے تھے۔ اس سلسلے میں اگر کچھ اختلاف ہے تو وہ بنو قریظہ کی ریحانہ کے بارے میں ہے۔ طبری انہیں رسول اللہ ﷺ کی سریہ قرار دیتے ہیں۔ طبری کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ریحانہ پر اسلام پیش کیا اور ان کو اپنی منکوحہ بنانا چاہا لیکن انہوں نے یہودیت پر اصرار کیا اور کہا کہ مجھے اپنی ملک میں ہی رہنے دیں، اس سے ہم دونوں پر ہی ذمہ داری کم ہوگی۔ تاہم بعد میں ریحانہ اسلام لے آئی تھیں۔ ۴۰ طبری یہ وضاحت نہیں کرتے کہ اسلام لانے کے بعد آیا رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح کر لیا تھا یا وہ آپؐ کی ملک یمین تھیں۔ تاہم ابن عبدالبر نے صراحتاً لکھا ہے کہ ریحانہ سریہ تھیں تاہم ان کا انتقال رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا جبکہ آپؐ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع سے واپس لوٹنے تھے۔ ۴۱ اس طرح یہ بیان درست ٹھہرتا ہے کہ آپ کا انتقال ہوا تو آپؐ نے نہ کوئی لونڈی چھوڑی نہ غلام۔

حضرت عائشہؓ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد ۶۷ تھی۔ ان میں سے چالیس غلام تو آپؓ نے صرف اسی کفارے میں آزاد کیے کہ انہوں نے اپنے بھانجے عبداللہ بن زبیر سے ناراض ہو کر کبھی نہ بولنے کی قسم کھائی تھی۔ جب عبداللہ بن زبیر نے دوسرے صحابہ سے سفارش کرائی تو انہوں نے اس قسم کو توڑ دیا تھا اور کفارے میں چالیس غلام آزاد کیے۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب نے اپنی زندگی میں ستر (۷۰) غلاموں کو آزاد کیا۔ ۴۲ حکیم بن حزام نے جاہلیت میں سو غلام آزاد کیے تھے اور سو اونٹ سواری کے لئے دیے تھے۔ جب اسلام لائے تب بھی سو غلام آزاد کیے اور سو اونٹ سواری کے لئے دیے۔ ۴۳ ذوالکلاع حمیری نے آٹھ ہزار غلام آزاد کیے۔ ان میں سے چار ہزار غلام انہوں نے صرف اس دن آزاد کیے جس دن وہ اسلام لائے۔ ۴۴ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ نے ایک ہزار غلام آزاد کیے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف بڑے صاحب حیثیت اور خوشحال صحابی تھے۔ انہوں نے تیس ہزار غلاموں کو رہائی بخشی۔

انہوں نے صرف ایک دن میں تیس غلام آزاد کیے۔ ۴۵؎ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے صرف مکی زندگی کے دوران سات غلاموں اور باندیوں کو کفار مکہ سے منہ مانگے داموں خرید کر آزاد کیا۔ ۴۶؎ حضرت عثمانؓ بن عفان نے اسلام لانے کے بعد ہمیشہ ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد کیا، اور اگر کسی جمعہ آپ ایسا نہ کر پاتے تو دوسرے جمعہ کو دو غلام آزاد کرتے۔ نیز صرف دوران محاصرہ آپ نے بیس غلام آزاد کیے۔ یہی نہیں بلکہ دوران محاصرہ آپؓ نے اپنے غلاموں سے کہا کہ اس وقت جو ہتھیار رکھ دے گا وہ آزاد ہے۔ ۴۷؎

الغرض محدثین نے اندازہ لگایا ہے کہ صحابہؓ نے انتالیس ہزار دو سو انسٹھ (۳۹۲۵۹) غلام آزاد کیے۔ یہ اعداد و شمار یہ بتانے کے لئے بھی کافی ہیں کہ عہد جاہلیت میں غلامی کس قدر راسخ تھی اور شاید ہی کوئی گھرانہ رہا ہو جس کے پاس غلام یا غلاموں کی ایک معتدبہ تعداد موجود نہ ہو۔

آزاد ہو جانے والے غلام ''موالی'' کہلائے۔ اسلام نے ان کو سماج میں جو مقام دیا اس پر آگے بحث آئے گی تاہم ابھی یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ وہ افراد جو اسلامی تعلیمات کے باوجود غلام رہ گئے، ان کے مسئلے کو اسلام نے انسانی بنیادوں پر کس طرح حل کیا اور انہیں کیا حقوق عطا کیے۔

یاد رہے کہ جنگ ''سبب'' تھا اور غلامی اس کا ''نتیجہ''۔ جب تک سبب موجود رہے گا نتیجہ نکلتا رہے گا۔ غلامی کو ختم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ سبب (یعنی جنگ) کو ختم کیا جاتا جو عملاً ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام شراب اور جوے کی طرح حکماً غلامی کا خاتمہ نہیں کر سکا لیکن غلامی میں جو ذلت اور برائی تھی اسے یقیناً ختم کرنے کی کوشش کی اور غلاموں کو سماج میں وہ مرتبہ دیا اور قانونی طور پر وہ حقوق عطا کیے جس کی وجہ سے ''غلامی'' کی نوعیت یکسر بدل گئی۔

اسلام غلامی کو محض ایک اتفاقی حادثہ سمجھتا ہے۔ فطرت کا مستقل انتظام نہیں سمجھتا۔ اسلام نے حریت کا جو تصور پیش کیا ہے، اس کے مطابق آزادی کو انسان کا مقدس فطری حق تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کو غلاموں سے احسان کا معاملہ کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ ۴۸؎ ایک انسان ہونے کے ناتے ان کے قانونی حقوق واضح کرتا ہے۔ غلام کو قتل کرنے والے۔ اس

کا مال چرانے والے اور ان کی عورتوں کی آبروریزی کرنے والے کی وہی سزا رکھی جو آزاد لوگوں کے ساتھ ان جرائم کے ارتکاب پر مقرر ہے۔ قرآن کا فیصلہ ہے: الحر بالحر والعبد بالعبد والانثیٰ بالانثیٰ (البقرہ) یعنی جو قاتل ہو قصاص اسی سے لیا جائے آزاد نے قتل کیا تو اس کے بدلے میں اسی آزاد کو پکڑا جائے۔ غلام نے قتل کیا ہو تو اسی غلام سے قصاص لیا جائے۔ زمانہ جاہلیت میں یہ ہوتا تھا کہ اگر ایک اعلیٰ قبیلے کے آزاد شخص نے ایک ادنیٰ قبیلے کے غلام کو قتل کر دیا تو اس غلام کے قتل کے بدلے میں اس آزاد کو جو کہ اصل قاتل تھا، نہ پکڑا جاتا بلکہ اس کی جگہ اس قبیلے کے کسی غلام کو پکڑ کر قتل کر دیا جاتا۔ اس کے برعکس اگر کمزور قبیلے کا غلام، اعلیٰ قبیلے کے آزاد شخص کو قتل کر دیتا تو اعلیٰ قبیلے والے اپنے مقتول کے بدلے میں ادنیٰ قبیلے کے اس غلام پر، جو قاتل ہوتا، اکتفا نہ کرتے بلکہ اس قبیلے کے آزاد شخصوں کو قصاص میں قتل کر دیتے لیکن اسلام نے گویا یہ طے کیا کہ غلاموں کا قصاص بھی احرار کی طرح لیا جائے۔

اسی طرح غلاموں کی شہادت کو معتبر مانا ہے (تاہم بوجوہ ان کے اصول قبول شہادت قدرے سخت ہیں) اور ان کی دی گئی پناہ کا بھی انعقاد کرایا ہے۔ مدینہ کے دستور حکومت میں یہ واضح کر دیا گیا کہ "اللہ کا ذمہ واحد اور ناقابل تقسیم ہے۔ اور اگر (مومنین میں سے) کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ شخص بھی کسی کو پناہ دیتا ہے تو اس کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔"[۴۹] یہ صرف معاہدہ میں لکھا ہوا ایک فیصلہ ہی نہیں تھا بلکہ ۱۷ھ میں اس کی نظیر بھی سامنے آئی اور ایرانی شہر جندی شاپور کی ایک جنگ ایک غلام مکنف کی دی گئی پناہ پر مصالحت میں بدل دی گئی۔[۵۰]

اسلام املاک پر غلاموں کے مالکانہ حقوق کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ غلاموں اور لونڈیوں کو شادی بیاہ کا بھی حق دیتا ہے، یہی نہیں بلکہ غلام مرد آزاد عورت سے بھی شادی کر سکتا ہے، اسی طرح آزاد مرد لونڈیوں سے نکاح کر سکتا ہے، بلکہ جیسا کہ پہلے بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ آقا کے لئے یہ بہت بڑی نیکی قرار دی گئی ہے کہ وہ اپنی باندیوں کی تعلیم و تربیت کرے، اچھا ادب سکھائے پھر انہیں آزاد کر کے ان سے نکاح کر لے۔ اسلام باندیوں کو یہ تحفظ عطا کرتا ہے کہ کوئی آقا اپنی باندیوں سے پیشہ (کسب) نہیں کرا سکتا۔ قرآن میں واضح ارشاد موجود ہے:

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْ ۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ". (النور:۳۳)

[اور اپنی لونڈیوں کو اپنے دنیوی فائدوں کی خاطر قحبہ گری پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ خود پاکدامن رہنا چاہتی ہوں اور جو کوئی ان کو مجبور کرے تو اس جبر کے بعد اللہ ان کے لئے غفور ہے رحیم ہے۔]

عربوں میں اپنی لونڈیوں سے پیشہ کرانے کے دو طریقے تھے۔ ایک تو یہ کہ آقا اپنی جوان لونڈیوں پر ایک بھاری رقم عائد کر دیتے کہ ہر مہینے اتنا کما کر ہمیں دیا کرو۔ اس بھاری مطالبے کو وہ قحبہ گری کر کے ہی پورا کر سکتی تھیں۔ جیسا کہ سُمیّہ، حارث بن کلدہ کو ٹیکس ادا کرنے کے لئے قحبہ گری کرتی تھی۔ ۵۱ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ لوگ اپنی جوان اور خوبصورت لونڈیوں کو کوٹھوں پر بٹھا دیتے، ان کے دروازوں پر جھنڈے لگا دیتے، جنہیں دیکھ کر دور ہی سے معلوم ہو جاتا کہ ضرورت مند شخص یہاں سے اپنی خواہشِ نفس پوری کر سکتا ہے۔ یہ عورتیں "قلیقیات" کہلاتی تھیں اور ان کے گھر "مواخیر" کے نام سے مشہور تھے۔ حجاز کے بڑے بڑے رئیسوں نے اس طرح کے چکلے کھول رکھے تھے۔ مکہ میں عبداللہ بن جدعان کا پیشہ بھی یہی تھا کہ وہ اپنی لونڈیوں سے پیشہ کراتا اور ان کے بچے فروخت کر دیتا۔ ۵۲

مدینے میں عبداللہ بن ابی سلول اسی ناجائز طریقے سے اپنی لونڈیوں کو روپیہ کمانے پر آمادہ کرتا تھا لیکن اس کی دو لونڈیوں نے اس ننگ و عار کو گوارا نہ کیا اور رسول اللہ ﷺ سے شکایت کر دی۔ اس پر یہ قرآنی آیت (النور:۳۳) نازل ہوئی ۵۳ اور اس قحبہ گری کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔

اسلام حُر کی طرح غلام کو بھی حریتِ فکر و قول کی دولت عطا کرتا ہے چنانچہ غلام اپنے آقا کو نصیحت کر سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسلام غلاموں کو سرداری کے درجے تک پہنچا دیتا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے: ۹

ان امر علیکم عبد مجدع (حسبتها قالت اسود) یقود کم بکتاب اللہ تعالیٰ فاسمعوا الہ و اطیعوا. ۵۴

[سنو اور اپنے امراء کی اطاعت کرو، خواہ تمہارا سردار کسی نکٹے (چپٹے حبشی) غلام کو بنا دیا جائے۔ اس کی اطاعت کرو جب تک کہ وہ تمہارے درمیان خدا کے احکام کا نفاذ کرے۔]

ان سب حقوق و مراعات کے علاوہ حسن معاشرت و حسن معاملات بھی غلاموں کا حق ہے جو اسلام انہیں عطا کرتا ہے۔ چنانچہ شارح اسلام کا یہ فیصلہ ہے کہ غلاموں پر تہمت تراشی نہ کی جائے ۵۵ اور نہ انہیں مارا پیٹا جائے ۵۶ اور نہ لعنت ملامت کی جائے۔ ۵۷ ان سے ایسے سخت کام نہ لیے جائیں جو اُن کی ہمت سے باہر ہوں۔ وہ بیمار ہو جائیں تو ان کی عیادت کی جائے۔ وہ دعوت دیں تو اس کو قبول کیا جائے۔ کھانے پینے میں انہیں شریک کیا جائے۔ انہیں غلام یا لونڈی نہ کہا جائے بلکہ میرا بیٹا (فتای) یا میری بیٹی (فتاتی) کہہ کر پکارا جائے۔ ۵۸ اپنے غلام کو ویسا ہی کھلایا اور پہنایا جائے جیسا مالک کھاتا اور پہنتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

ان اخوانکم خولکم جعلهم اللہ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعم مما یاکل ولیلبسہ مما یلبس ولا تکلفوهم ما یغلبهم فان کلفتموهم مایغلبهم فاعینوهم. ۵۹

[تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں لہٰذا تم میں سے جس کے قبضے میں اس کا کوئی بھائی ہو، اسے چاہیے کہ وہ اس کو ویسا ہی کھلائے اور پہنائے جیسا وہ خود کھاتا اور پہنتا ہے اور ان کو کوئی ایسا کام کرنے کو نہ کہے جس کی وہ استطاعت نہ رکھتے ہوں اور اگر کبھی انہیں ایسا کام کرنے کو کہے تو خود بھی ان کا ہاتھ بٹائے۔]

اس دنیا سے جاتے جاتے بھی رسول اللہ ﷺ غلاموں کے لیے متفکر رہے۔ چنانچہ آپؐ کے آخری الفاظ جو بعض تاریخی کتب میں مذکور ہیں، یہ ہیں۔ "الصلوۃ ...... وما ملکت ایمانکم." ۶۰

یہ اسی تعلیم کا اعجاز تھا کہ غلامی کی، صدر اول میں نوعیت ہی بدل گئی تھی۔ بدر کی جنگ میں ستر کفار قید ہوئے۔ جنہیں فدیہ کی ادائیگی تک مسلمان مجاہدین میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ جب مسلمان ان اسیرانِ جنگ کو لے کر روانہ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے تاکید کی "دیکھو ان سے اچھا برتاؤ کرنا۔" ابن عمیر (جن کے ہاتھ میں جنگ بدر میں مشرکین کا جھنڈا تھا) ان کا بیان ہے کہ "میں انصار کے ایک قافلے میں اسیری کی حالت میں روانہ ہوا۔ اس قافلے کے لوگ کھانے کے وقت مجھے اپنی روٹیاں کھلا دیتے اور خود کھجوروں پر گذارہ کرلیتے تھے۔" ۶۱

رسول اللہ ﷺ اس چیز کو بھی سخت ناپسند کرتے تھے کہ غلامی کی وجہ سے خاندان تقسیم ہوجائیں۔ خصوصاً ماں اور بچے کے درمیان جدائی برداشت نہیں کرتے تھے۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ ام ضمیرہ کے پاس سے گزرے تو وہ رو رہی تھی۔ آپؐ نے سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ میرے اور میرے بیٹے (ضمیرہ) کے درمیان جدائی ڈال دی گئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا "ماں اور بچے کے درمیان تفریق نہ کی جائے۔" پھر آپؐ نے اس آدمی کے پاس پیغام بھیجا جس کے پاس ضمیرہ غلام تھے اور اس کو بلا کر ایک اونٹ کے بدلے میں ضمیرہ کو خرید کر آزاد کردیا۔ ۶۲

رسول اللہ ﷺ کا رویہ اپنے غلاموں کے ساتھ اس درجہ مثالی تھا کہ آزادی کا موقع ملنے کے باوجود غلام آزاد ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کی ایک مثال زید بن حارثہ کی ہے۔ تاریخ کا یہ بڑا مشہور واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں، ان کے والد کی درخواست پر بغیر فدیہ کے آزاد کردیا تھا۔ بشرطیکہ زید اپنے والد کے ساتھ جانے پر آمادہ ہوں۔ مگر زید نے اپنے والد کے ساتھ مردِ آزاد کے طور پر جانے سے انکار کردیا اور رسول اللہ ﷺ کی غلامی میں رہنے کو ترجیح دی۔ ۶۳ اس پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں آزادی عطا کی اور اپنا متبنیٰ بنالیا۔

دوسری مثال ثوبان بن بجدد ۶۴ کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں آزاد کرتے ہوئے یہ اختیار دیا تھا کہ اگر وہ اپنی قوم میں واپس جانا چاہیں تو چلے جائیں اور اگر چاہیں تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہیں۔ ثوبان نے آخر الذکر بات کو ترجیح دی اور آزاد ہوجانے کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی خدمت کرتے رہے اور سفر اور حضر میں کبھی آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

یہ بات صرف رسول اللہ ﷺ تک محدود نہ تھی بلکہ آپ ؐ کے صحابہ کرام ؓ کا عمومی برتاؤ اپنے غلاموں کے ساتھ اس قدر مثالی تھا کہ غلام بھی اپنے آقاؤں پر جان دیتے تھے۔

افلح نامی غلام حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا غلام تھا، پہلے انہوں نے اسے مکاتب بنا کر آزاد کر دینے پر آمادگی کا اظہار کیا مگر بعد میں معاہدہ کتابت فسخ کرنا چاہا، گو کہ ابو ایوب انصاریؓ ایسا کر نہیں سکتے تھے۔ افلح کے اہل و عیال نے بھی افلح کو یہ فسخ نہ ماننے کی تلقین کی لیکن افلح نے بخوشی اس معاہدے کو فسخ کر دیا اور کہا میں ان کی کسی بات کا انکار نہیں کر سکتا۔ تاہم اس کے چند دن بعد ہی ابو ایوب انصاریؓ نے اسے کلیتہً آزاد کر دیا اور کہا کہ جو مال تمہارے پاس ہے وہ کل تمہارا ہے۔ ۶۵

صحابۂ کرام ؓ اپنے غلاموں کے ساتھ حیرت انگیز مساویانہ برتاؤ کرتے تھے اور یہ محض کہنے کی بات نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انہیں وہی پہناتے تھے جو خود پہنتے تھے اور وہی کھلاتے تھے جو خود کھاتے تھے۔ ایک موقع پر حضرت علیؓ نے گاڑھے کی دو قمیص خریدیں اور اپنے غلام سے کہا جو تمہیں پسند ہے وہ لے لو، غلام نے جو قمیص چھوڑ دیا وہ خود اپنے استعمال کے لئے رکھ لیا۔ ۶۶

فی الواقع یہ ایک بہت بڑا معاشرتی انقلاب تھا، جو غلاموں کے معاملہ میں بپا کیا گیا، یہ صرف کتابی باتیں نہیں تھیں، محض اصول نہیں تھے، بلکہ عملی اقدامات بھی تھے۔ عربوں کے اعتبار سے یہ ایک انقلابی تبدیلی تھی چنانچہ بعض اوقات مسلمانوں سے جاہلانہ طرز عمل کا مظاہرہ بھی ہو جاتا تھا جس پر رسول اللہ ﷺ فوری گرفت کرتے تھے مثلاً، ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ابو مسعود انصاری کو اپنے غلام کو کوڑے مارتے دیکھا تو انہیں سخت تنبیہ کرتے ہوئے کہا "خدا اس سے زیادہ تم پر قدرت رکھتا ہے جتنا تم اس غلام پر رکھتے ہو۔" ۶۷ اس پر نادم ہو کر ابو مسعود نے اسی وقت اپنے غلام کو آزاد کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ غلاموں کے حق میں مبشر تھے۔ آپ ؐ نے غلاموں کو بشارت دی۔

العبد اذا نصح سیدہ و احسن عبادۃ ربہ کان لہ اجرہ مرتین۔ ۶۸

[جب غلام اپنے آقا کی خیر خواہی کرے اور اللہ تعالیٰ کی اچھی طرح عبادت

کرے تو اس کو دو گنا اجر ملے گا۔]

آپ کی یہ بشارت بہت سے غلاموں کے لئے وجہ تسکین تھی بلکہ حضرت ابو ہریرہؓ نے اس حدیث کو سن کر کہا "قسم اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں ابو ہریرہ کی جان ہے، اگر جہاد فی سبیل اللہ، حج اور ماں کے ساتھ نیک سلوک کی عبادات نہ ہوتیں تو میں یہ پسند کرتا کہ مجھے غلامی کی حالت میں موت آئے۔" ۶۹

الغرض دورِ رسالتؐ میں غلاموں کی حیثیت میں واقعتاً بڑا تغیر آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلام محض جنسِ تجارت نہ رہا، بلکہ پہلی بار انسانیت کے تمام تر حقوق و احترام سے بہرہ ور ہوا۔ یہ محض اسلام کے خوش آئند اعلانات ہی نہیں تھے بلکہ اس کی عملی مثالیں ہر دور میں بکثرت مل جاتی ہیں۔ لہٰذا بعض یورپی مورخین کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ ڈاکٹر گستاؤلیبان کا کہنا ہے:

"مسلمانوں میں غلامی کی حالت اُس سے بالکل علیحدہ ہے جو عیسائیوں میں تھی۔ مشرق میں غلاموں کی حالت، یورپ کے خانگی ملازموں سے بھی بہتر ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے مالک کے خاندان کا جز سمجھے جاتے ہیں اور کبھی کبھی اپنے مالک کی بیٹی سے شادی بھی کر سکتے ہیں اور اعلیٰ درجے تک پہنچ سکتے ہیں۔ مشرق میں لفظ غلام کے ساتھ کسی قسم کا خیالِ حقارت شامل نہیں ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ بمقابل یورپ کے ملازمین کے، مشرق کا غلام بہت زیادہ اپنے مالک کا ہم پلہ ہے۔" ۷۰

موسیو گستاؤلیبان عرب مسلمانوں کے جذبۂ مساوات کا اعتراف کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

"مسلمان غلام بغیر کسی دقت کے اپنے آقا کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے اور ایسے پرانے خانگی ملازموں کی جو اعلیٰ مراتب تک پہنچتے ہیں، ایک بہت ہی کثیر تعداد ممالک اسلامیہ میں پائی جاتی ہے۔" ۷۱



حوالہ جات:

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: اسلام میں غلامی کا تصور، از نگار سجاد ظہیر (قرطاس، کراچی ۲۰۱۶ء) ص ۱۳۔۵۳۔

۲۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری (م ۲۵۶ھ)، صحیح بخاری، (دارالکتب العلمیہ، بیروت) جلد ۱، ص ۷۸۳۔

۳۔ البقرہ: ۲۱۹، المائدہ: ۹۰۔

۴۔ توبہ: ۶۰۔

۵۔ قتلِ اولاد کی ممانعت بنی اسرائیل: ۳۱، کے علاوہ الانعام: ۱۴۰، اور الممتحنہ: ۱۲، میں بھی وارد ہوئی ہے۔

۶۔ ابوموسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "فکوا العانی یعنی الاسیر و اطعموا الجائع و عودوا المریض" یعنی قیدی کو رہائی دو، بھوکے کو کھانا کھلاؤ اور بیمار کی عیادت کرو۔ صحیح بخاری، جلد ۲، ص ۳۰ (کتاب الجہاد والسیر)۔

۷۔ حضرت جویریہؓ کا اصلی نام برہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے جویریہ رکھا۔ غزوۂ بنی مصطلق کی اسیرانِ جنگ میں تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے آزاد کر کے نکاح کیا۔ ان کے پہلے شوہر مسافع بن صفوان المصطلقی تھے۔ حضرت جویریہؓ نے ستر برس کی عمر میں ۵۶ھ میں وفات پائی۔ والی مدینہ مروان بن حکم نے نماز جنازہ پڑھائی۔

۸۔ ابن هشام، جلد ۳، ص ۲۹۵، الطبقات الکبریٰ، جلد ۲، ص ۶۳، تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۱۶۵ نیز جلد ۲، ص ۶۱۰، سیر اعلام النبلاء، جلد ۲، ص ۱۸۸، (مادہ جویریہ)۔ صفة الصفوه، جلد ۲، ص ۲۶، الاستیعاب، جلد ۴، ص ۱۸۰۵۔

۹۔ الطبقات الکبریٰ، جلد ۲، ص ۱۳۷، ابوعبید القاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ)، کتاب الاموال، (مکتبہ الکلیات الازہریہ، قاہرہ، ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء) ص ۱۰۹-۱۱۰۔

۱۰۔ بخاری، جلد ۳، ص ۱۲۲ (کتاب الرحمٰن)، الطبقات الکبریٰ، جلد ۱، ص ۱۱۵، نیز جلد ۲، ص ۱۵۲، تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۸۷-۸۸، کتاب الاموال، ص ۱۱۹۔

۱۱۔ صحیح مسلم، جلد ۳، ص ۱۳۷۵-۶، (کتاب الجہاد)، سنن ابی داؤد، جلد ۲، ص ۳۶۴،

کتاب الاموال، ص ۱۳۱۔

۱۲ ابن ھشام، جلد۲، ص ۳۰۵۔

۱۳ صحیح بخاری، جلد ۳، ص ۱۱۷، (کتاب الرھن)، صحیح مسلم، جلد ۲، ص ۱۱۴۷ (کتاب العتق) نیز امام ابو عبدالرحمن احمد بن شعیب النسائی، السنن الکبریٰ، (دار الکتب العلمیہ، بیروت، طبع اول، ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء) جلد ۳، ص ۱۶۸، (غلاموں کو بند غلامی سے آزاد کرانے کو ایک افضل فعل قرار دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں صحاح ستہ میں بہت سے احادیث ملتی ہیں، یہاں سب کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ تفصیل کے لئے صحاح ستہ میں کتاب العتق دیکھی جا سکتی ہے۔)۔

۱۴ صحیح مسلم، جلد۲، ص ۱۱۴۸ (کتاب العتق) نیز صحیح بخاری، جلد ۳، ص ۱۱۷۔

۱۵ صحیح بخاری، جلد ۳، ص ۱۱۷۔ ۱۶ المائدہ: ۸۹۔

۱۷ المجادلہ: ۳، سنن ابو داؤد، جلد۲، ص ۱۸۳، ۱۸۵۔

۱۸ النساء: ۹۲۔ ۱۹ ایضاً۔

۲۰ صحیح مسلم، جلد ۳، ص ۱۲۷۸ (کتاب الایمان)۔

۲۱ النور: ۳۳۔

۲۲ الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۸۵۔ (یہی واقعہ موطا میں مروان بن حکم کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔ فرافصہ بن عمیر کا ایک مکاتب تھا جو مدت پوری ہونے سے پہلے سارا بدلِ کتابت لے آیا۔ فرافصہ نے وہ لینے سے انکار کر دیا۔ مکاتب مروان کے پاس گیا جو حاکم مدینہ تھا، مروان نے فرافصہ کو مجبور کیا کہ وہ بدلِ کتابت وقت سے پہلے لے لے۔ فرافصہ نے انکار کیا۔ مروان نے حکم دیا کہ مکاتب سے وہ مال لے کر بیت المال میں رکھ دیا جائے اور مکاتب سے کہا کہ جا تو آزاد ہو گیا ہے۔ جب فرافصہ نے یہ حال دیکھا تو مال لے لیا۔ امام مالک (م ۱۷۹ھ) موطا امام مالک، ص ۴۵۶، اسلامی اکادمی، لاہور، ۱۴۰۲ھ)۔

۲۳ مودودی، سیّد ابوالاعلیٰ، (م ۱۹۷۹ء)، تفہیم القرآن، (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۹۴ء)، جلد ۳، ص ۳۰۰۔

۲۴ التوبہ: ۶۰۔ (ابن عباس سے منقول ہے کہ آپؐ نے زکوٰۃ کے مال سے غلام آزاد کیے۔

صحیح بخاری، جلد۲، ص ۱۲۸ (کتاب الزکوۃ)؛ کتاب الاموال، ص ۵۳۸۔

۲۵ حضرت سلمان فارسیؓ کا زرِ کتابت اسی طرح کی اجتماعی کوششوں سے ادا کیا گیا تھا۔ حضرت سلمان فارسی کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ یہ اصفہان کے ایک گاؤں کے باشندے تھے، کسی طرح بنوکلب کے ہاتھوں اسیر ہو گئے۔ بعد ازاں کسی یہودی نے آپ کو خرید لیا۔ جب سلمان فارسی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں ہدایت کی کہ اپنے آقا سے مکاتبت کرلیں۔ یہودی آقا نے تین سو پھل دینے والی کھجور کی قلموں اور چالیس اوقیہ (ڈیڑھ سیر سے زائد) سونے پر مکاتبت کرلی۔ قلمیں تو رسول اللہ ﷺ کے اصحابؓ نے دو دو چار چار کر کے جمع کردیں اور سونا رسول اللہ ﷺ نے فے یا صدقے میں سے ادا کردیا اور حضرت سلمان فارسی آزاد ہو گئے۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد۱، ص ۱۸۵، و جلد۴، ص ۸۰)

۲۶ اصطلاح شرعی میں "ام ولد" اس جاریہ کو کہتے ہیں جس کے بطن سے اس کے آقا کی اولاد ہو جائے۔ واضح رہے کہ "ام ولد" کی اصطلاح قرآن میں موجود نہیں۔

۲۷ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، (دار صادر، بیروت، ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء) جلد۳، ص ۵۹۔

۲۸ صلح حدیبیہ کے بعد ۶ھ میں جب رسول اللہ ﷺ نے حاطب بن ابی بلتعہ کو مقوقس، قبطی والی اسکندریہ کے پاس دعوت اسلام کا خط دے کر بھیجا تو وہ اسلام تو نہ لایا مگر خیر سگالی کے جذبات کے اظہار کے طور پر دو حسین و جمیل قبطی بہنوں ماریہ اور سیرین، ایک خصی غلام اور سفید خچر بنام دلدل تحفۃً رسول اللہ ﷺ کو بھیجا، ان دونوں بہنوں کو رسول اللہ ﷺ نے ام سلیم بنت ملحان کے یہاں ٹھہرایا اور ان پر اسلام پیش کیا۔ دونوں اسلام لے آئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے سیرین کو حسان بن ثابت کو بخش دیا جن سے عبدالرحمٰن بن حسان پیدا ہوئے اور ماریہ کو اپنے پاس ملک یمین کے طور پر رکھا۔ ماریہ سے رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ابراہیم پیدا ہوئے جو کم سنی میں ہی فوت ہو گئے۔ ان کا گھر تمام ازواج مطہرات سے الگ مدینہ کے مضافات میں تھا اور رسول اللہ ﷺ ان کے پاس وہیں جایا کرتے تھے۔ ماریہ کا انتقال حضرت عمرؓ کی خلافت میں محرم ۱۶ھ میں ہوا۔ حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور انہیں بقیع میں دفن کیا گیا۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد۱، ص ۱۳۴۔ الاستیعاب، جلد۴، ص ۱۹۱۳)۔

۲۹ الطبقات الکبریٰ، جلد۱، ص ۱۳۶۔ الاستیعاب، جلد۴، ص ۱۹۱۳۔

۳۰۔ صحیح بخاری، جلد ۳، ص ۱۴۲۔ الطبقات الکبریٰ، جلد ۱، ص ۱۱۵، نیز جلد ۲، ص ۱۵۲۔ تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۸۷۔

۳۱۔ الطبقات الکبریٰ، جلد ۲، ص ۶۳۔ تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۱۶۵، نیز جلد ۲، ص ۶۱۰۔ سیر اعلام النبلاء، جلد ۲، ص ۱۸۸۔ صفۃ الصفوۃ، جلد ۲، ص ۲۶۔ الاستیعاب، جلد ۴، ص ۱۸۰۵۔

۳۲۔ اس کی مثال حضرت صفیہ بنت حُیَّ بن اخطب کی ہے جو جنگ خیبر میں رسول اللہ ﷺ کے حصے میں آئی تھیں۔ بعض مؤرخین نے اس واقعہ کو اس انداز میں لکھا ہے گویا رسول اللہ ﷺ نے ان سے فوراً ہی تعلقات زن وشوئی قائم کر لیے تھے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ فتح خیبر کے بعد آپؐ نے فدک کے معاملات طے کیے، اس کے بعد وادی القریٰ کا محاصرہ کیا گیا۔ اسی دوران حضرت صفیہ ایک حیض سے پاک ہولیں تو آپؐ نے انہیں اپنی زوجیت میں لے لیا۔ (صحیح بخاری، جلد ۵، ص ۷۷۔ سیر اعلام النبلاء، جلد ۲، ص ۱۶۵۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۴، ص ۲۱۲، نیز ص ۱۹۷۔) نیز ڈاکٹر حمید اللہ نے بھی اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالے ''خیبر'' میں یہی تصریح کی ہے کہ عدت پوری ہونے تک صفیہ، ام سلمہ کے پاس رہیں۔ صفیہ مسلمان ہوگئیں اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لیا۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۹، ص ۷۱۔ مقالہ ''خیبر'')۔

۳۳۔ اردو دائرہ معارف الاسلامیہ، جلد ۲، ص ۵۶۲۔ مقالہ ''استبراء''۔

۳۴۔ صحیح بخاری، جلد ۲، ص ۱۲۳، صحیح مسلم، جلد ۲، ص ۱۰۴۵ (کتاب النکاح) (معمولی لفظی تغیر کے ساتھ یہی حدیث سنن ابی داؤد میں بیان ہوئی ہے۔ سنن ابی داود، جلد ۲، ص ۱۲۳)۔

۳۵۔ صحیح مسلم، جلد ۲، ص ۱۱۴۱، (کتاب العتق)، صحیح بخاری، جلد ۲، ص ۱۱۳، ۱۱۷، ۱۱۸۔

۳۶۔ سنن ابو داود، جلد ۲، ص ۳۶۵۔

۳۷۔ ابن ھشام، جلد ۳، ص ۴۸۵ (زیاد بن ابیہ کے ماں جائے بھائی ابوبکرہ ثقفی اسی طرح آزاد ہوئے تھے اور وہ خود کو مولیٰ رسول اللہ ﷺ کہتے تھے۔ الاستیعاب، جلد ۴، ص ۱۶۱۴۔)

۳۸۔ اس موقعہ پر اسلام کے مشہور قانون ''شہادت مدعی پر اور قسم مدعا علیہ پر ہے'' کے مطابق یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے غلامی قطعاً ایک عارضی چیز ہے۔ اس لئے مدعی کو تو

شہادت پیش کرنے کی تکلیف دی گئی مگر مدعا علیہ کی قسم پر اکتفا کیا گیا۔

۳۹۔ عماد الدین ابی الفداء اسماعیل ابن عمر بن کثیر القرشی الدمشقی (م ۷۷۴ھ)، البدایہ و النہایہ، جلد ۵، ص ۲۸۲، مطبعہ السعادۃ، مصر، ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء۔

۴۰۔ تاریخ طبری، جلد ۲، ص ۵۹۲۔

۴۱۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۵، ص ۳۰۵، ۶۔ الاستیعاب، جلد ۳، ص ۱۸۲۷۔

۴۲۔ ابن کثیر، البدایہ و النہایہ، جلد ۷، ص ۱۶۱۔ ۴۳۔ صحیح بخاری، جلد ۲، ص ۱۳۱۔

۴۴۔ بلوغ الارب، جلد ۲، ص ۱۷۲۔ ۴۵۔ الاستیعاب، جلد ۲، ص ۸۴۸۔

۴۶۔ ان میں بلال بن ابی رباح، عامر بن فہیرہ، زنیرہ، ام عبیس، بنی عمرو بن موئل کی ایک باندی، النہدیہ اور اس کی بیٹی شامل تھیں۔ (کتاب المعارف، ص ۷۷۔ ابن ھشام، جلد ۱، ص ۳۳۰-۳۳۱۔ الاستیعاب، جلد ۳، ص ۹۲۶)۔

۴۷۔ ابن کثیر، البدایہ و النہایہ، جلد ۷، ص ۱۸۱۔

۴۸۔ سورۃ النساء: ۳۶۔ ترجمہ [ماں باپ، قرابتداروں، مسکینوں، رشتہ دار ہمسایوں، اجنبی ہمسایوں، رفقائے مجلس، مسافروں، غلاموں اور باندیوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔]

۴۹۔ ابن ھشام، جلد ۲، ص ۱۴۸۔ (و ان ذمة الله واحدة يجير عليهم ادناهم) حدیث میں بھی رسول اللہ ﷺ سے ایسے ہی ارشادات مروی ہیں۔

۵۰۔ طبری، جلد ۳، ص ۹۳۔ الکامل فی التاریخ، جلد ۲، ص ۵۵۳۔

۵۱۔ المسعودی، ابوالحسن بن حسین بن علی، مروج الذھب و معادن الجواھر، جلد ۲، ص ۴۴۔

۵۲۔ المعارف، ص ۲۵۰۔

۵۳۔ سنن ابی داود، کتاب الطلاق، جلد ۲، ص ۴، ۲۲۳۔ صحیح مسلم، کتاب التفسیر، جلد ۴، ص ۲۳۲۰۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب، جلد ۴، ص ۱۹۱۳، (لونڈیوں کی تعداد اور ناموں میں قدرے اختلاف ہے۔ سنن ابی داؤد میں لونڈی کا نام مسیکہ لکھا ہے۔ الاستیعاب میں معاذہ بنت عبداللہ بیان کیا گیا ہے۔ جبکہ مسلم میں دو لونڈیوں کا ذکر کرکے ان کے نام مسیکہ اور امیمہ بتائے گئے ہیں۔)

۵۴۔ صحیح مسلم، جلد ۲، ص ۹۴۴ (کتاب الحج)۔

۵۵۔ صحیح بخاری، جلد ۸، ص ۳۲ (کتاب المحاربین من اہل الکفر والردۃ)

۵۶ صحیح مسلم، جلد ۳، ص ۱۲۷۸، (کتاب الایمان)، (غلاموں کو مارنے کا کفارہ یہ تھا کہ غلام کو اسی وقت آزاد کر دیا جائے۔)

۵۷ رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنے کسی خادم کو نہ مارا، نہ برا بھلا کہا۔ مہاجر موالی ام سلمہ کا بیان ہے کہ میں نے کئی سال رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی اور آپ نے مجھے کسی کام کرنے پر یہ نہیں کہا کہ تو نے یہ کیوں کیا اور نہ کسی کام کے نہ کرنے پر یہ کہا کہ تو نے اسے کیوں نہیں کیا۔ (البدایہ و النہایہ، جلد ۵، ص ۳۳۹)

۵۸ عرب جاہلیہ کے یہاں دستور تھا کہ وہ اپنے غلام کو "عبدی" (میرا بندہ) اور باندی کو "امتی" (میری باندی) کہہ کر پکارتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس دستور کو بدل ڈالا۔ صحیح بخاری، جلد ۳، ص ۱۲۳۔

۵۹ صحیح بخاری، جلد ۳، ص ۱۲۳۔ اسی قسم کی بات حجۃ الوداع میں بھی فرمائی "تمہارے غلام، تمہارے غلام، ان کا خیال رکھو، جو تم کھاؤ وہی انہیں کھلاؤ، جو تم پہنو وہی انہیں پہناؤ اور اگر وہ کوئی ایسی خطا کریں جسے تم معاف کرنا نہ چاہو تو اے اللہ کے بندو! انہیں فروخت کر دو انہیں سزا نہ دو۔" (الطبقات الکبریٰ، جلد ۲، ص ۱۸۵)

۶۰ الطبقات الکبریٰ، جلد ۲، ص ۲۵۳۔

۶۱ ابن ہشام، جلد ۲، ص ۳۰۰۔

۶۲ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے انہیں باقاعدہ تحریر لکھ کر دی جسے ابی بن کعب نے تحریر کیا۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۵، ص ۳۱۸ پر یہ تحریر موجود ہے۔

۶۳ ابن ہشام، جلد ۱، ص ۲۶۵۔ الطبقات الکبریٰ، جلد ۳، ص ۴۲۔ الاستیعاب، جلد ۲، ص ۵۴۵، (زید بن حارثہ بن شراحیل کلبی کو بچپن ہی میں بنو قین کے غارتگروں نے چرا کر بطور غلام کے بیچ دیا تھا جنہیں حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام بن خویلد نے خریدا اور لے لا کر حضرت خدیجہؓ کو دے دیا۔ حضرت خدیجہؓ نے زید کو بعثت سے قبل رسول اللہ ﷺ کو ہدیہ کر دیا۔ زید رسول اللہ ﷺ سے صرف دس برس چھوٹے تھے۔ سابقین اولین میں شمار ہوتے تھے کہ موالی میں سب سے پہلے انہوں نے ہی اسلام قبول کیا۔ مکہ میں ان کا رشتہ مؤاخاۃ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کے ساتھ استوار کیا گیا۔ مدینہ میں ان کی مؤاخاۃ اسید بن حضیر سے جو اشراف مدینہ میں سے

تھے، ہوئی۔ ہجرت کے بعد بیشتر سرایا ان کی سپہ سالاری میں سر ہوئے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جس فوج کشی میں زید شریک ہوئے، امارت کا عہدہ انہی کو ملتا، اس طرح وہ نو دفعہ سپہ سالار بنا کر بھیجے گئے۔ ۸ھ میں غزوۂ موتہ کے موقع پر شہید ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۵۵ سال تھی۔ حضرت عائشہؓ کا یہ قول ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس سریہ میں بھی زید بن حارثہ کو بھیجا لوگوں کا امیر بنا کر بھیجا اور اگر زید زندہ رہتے تو رسول اللہ ﷺ انہی کو اپنا جانشین بناتے۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد ۳، ص ۴۰ - ۴۶۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۵، ص ۳۱۵۔ الاستیعاب، جلد ۱، ص ۹۳)۔

۶۴ ثوبانؓ کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔ (انہیں ابو عبدالکریم اور عبدالرحمٰن بھی کہا جاتا ہے)۔ یہ السراۃ کے باشندے تھے جو کہ مکہ اور یمن کے مابین ایک مقام ہے بعض مورخین کا خیال ہے کہ ان کا تعلق بنو حمیر سے تھا۔ عہد جاہلیت میں انہیں قیدی بنالیا گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے خرید کر آزاد کر دیا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں یہ فتح مصر میں شریک رہے۔ حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت میں ۵۴ھ میں حمص میں وفات پائی۔ ابن قتیبہ کا بیان ہے کہ حمص میں ان کا قائم کردہ "دارالصدق" (محتاج خانہ) تھا۔ (کتاب المعارف، ص ۶۴۔ الاستیعاب، جلد ۱، ص ۲۱۸)۔

۶۵ ندوی، عبدالسلام، اسوۂ صحابہ، (مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۰ء) جلد ۱، ص ۲۵۸۔

۶۶ ایضاً، ص ۲۵۶۔

۶۷ صحیح مسلم، جلد ۳، ص ۱۲۸۱ (کتاب الایمان)۔

۶۸ صحیح بخاری، جلد ۳، ص ۱۴۲ (کتاب فی الرھن فی الحضر)۔ صحیح مسلم، جلد ۳، ص ۱۲۸۴، (کتاب الایمان)۔

۶۹ صحیح بخاری، جلد ۳، ص ۱۴۲۔

۷۰ گستاؤلیبان، تمدنِ عرب، ص ۵۱۷۔ (اسی قسم کے خیالات کا اظہار ص ۴۸۸ پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔)

۷۱ ایضاً، ص ۵۳۲۔



باب سوم: فصل سوم

اسلامی معاشرے میں موالی کی سماجی حیثیت

(عہدِ رسالت)

عہدِ رسالت میں اسلامی تعلیمات کی وجہ سے پورے معاشرے کی قلب ماہیت ہوگئی تھی۔ غلامی کی بیخ کنی کرنے کی پوری کوشش کی گئی اور اس کے باوجود غلام رہ جانے والوں کا سماجی رتبہ اتنا بڑھایا اور انھیں ایسے حقوق عطا کیے کہ فی الواقع غلامی کی شکل بدل گئی۔

جو معاشرہ غلاموں کو ایک مناسب سماجی مقام دینے پر آمادہ ہو، ظاہر ہے اس کا رویہ موالی (آزاد کردہ غلاموں) سے نسبتاً اور زیادہ بہتر ہوگا۔ عہدِ رسالت پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس دور میں (اور بعد میں بھی) اسلام کی ان تعلیمات پر، جو انسانی مساوات پر مبنی ہیں، اس شدت سے زور دیا گیا کہ اُحرار اور موالی کے جاہلی طبقات عملاً ختم ہوگئے اور فی الواقع موالی کا رتبہ اُحرار کے برابر ہوگیا اور انھیں وہ تمام آئینی اور سماجی تحفظات حاصل ہوگئے جو جاہلی معاشرہ صرف حُروں کو عطا کرتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کا طریقہ اس سلسلے میں انتہائی اہم اور اثر انگیز ہے۔ آپؐ نے اپنے غلاموں اور موالی سے وہ سلوک روا رکھا جس نے ایک طرف معاشرے کے اس کمتر طبقے کو عزت عطا کی، دوسری طرف عربوں کے عصبی مزاج کی تربیت ہوئی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر میدان عرفات سے واپسی میں اسامہ بن زید کے انتظار میں تاخیر

کردی۔ جب اُسامہ آئے، جو کہ ایک چپٹی ناک والے سیاہ فام لڑکے تھے، تو اہل یمن بگڑ گئے کہ ہم لوگ محض اس کی وجہ سے روکے گئے۔ ۱؎ بہرحال عرفات سے واپسی کے سفر میں انہی اسامہ کو رسول اللہ ﷺ نے شرف ہم نشینی بخشا۔ فتح مکہ کے موقع پر جب آپؐ مکے میں داخل ہوئے تو اسامہ بن زید آپ کے ہم نشین تھے اور جب آپ کعبہ میں داخل ہوئے تو بھی آپ کے ساتھ بلال موالی ابوبکر اور اسامہ بن زید موالی رسول اللہؐ تھے۔ ۲؎

رسول اللہ ﷺ نے غلام اور موالی کو، مولا کے خاندان کا فرد بنا دیا تھا۔ کیسان موالی رسول اللہ ﷺ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صدقے کی ایک چیز کے بارے میں کہا کہ "ہم کو صدقہ کھانے سے منع کیا گیا ہے اور ہمارا غلام بھی ہم میں سے ہی ہوتا ہے، لہٰذا تم بھی صدقہ نہ کھانا۔" ۳؎

اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارقم بن ابی الارقم کو زکوٰۃ کا محصل بنا کر بھیجا تو انہوں نے ابورافع ۴؎ موالی رسول اللہ ﷺ کو بھی اس کام میں شریک کرنا چاہا اور کہا کہ میں زکوٰۃ کی رقم میں سے بحیثیت عامل کے تمہیں دوں گا۔ ابورافع نے رسول اللہ ﷺ سے مشورہ کیا، تو آپؐ نے جواباً کہا "اے ابورافع! قوم کا موالی انہی میں سے ہوتا ہے اور ہمارے لئے زکوٰۃ حلال نہیں۔" ۵؎

انہی ابورافع کا بیان ہے کہ جنگ خیبر کے موقع پر سردی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ جس کے پاس کمبل ہے وہ اس شخص کو اُڑھا دے جس کے پاس کمبل نہیں ہے۔ خود ابورافع کو کمبل اُڑھانے والا کوئی نہیں ملا۔ وہ آپؐ کے پاس گئے، تو آپؐ نے اپنا کمبل ان پر ڈال دیا اور دونوں سو گئے۔ ۶؎

سلمان فارسی موالی رسول اللہ کے لیے بھی رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ملتا ہے کہ: "سلمان ہم میں سے ہے۔" یہ در اصل ایک ایسے قبائلی معاشرے میں جس کی بنیاد نسلی عصبیت پر ہو، انسانی مساوات کی تعلیم دینا اور اس پر عمل کرنا بھی ایک انتہائی دشوار کام تھا۔ مکی زندگی میں یہی بات اشاعت اسلام کے راستے میں بڑی رکاوٹ بن گئی تھی، کیونکہ دیگر انبیاء کی

طرح حضرت محمد ﷺ کے اولین پیروکار بھی کمزور اور ضعیف لوگ تھے، جب ہرقل ملک روم نے ابوسفیان سے پوچھا تھا کہ: ''کیا قوم کے بڑے لوگ محمد کی پیروی کرتے ہیں یا غریب لوگ؟ تو ابوسفیان نے جواب دیا تھا کہ: محمد کے پیروکار زیادہ تر ضعفاء اور غرباء ہیں تو ہرقل نے گویا تصدیق کرتے ہوئے کہا تھا کہ رسولوں کی پیروی ابتدا ایسے ہی لوگوں نے کی ہے۔

لیکن یہ چیز اشراف مکہ کے لئے ناقابل برداشت تھی چنانچہ بنی عبد مناف کے چند کافر اشراف نے ابو طالب سے کہا کہ کاش محمدؐ ہمارے غلاموں اور حلیفوں (موالی) کو اپنے پاس سے ہٹا دیتے (کیونکہ وہ ہمارے غلام اور خادم ہیں اور یہ بات ہمیں بہت شاق گذرتی ہے) ایسی صورت میں ہم محمدؐ کی اطاعت کریں گے اور ان کی تصدیق اور پیروی کریں گے۔ ابو طالب نے اس بات کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ سے کیا تو حضرت عمرؓ کہنے لگے ''اچھا ایسا بھی کر دیکھئے، معلوم ہو جائے گا کہ ان لوگوں کا ارادہ کیا ہے۔'' [8] ابھی یہ معاملہ چل رہا تھا کہ سورۃ الانعام نازل ہوئی، جس کی آیات ۵۲ اور ۵۳ میں واضح طور پر کہا گیا:

> وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ
> (الانعام: ۵۲-۵۳)

[اور آپ ان لوگوں کو اپنے سے دور نہ کیجئے جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، اس کی خوشنودی چاہتے ہوئے۔ ان کی ذمہ داری کا کوئی حصہ آپ پر نہیں اور نہ آپ کی ذمہ داری کا کوئی حصہ ان پر ہے کہ آپ ان کو اپنے سے دور کر کے ظالموں میں سے ہو جائیں اور اسی طرح ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے سے آزمایا ہے کہ وہ کہیں کہ کیا یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہمارے درمیان اپنے فضل کے لئے چنا۔ کیا اللہ شکر گزاروں سے اچھی طرح واقف نہیں۔] [9]

اس طرح نصِ صریح سے ایک اصول گویا ہمیشہ کے لئے متعین کر دیا گیا کہ اگر تمہارے پیروکار کمزور لوگ ہیں، جن کی بظاہر کوئی سماجی اور سیاسی حیثیت نہیں لیکن وہ خدا کو کثرت سے یاد کرنے والے شکر گزار متقی بندے ہیں تو ان کو ان اشراف سے زیادہ اہمیت دو جو اپنے غرور مال و جاہ میں مست ہیں اور تمہارے رب کو بھلائے ہوئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ ہدایت اس لئے نہیں دی گئی کہ آپ سے اس بات کا اندیشہ تھا کہ آپ اپنے ان کمزور اور ضعیف ساتھیوں کو نظر انداز کر دیں گے یا ان کو اپنے پاس سے ہٹا دیں گے اور ان کی جگہ سردارانِ قریش کو عطا کر دیں گے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عموماً انبیاء کرام اپنی قوم کے ایمان کے سخت متمنی، بلکہ حریص ہوتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس باب میں ایک تمثیل بیان کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ کیا یہ بات نہیں ہے کہ جب تم میں سے کسی کی کوئی بھیڑ کھو جاتی ہے تو وہ اس کی تلاش میں ندیوں نالوں اور جنگلوں میں پریشان پھرتا ہے اور اپنے اصلی گلے کو بھول جاتا ہے۔ پھر جب وہ بھیڑ مل جاتی ہے تو اس کو اپنے کندھے پر اٹھا کر لاتا ہے اور اپنے لوگوں میں آ کر کہتا ہے اے لوگو! میرے ساتھ خوشی مناؤ، اس لئے کہ میری کھوئی ہوئی بھیڑ مجھے مل گئی۔ یہ تمثیل انبیاء کرامؑ کی اس بے قراری کو ظاہر کرتی ہے جو اُن کے اندر اپنی قوم کے گمراہوں کے ایمان اور اصلاح کے لئے ہوتی ہے۔ یہ پسندیدہ صفت تو ہے لیکن اس کی بھی کچھ حدود ہیں یعنی اللہ تعالیٰ یہ بہرحال پسند نہیں کرتا کہ پیغمبر اپنی کھوئی ہوئی بھیڑوں میں اتنا سرگرداں ہو جائے کہ اپنے اصلی گلے کی دیکھ بھال سے غافل ہو جائے۔

یہی صورت حال عبداللہ بن ام مکتوم اور ولید بن مغیرہ کے سلسلے میں پیش آئی تھی۔ ولید بن مغیرہ، رئیس بنو مخزوم تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی شدید خواہش تھی کہ وہ اسلام قبول کر لے۔ ایک موقع پر آپؐ، ولید بن مغیرہ سے گفتگو کر رہے تھے کہ بنی عامر بن لوئیؑ کے ایک نابینا مسلمان عبداللہ بن مکتوم آئے اور آپؐ سے بعض آیات قرآنی کی بابت استفسار کرنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ کو اس وقت ان کا دخل دینا شاق گزرا اور ان کو سوال کرنے سے منع کر دیا، جس پر وہ آشفتہ خاطر ہو کر چلے گئے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو ولید کے اسلام قبول کرنے کا بہت

خیال تھا چنانچہ سورہ عبس کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔۱۰

بہر حال رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے رفقاء کو شروع سے ہی اسلام کے اس اصول سے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ اللہ کے نزدیک حسب نسب کی کوئی اہمیت نہیں ہے، بنیادی چیز تقویٰ ہے۔ پھر جب مدینے میں پہلا اسلامی معاشرہ قائم ہوا تو اس پر سختی سے عمل کیا گیا تاہم اس کے باوجود بعض مستشرقین کا یہ کہنا کہ محمدؐ قبائلی عصبیت کے خلاف اور مساوات انسانی کے علمبردار تھے مگر حال یہ تھا کہ ان کا قبیلہ قریش، معاشرے کا سب سے اشرف قبیلہ سمجھا جاتا تھا، اس قبیلے کی کوئی عورت نہ لونڈی بنائی جا سکتی تھی اور نہ اس قبیلے کا کوئی مرد غلام بنایا جا سکتا تھا۔ یہ بات Levy نے کتاب الاغانی کے حوالے سے کہی ہے۔۱۱

اس میں کوئی شک نہیں کہ عہد جاہلیت میں قریش کو پورے عرب میں سب سے افضل ہونے کا دعویٰ تھا۔ دیگر قبائل کے مقابلے میں قریش کو یہ برتری دو حیثیتوں سے حاصل ہوئی تھی، ایک معاشی، دوسرے مذہبی حیثیت سے۔ ان کی مذہبی سیادت تو اس وجہ سے قائم تھی کہ وہ خانہ کعبہ کے متولی تھے۔ ہر سال انہیں حاجیوں کے قیام و طعام اور پانی وغیرہ پلانے کی خدمت انجام دینی ہوتی تھی۔ سقایہ اور رفادہ (یعنی حاجیوں کے لئے پانی اور خوراک کا بندو بست کرنا) قریش کا دستور تھا، جسے قصی بن کلاب نے نہایت عمدہ اور مضبوط روایات پر قائم کر دیا تھا۔ حج کے دنوں میں ہر قریشی گھرانہ مقدور بھر حاجیوں کی خدمت کرتا تھا اور اس خدمت کا چونکہ وہ معاوضہ نہیں لیتے تھے، اس لئے قریش کو عرب میں یک گونہ مذہبی اور روحانی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

قریش کی برتری کی دوسری وجہ ان کا معاشی تفوق تھا۔ عرب ایک صحرائے اعظم تھا جس کی داخلی اور خارجی تجارت کو قریش ہی نے منظم اور محفوظ بنایا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے پر دادا عمرو بن عبد مناف (ہاشم) نے قیصر روم، کسریٰ ایران، نجاشی حبش اور اقیال یمن سے "ایلاف" یعنی منشور تجارت حاصل کر لیے تھے۔۱۲ جس کے نتیجے میں قریش ان ممالک میں بلا کھٹکے اپنے کاروانِ تجارت لا اور لے جا سکتے تھے۔ چنانچہ عربوں کے تجارتی تعلقات ایک طرف فلسطین، شام اور

عراق نیز عمان سے تھے (جہاں سے مختصر بحری راستے بلوچستان، سندھ اور ہندوستان کے ساتھ ساتھ اتصال ہوجاتا تھا)، تو دوسری طرف مصر، حبشہ اور یمن سے تھے جہاں ان کے ششماہی کاروان تجارت آتے جاتے تھے، جن کی طرف قرآن میں سورۂ قریش میں اشارہ کیا گیا ہے۔

قریش نے ایک نظام حلیفی وخفارہ (بدرقہ) بنالیا تھا یعنی عرب کے کسی شخص کو بھی تجارتی سامان لے کر حجاز ونجد کے وسیع رقبے میں پھیلے ہوئے مُضری قبائل کی سرزمین سے گزرنا پڑتا تو وہ قریشی بدرقے حاصل کرتا۔ قریش کی طے اور کلب قبائل سے حلیفی تھی جو شمالی عرب میں خیبر اور دومۃ الجندل کے اہم رقبے پر چھائے ہوئے تھے اور یہیں سے عراق، شام اور مصر کو راستے نکلتے تھے۔ اس حلیفی کی وجہ سے عربوں کی تجارت ان علاقوں میں محفوظ ہوگئی تھی۔ ۱۳ نیز بنی عمرو بن مرشد سے دوستی کی بنا پر قبائل ربیعہ کی سرزمین بھی قریش کے لئے محفوظ تھی جس سے بحرین وعمان یعنی پورے مشرقی عرب کی منڈیوں تک رسائی حاصل ہوگئی تھی۔ حتیٰ کہ اگر کسی کو بحرین کے سوق مشقر جانا ہوتو قریشی خفارہ ہی حاصل کیا جاتا۔ حضرموت کے سوق رابیہ جانے کے لئے قریش، قبیلہ کندہ کے آکل المرار کا خفارہ حاصل کرتے اور دیگر لوگ آل مسروق بن وائل حضرمی کا، لیکن قریشی سرپرستی کے باعث آکل المرار کو اپنے حریفوں پر فوقیت حاصل ہوگئی ۱۴ غرض عرب کا شمالی، جنوبی، مشرقی، مغربی اور وسطی حصہ قریشی ایلاف کی زنجیروں سے جکڑ گیا تھا۔ ان کے میلے اور ان کے کاروان تجارت جتنے مفید ثابت ہوئے، ان کو قرآن نے اطعمھم من جوع و امنھم من خوف (فاقے کی جگہ کھانا اور خوف کی جگہ امن) کے دو معجز نما لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔ ۱۵

ان تمام باتوں نے قریش کو دیگر عرب قبائل پر یک گونہ برتری دلا دی تھی مگر اس بنیاد پر دوسرے قبائل کو کمتر سمجھنا نہ رسول اللہ ﷺ کی حکمت عملی تھی نہ آپؐ کے جانشینوں کی۔

لیوی (Levy) کا یہ بیان کہ قبیلہ قریش کی کوئی عورت نہ تو لونڈی بنائی جاسکتی تھی نہ کوئی مرد غلام بنایا جاسکتا تھا، تاریخی طور پر غلط ہے۔ سب سے زیادہ سامنے کی مثال تو یہ ہے کہ جنگ بدر کے ستر قیدی سب کے سب قریشی تھے۔ اگر اسلام نے فدیہ لے کر یا احساناً جنگی

قیدیوں کو رہا کرنے کا راستہ نہ بتایا ہوتا تو یہ سب کے سب فرزندان قریش مسلمانوں کے غلام بن جاتے۔ ۱۶

فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے یوں تو عام معافی کا اعلان کیا لیکن بعض لوگوں کو گرفتار کر کے قتل کرنے کا بھی حکم دیا، وہ سب کے سب یا تو قریش تھے یا ان کے حلفاء۔

ان نظائر کو دیکھتے ہوئے اب اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ وہ سب قیدی قریش تھے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے انہیں احساناً چھوڑ دیا، یہ بھی تاریخی طور پر ایک غلط الزام ہوگا، کیونکہ غزوہ بنی مصطلق کا واقعہ بھی تواتر سے تاریخی کتب میں آیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ شعبان ۶ھ میں ہونے والی اس جنگ میں سو خاندان گرفتار ہوئے تھے۔ (حضرت جویریہ سے عقد کے بعد) بنی مصطلق کے تمام قیدی احساناً رہا کر دیے گئے۔ بنو مصطلق، قریش نہیں بلکہ بنوخزاعہ کی ایک شاخ تھی اور خزاعہ جنوبی عرب کے بڑے قبیلے ازد میں محسوب ہوتے تھے۔

اسی طرح فتح مکہ کے بعد جب غزوہ حنین پیش آیا تو بنو ہوازن کے چھے ہزار کے لگ بھگ مرد، عورتیں اور بچے گرفتار ہوئے، جنہیں بعد میں احساناً رہا کر دیا گیا۔ بنو ہوازن قریش نہیں تھے بلکہ یہ شمالی عرب کا ایک بڑا قبیلہ تھا، جس کی اہم شاخوں میں بنو ثقیف، بنو جشم، بنو سعد بن بکر اور بنو ہلال وغیرہ تھے۔

اصل میں لیوی نے اپنی بات کے لئے کتاب الاغانی ۱۷ کا حوالہ دیا ہے جو فی الواقع تاریخ سے زیادہ نغموں اور گیتوں کی کتاب ہے۔ اس مقالے کی حد تک کتاب الاغانی کے سلسلے میں ہمارا رویہ یہ رہا ہے کہ متنازعہ معاملات و واقعات میں کتاب الاغانی کی صرف ان روایتوں اور واقعات کو قبول کیا جائے، جن کی تصدیق کسی مستند تاریخی ماخذ سے ہوتی ہو، کیونکہ شاعری اور تاریخ میں بنیادی فرق ہے۔

لیوی اس ضمن میں مزید کہتا ہے کہ "محمد (ﷺ) کے بعد تقریباً ڈیڑھ صدی تک کوئی موالی اس بات کی جرأت نہیں کر سکتا تھا وہ کسی صریح عرب کی لڑکی کے لئے اس کے والدین سے رشتہ مانگے۔" ۱۸ وہ مزید کہتا ہے کہ "عربوں کی غیر عرب عورتوں سے شادی بھی

اسلام کے ابتدائی زمانے میں اتنی ہی ناپسندیدہ تھی، جتنی عہد جاہلیت میں تھی۔" ۱۹

حسن ابراہیم حسن اپنی کتاب النظم الاسلامیہ میں اسلام کے ابتدائی دور کے حوالے سے کہتے ہیں کہ "عرب اپنی لڑکیوں کی شادی کسی موالی کے ساتھ کرنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔" ۲۰

لیوی اور حسن ابراہیم حسن نے یہ بات کس حوالے سے کی، اس کا تذکرہ نہیں ملتا جبکہ اسلامی تاریخ کے ابتدائی ماٰخذ کچھ مختلف معلومات فراہم کرتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش کا نکاح (۴ ھ میں) اپنے موالی زید بن حارثہ سے کیا تھا۔ ۲۱ گویا آپؐ نے اپنے خاندان میں یہ نظیر قائم کردی کہ اسلام ایک آزاد کردہ غلام کو اٹھا کر اشراف قریش کے برابر لے آیا۔

۲۔ ابو حذیفہ کے موالی سالم کا نکاح سردار قریش ولید بن عتبہ کی بیٹی، عتبہ بن ربیعہ کی پوتی (جو کہ ابو حذیفہ کی بھتیجی بھی تھی) فاطمہ (ہندہ) سے ہوا۔ ۲۲

۳۔ زید بن حارثہ موالی رسول اللہ ﷺ نے زینب بنت جحش کے بعد چار نکاح اور کیے تھے اور سوائے ایک کے، سب معززین مکہ کی بیٹیوں سے۔ مثلاً زید کی ایک بیوی ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط تھیں ۲۳ جن کی ماں اروئی بنت کریز بن ربیعہ بن حبیب ابن عبد شمس تھیں اور اروئی بنت کریز کی والدہ ام حکیم البیضاء بنت عبدالمطلب بن ہاشم تھیں۔ ہجرت کے بعد ام کلثوم جب مدینے آئیں تو چار اشخاص نے آپ کو پیغام نکاح بھجوایا، زبیر بن العوام (صریح)، زید بن حارثہ (موالی)، عبدالرحمٰن بن عوف (صریح) اور عمرو بن العاص (صریح)۔ ام کلثوم نے رسول اللہ ﷺ سے مشورہ کیا، آپؐ نے زید بن حارثہ کے ساتھ نکاح کا مشورہ دیا۔ لہٰذا یہ نکاح ہوا اور ام کلثوم کے یہاں زید سے دو بچے زید بن زید اور رقیہ پیدا ہوئے (دونوں کم عمری میں وفات پا گئے)۔ زید بن حارثہ کی ایک اور بیوی درہ بنت ابی ہند (صریح عرب خاتون) تھیں، ان کی ایک اور بیوی ہند بنت العوام (زبیر بن عوام کی بہن اور قریشی النسب عرب خاتون) تھیں۔ زید کا صرف ایک نکاح مولاۃ، ام ایمن ۲۴ سے ہوا تھا جو رسول

اللہ ﷺ کی کھلائی تھیں، ان سے اسامہ پیدا ہوئے۔

۴۔ بلال حبشی ۲۵؎ موئی ابی ابو بکر کی شادی ابو البکیر کی آزاد عرب بیٹی سے ہوئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت بلال کی شادی بنی زہرہ کی عرب خاتون سے ہوئی۔ ہوسکتا ہے دونوں ہی خواتین ان کی زوجیت میں ہوں۔ اسی طرح حضرت بلال کے بھائی کی شادی بھی آزاد عرب کی بیٹی سے ہوئی۔ ابن سعد نے یہ واقعہ صراحتاً بیان کیا ہے۔ ۲۶؎

۵۔ اسامہ بن زید نے اپنی زندگی میں پانچ عورتوں سے نکاح کیا، وہ سب قریش کے بڑے قبائل کی شریف زادیاں تھیں، مثلاً بنومخزوم کی ہند بنت الفاکہ بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم۔ بنوسہم کی درہ بنت عدی بن قیس بن حذافہ بن سہم، فاطمہ ۲۷؎ بنت قیس بن خالد بن وہب بن ثعلبہ بن وائل بن شیبان بن محارب بن فہر (ضحاک ابن قیس کی بہن)، ام حکیم بنت عتبہ بن ابی وقاص اور بنت ابی ہمدان جو کہ بنوعذرہ کی شاخ بنی رزاح سے تھیں، ان کے علاوہ ابن سعد اور ابن عبدالبر زینب بنت قسامہ کا تذکرہ بھی کرتے ہیں جو اسامہ بن زید کے نکاح میں تھیں۔ ان کا تعلق بنوطے سے تھا۔ اسامہؓ نے انہیں طلاق دے دی تھی۔ ۲۸؎

۶۔ موئی حمران بن ابان (م ۷۵ھ) نے بھی آزاد عرب عورت سے شادی کی تھی اور یہ واقعہ مشہور ہے۔

گولڈ زیہر اس کو استثنیٰ کہتا ہے رواج نہیں، درآں حالیکہ استثنیٰ ہی آگے چل کر رواج بن جاتا ہے۔

ان مثالوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عہد رسالت کے اسلامی معاشرے میں، عہدِ جاہلیت کے برعکس موئی صریح عرب خواتین سے شادیاں کرسکتے تھے بلکہ اگر کسی کی طرف سے جیل و حجت کا پتہ چلتا تو رسول اللہ ﷺ ناراض ہوتے تھے۔ ایک موئی نے ایک ممتاز خاندان ''بنی بیاضہ'' میں نکاح کا پیغام بھیجا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی سفارش کی۔ اس

خاندان کے بعض لوگوں نے کہا "یارسول اللہ ﷺ! کیا ہم اپنی بیٹیاں اپنے غلاموں سے بیاہ دیں؟" آپ کو یہ سوال برا لگا، اس وقت سورۃ الحجرات کی تیرہویں آیت نازل ہوئی۔ ۲۹

اسی طرح جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینب بنت جحش کو اپنے موالی زید بن حارثہ سے نکاح کرنے کا مشورہ دیا تو نہ یہ رشتہ حضرت زینب نے پسند کیا نہ ہی ان کے خاندان کے بعض لوگوں ہی نے۔ زینب، رسول اللہ ﷺ کی رشتہ دار تھیں، جوان، خوبصورت اور اعلیٰ نسب تھیں، ہوسکتا ہے ان کے دل میں رسول اللہ ﷺ کا خیال رہا ہو، ایسے میں جب رسول اللہ ﷺ نے اپنے موالی کے لئے ان سے بات کی تو ان کی عزت نفس کو فطرتاً ٹھیس لگی اور انہوں نے کہا کہ "میں اسے اپنے لئے پسند نہیں کرتی، میں قریش کی شریف زادی (ایم القریش) ہوں۔" اسی طرح کا اظہار نارضامندی ان کے بھائی عبداللہؓ بن جحش نے بھی کیا تھا۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے سورۂ احزاب کی چھتیسویں آیت ۳۰ انہیں سنائی تو حضرت زینبؓ اور ان کے رشتہ دار اس نکاح پر راضی ہوگئے۔

تاریخ کی بعض کتابوں میں اس شادی کی ناکامی کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ زینبؓ مزاج کی تیز تھیں لہٰذا نباہ نہ ہوسکا۔ یہ تجزیہ درست نہیں۔ زینبؓ بنت جحش مزاج کی تیز نہیں تھیں۔ اصل میں اس شادی کی ناکامی کی وجہ وہی نسلی تفاخر کا احساس تھا جو انہیں زید سے تلخ کردیتا تھا۔ اس قسم کے مظاہرے بالکل فطری تھے۔ جب تربیت کا مرحلہ ہو تو اس قسم کے واقعات پیش آتے ہی ہیں، ان کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالنا کہ اس معاشرے میں نسلی تفاخر عروج پر تھا، درست نہیں۔

لیوی کے برخلاف ایچ۔ اے۔ آر۔ گب کا تجزیہ زیادہ قابل قبول ہے، اس کا کہنا ہے کہ:

> "لوگوں کے مراتب، مواقع اور عمل کے لحاظ سے مختلف نسلوں کے درمیان مساوات قائم کرنے میں کسی معاشرے نے اسلام جیسی کامیابی حاصل نہیں کی۔" ۳۱

اسلام کی عملی مساوات کے بہت سے غیر مسلم مورخین اور قدیم و جدید دانشور

حضرات قائل ہیں۔ ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ اپنی کتاب "Preaching of Islam" میں متعدد بار مسلمانوں کی اس خوبی کا اعتراف کرتا ہے۔ جواہر لعل نہرو اپنی کتاب Discovery of India میں وضاحت سے لکھتے ہیں "ہندوستان کی تاریخ میں شمال مغربی ہند کے فاتحین اور اسلام کی آمد کی بڑی اہمیت ہے، اس نے ہندو معاشرے کے فساد کو ظاہر کر دیا، اس نے طبقاتی تقسیم، چھوت چھات اور ہندوستان کی دنیا سے علیحدگی کو بھی نمایاں کر دیا۔ اسلامی اخوت و مساوات نے جس پر مسلمانوں کا ایمان و عمل تھا، ہندوؤں کے ذہنوں پر گہرا اثر ڈالا اور اس سے خاص طور پر وہ محروم لوگ زیادہ متاثر ہوئے، جن پر ہندوستانی معاشرے نے برابری اور انسانی حقوق سے استفادے کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔" ۳۲

اسی طرح ڈاکٹر تارا چند نے اپنی کتاب ۳۳ میں مسلمانوں کی مذہبی رواداری اور اسلامی اخوت و مساوات کا اعتراف کیا۔

مشہور برطانوی فلسفی مؤرخ ٹائن بی لکھتا ہے "مسلمانوں کے درمیان نسلی امتیاز کا خاتمہ اسلام کے عظیم کارناموں میں سے ایک ہے اور موجودہ دور میں تو اسلام کی یہ سعادت، وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے..... حالانکہ کچھ دوسری حیثیتوں سے انگریزی بولنے والی اقوام کی کامیابیاں عالم انسانیت کے لئے باعث رحمت ثابت ہوئی ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نسلی جذبات کے خطرناک معاملے میں یہ بدقسمت رہا ہے۔ ۳۴

ہندوستان کی سروجنی نائیڈو، اسلامی اخوت و مساوات کا کھلے دل سے اعتراف کرتی ہیں، "میں نے بار بار محسوس کیا ہے کہ اسلام اتحادِ عمل سے ایک انسان کو دوسرے انسان کا بھائی بنا دیتا ہے۔ جب آپ لندن میں کسی مصری، الجیریائی، ہندوستانی اور ترک سے ملتے ہیں تو اس کی اہمیت نہیں ہوتی کہ ایک کا وطن مصر ہے اور دوسرے کا ہندوستان۔" ۳۵

مشہور افریقی لیڈر مالکم ایکس (Malcolm-X) اپنی خودنوشت سوانح عمری میں کئی جگہ مسلم معاشرے اور اسلامی تہذیب کی عطا کردہ وحدت و مساوات کا اعتراف کرتا ہے۔ ۳۶

ان بیانات کو اس وجہ سے قابلِ اعتناء گردانا جائے گا کہ چودہ سو سال قبل ہی نہیں

بلکہ چودہ سو سال کے تسلسل میں آج تک اسلامی معاشروں میں اسلامی اخوت و مساوات کی خوبی موجود ہے، جسے ان مؤرخین نے اپنے ارد گرد محسوس کیا ہے۔ وہ روایات جو چودہ صدیوں سے زائد کا عرصہ گزر جانے کے باوجود باقی ہیں، تو اس وقت یہ روایات کیوں نہ موجود ہوں گی جب یہ اسلامی معاشرہ قائم کیا گیا تھا؟ بلکہ یقیناً بدرجۂ اتم موجود ہوں گی۔ عہد رسالت میں اس کی بہت سی نظیریں ملتی ہیں۔ مثلاً ہجرت کے بعد، رسول اللہ ﷺ کے مدینہ تشریف لانے سے قبل قُبا میں مسلمانوں کی نماز میں امامت سالم مولیٰ ابو حذیفہ کرتے رہے کیونکہ وہاں موجود صحابہ میں سب سے زیادہ قرآن کا علم انہی کو تھا جبکہ مقتدیوں میں حضرت عمر فاروقؓ، ابوسلمہ بن عبدالاسد، حضرت زید اور حضرت عامر بن ربیعہ جیسے اشراف عرب شامل تھے۔ ۳۷

جنگِ یمامہ کے موقع پر مہاجرین کے علم بردار بھی سالم ہی تھے۔ طبری کا بیان ہے کہ جب سالم کو علم دیا گیا تو انہوں نے کہا "میں نہیں جانتا کہ مجھے یہ علم کیوں دیا گیا ہے، غالباً آپ لوگ کہیں گے چونکہ آپ حافظ قرآن ہیں اور اس لئے کہ آپ بھی دوسرے صاحب ۳۸ کی طرح آخر وقت تک دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں گے۔"

حضرت بلال حبشی مولیٰ ابو بکرؓ کو سابق الاسلام ہونے کی وجہ سے یہ توقیر ملی کہ مسجد نبوی کے مؤذن تھے، ان کے متعلق حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے "ابو بکر ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار (یعنی بلالؓ) کو آزاد کیا ہے۔" ۳۹ فتح مکہ کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ کے کہنے پر حضرت بلالؓ نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان کہی تو حارث بن ہشام، صفوان بن امیہ اور دیگر معززین مکہ نے اس حیرت انگیز منظر کو دیکھا اور تعجب کیا۔ یہی بلالؓ تھے جنہیں حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو معزول کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ خالدؓ بن ولید کا روسائے مکہ میں جو مقام تھا وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ اسی طرح عہد رسالت میں قُبا میں جو موذن تھے، وہ سعد القرظ تھے جو عمار بن یاسر کے مولیٰ تھے۔ ۴۰

سلمان فارسیؓ جو رسول اللہ ﷺ کے مولیٰ تھے، ان کے مشیر بھی تھے، جنگ خندق کے موقع پر خندق کھودنے کا مشورہ انہی کا تھا۔ انہی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ قول

ملتا ہے۔"سلمان منا اهل البیت" (سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہے)۔ اہ

زید بن حارثہ کی جلالت شان کا اندازہ حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے ہوسکتا ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے جس سریہ میں بھی زید بن حارثہ کو بھیجا، لوگوں کا امیر بنا کر ہی بھیجا اور اگر زید آپؐ کے بعد زندہ رہتے تو آپ انہیں اپنا خلیفہ بناتے۔" ۴۲

جنگِ موتہ کے موقع پر حضرت زید کو اس لشکر کا امیر منتخب کیا گیا جس میں جعفرؓ بن ابی طالب، خالدؓ بن ولید اور دیگر اشراف عرب شامل تھے۔ غزوۂ کرز بن جابر الفہری اور غزوۂ مریسیع میں زید، مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے نائب کے طور پر رہے۔ انہی زید کے لئے رسول اللہ ﷺ کا یہ قول ملتا ہے "اے زید! تم میرے موالی ہو اور مجھ سے ہو، میری طرف ہو اور ساری قوم سے زیادہ مجھے عزیز ہو۔" ۴۳

انہی زید کے بیٹے اسامہ بن زید تھے جن کا کافی کچھ تذکرہ اس باب میں پہلے آچکا ہے۔ اپنی وفات سے قبل رومیوں کی طرف جو لشکر رسول اللہ ﷺ نے روانہ کیا تھا اس کے امیر اسامہ بن زید ہی تھے حالانکہ اس لشکر میں اکابر صحابہ بشمول حضرت عمر فاروقؓ اور ابو عبیدہؓ بن جراح بھی شامل تھے۔ ۴۴ جب بعض لوگوں نے ان کی امارت پر اعتراض کیا تو رسول اللہ ﷺ نے سخت برہمی کا اظہار کیا اور فرمایا "تم بیشک اس سے پہلے ان کے باپ کی سربراہی پر بھی اعتراض کرتے تھے حالانکہ بخدا وہ سربراہی کے لئے بہت موزوں تھے اور ان کا بیٹا بھی امارت ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ زید تمام لوگوں سے زیادہ مجھ کو محبوب تھے اور ان کے بعد یہ (اسامہ) تمام لوگوں سے زیادہ مجھ کو محبوب ہے۔" ۴۵

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں نے اسامہ کی امارت پر اعتراض کیوں کیا۔ بعض روایتوں کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعتراض کی وجہ ان کا کم سن ہونا تھا۔ (واقدی، ابن سعد اور ذہبی کی روایت کے مطابق ان کی عمر اس وقت بیس سال تھی) اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتراض کی وجہ ان کا آزاد کردہ غلام ہونا تھا۔ صحیحین میں رسول اللہ ﷺ کے جو الفاظ جواباً مروی ہیں، اس سے یہی تاثر ملتا ہے کہ گو بظاہر اعتراض ان کی کم سنی پر تھا مگر

اصل وجہ اعتراض یہی تھی کہ وہ شخص ایک موالی تھے، جبکہ ان کے تحت لشکر میں اشراف وصریح عربوں کی کثرت تھی۔ صحیح بخاری وصحیح مسلم کی رُو سے اگر دیکھا جائے تو رسول اللہ ﷺ کا یہ کہنا کہ تم آج اسامہ پر طعن کر رہے ہو، مگر اس سے پہلے ان کے باپ، زید بن حارثہ کی امارت پر بھی تو طعن کر چکے ہو۔ یعنی اگر اسامہ کی کم سنی پر تمہیں اعتراض ہے تو زید تو کم عمر نہیں تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ جملہ بتاتا ہے کہ آپ دراصل وجۂ اعتراض کی تہ تک پہنچ گئے تھے اور حضورؐ کے غصے کی اصل وجہ بھی یہی تھی کہ اس طرح کی باتوں سے اسلامی معاشرہ کی خیرخواہانہ فضا متاثر ہوتی تھی اور اس مساوات واخوت پر ضرب پڑتی تھی جس کا اسلام داعی تھا۔

تاہم اس قسم کی مثالوں سے اگر کوئی یہ ثابت کرنا چاہے کہ اس معاشرے میں مساوات نہیں تھی، جب ہی تو یہ اعتراض سامنے آتے تھے، تو یہ رویہ غیر حقیقی ہوگا۔ حضرت زینب کا ایک موالی سے شادی کے وقت ہچکچانا اور پھر اسی جذبے کا وجہ طلاق بن جانا، یا اسامہ بن زید کی امارت پر لوگوں کا اعتراض کرنا، یا حضرت ابوذر غفاری کا اپنے عجمی الاصل غلام کو اس کی عجمی ماں کی وجہ سے عار دلانا ۲۶ وغیرہ۔ ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ نسلی تفاخر عربوں میں کسی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ یہ وہ چیز تھی جو اُن کے رگ وپے میں سرایت کر چکی تھی۔ ان کا نظام قبائلی تھا، ان کا مزاج عصبی تھا ایسے میں اخوت ومساوات کی جو فضا رسول اللہ ﷺ پیدا کرنا چاہ رہے تھے، اس سے عربوں کی گویا قلب ماہیت مقصود تھی۔ انسانی نفسیات کا معمولی سا علم رکھنے والا شخص بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ عصبی مزاج کے حامل افراد میں نسلی تفاخر کو یک جنبش قلم موقوف نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے طویل دورِ تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے دوران اس قسم کے واقعات (جو اوپر بیان کیے گئے) کا سامنے آنا بالکل فطری اور عین متوقع ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ جس طرز کا معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے، اس میں سب سے زیادہ بنیادی چیز تقویٰ تھی۔ جو سابق الاسلام ہے اور جو متقی ہے، معاشرے کا وہ سب سے افضل شخص ہے اور جو سابق الاسلام بھی نہیں ہے، متقی بھی نہیں ہے پھر اس کا حسب نسب خواہ کچھ ہو اس کی

کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔ زیر نظر عہد کا ایک واقعہ اس ساری صورت حال کو واضح کر دیتا ہے، ایک موقع پر حضرت صہیب رومی ؓ، حضرت سلمان فارسی اور حضرت بلال بن ابی رباح بیٹھے ہوئے تھے کہ وہاں سے سردار قریش مکہ ابو سفیان کا گزر ہوا، تینوں میں سے کسی ایک نے کہا کیا ابھی اس دشمن خدا کی گردن اترنے کا وقت نہیں آیا۔ حضرت ابو بکر صدیق ؓ یہ سن رہے تھے، انہوں نے کہنے والے کو ڈانٹ دیا کہ کیا تم یہ بات ایک شیخ قریش کے بارے میں کہہ رہے ہو۔ پھر جا کر رسول اللہ ﷺ کو اس بات کی اطلاع دی۔ رسول اللہ ﷺ نے خلاف توقع حضرت ابو بکرؓ کو تنبیہ کی اور کہا "شاید تم نے انہیں (بلال، صہیب اور سلمان کو) ناراض کر دیا ہے، اگر ایسا ہے تو تم نے خدا کو ناراض کر دیا ہے۔" اس پر حضرت ابو بکر صدیق ؓ سخت پریشان ہوئے۔ واپس آئے اور ان تینوں افراد سے معافی مانگی۔ [۴۸]

وہ لوگ جو اہلِ ایمان تھے اور متقی تھے، اگر سماجی معاملات میں کبھی کوئی عصبی مظاہرہ ہو بھی جاتا اور رسول اللہ ﷺ ان کی پکڑ کرتے تو وہ متنبہ ہو جاتے تھے، نادم ہوتے اور آئندہ وہ غلطی نہیں دہراتے تھے جیسا کہ ابو بکر صدیق ؓ یا ابو ذر غفاری ؓ کے واقعہ سے پتہ چلتا ہے، لیکن اس معاشرے میں کچھ ایسے بھی تھے جو قصداً فضا کو مسموم کرتے تھے اور بعض اوقات وہ اتنے کامیاب ہو جاتے تھے کہ تلواریں تک نکل آتی تھیں اور مسلمان مسلمان کے مدمقابل آ کھڑا ہوتا تھا۔ یہ لوگ منافقینِ مدینہ تھے جو اپنے مخصوص سیاسی عزائم حاصل کرنے کے لئے فضا کو خراب کرتے تھے اور جاہلی عصبیت کو انگیخت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

منافقین دراصل بظاہر مسلمان ہو جانے والے بعض اہلِ مدینہ کا گروہ تھا، جس کی سب سے بہتر تعریف سورہ بقرہ میں اس طرح کی گئی ہے:

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (البقرہ: ۱۴)

[جب یہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اور

جب ان سے علیحدگی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں۔]

اسلام کے ابتدائی مکی دور میں منافقین کا وجود نہ تھا، کیونکہ وہاں کے حالات میں اس دورخی (منافقت) کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اس لئے مکی سورتوں میں ان کا تذکرہ بھی نہیں ہے، البتہ مدنی سورتوں میں مختلف مقامات پر ان کے کردار کی وضاحت کی گئی ہے۔ منافقت یا نفاق کا آغاز اس طرح ہوا کہ ہجرت سے قبل مدینہ میں بنو خزرج کے خاندان عوف کا ایک بااثر اور عیار شخص عبداللہ بن ابی ابن سلول رہتا تھا۔ اوس و خزرج کے قبائل جو ایک دوسرے کے شدید حریف تھے بعثت نبوی سے قبل ان کے درمیان جنگ بعاث ۴۹ ھ ہو چکی تھی جس میں اوس و خزرج کے بہت سے بہادر اور نامور لوگ مارے جا چکے تھے، جنگ کی بدحالیوں سے بچنے کے لئے دونوں قبائل، بعد از خرابی بسیار، عبداللہ بن ابی کو اپنا متفقہ قائد تسلیم کرنے پر آمادہ ہو چکے تھے اور معاملہ یہاں تک طے پا چکا تھا کہ اس کے لئے ایک تاج بھی بنوالیا گیا تھا، اسی اثنا میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ ہجرت کر کے مدینے آگئے جس کی بنا پر حالات یکسر بدل گئے ۵۰ اور میثاق مدینہ کے بعد تو مدینۂ منورہ میں کسی اور کی قیادت کی بالکل بھی گنجائش باقی نہ رہی۔ عبداللہ بن ابی نے اسلام تو قبول کر لیا لیکن رسول اللہ ﷺ اور مہاجرین کو اپنا دشمن اور حریف سمجھنے لگا اور اس کا اظہار مختلف صورتوں سے اور بعض موقعوں پر کرتا بھی رہا۔ بہت جلد منافقین ایک گروہ کی شکل اختیار کر گئے۔ مدینے کی آبادی میں تقریباً ایک تہائی تعداد عبداللہ بن ابی کے ساتھیوں کی تھی، جیسا کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر ظاہر ہوا تھا جب وہ عین وقت پر اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ یہ کہتے ہوئے اسلامی لشکر سے الگ ہو گیا کہ چونکہ ہماری رائے نہیں مانی گئی، اس لئے ہم جنگ کے لئے نہیں جائیں گے۔ ۵۱ جس نازک گھڑی میں اس نے یہ حرکت کی تھی اس کی نزاکت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ قریش تین ہزار کا لشکر لے کر مدینے پر چڑھ آئے تھے، جبکہ مسلمان ان کے مقابلے میں صرف ایک ہزار تھے، ان میں سے بھی تین سو افراد کو عبداللہ بن ابی توڑ لے گیا اور رسول اللہ ﷺ کو صرف سات سو کی جمعیت

کے ساتھ تین ہزار کا مقابلہ کرنا پڑا۔

پھر ۴ھ میں غزوہ بنی نضیر پیش آیا، اس میں بھی منافقوں کی منافقت کام کرتی رہی۔ ایک طرف مسلمان ان یہودی دشمنوں سے جنگ کی تیاری کر رہے تھے اور دوسری طرف یہ منافقین اندر ہی اندر یہودیوں کو یہ پیغام بھیج رہے تھے کہ ڈٹے رہو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تم سے جنگ کی جائے گی تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور تم کو نکالا جائے گا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے۔ ۵۲ غزوۂ احزاب کے موقع پر بھی گروہ منافقین نے مسلمانوں کو بددل کرنے اور ان کے حوصلے پست کرنے کی کوشش کی۔ کبھی مسلمانوں کو دشمنوں کی کثرت تعداد سے ڈراتے اور کبھی مسلمانوں کو مکانات کے غیر محفوظ ہونے کا ذکر کر کے پریشان کرتے۔

ایک بار اور ان کی منافقت غزوۂ بنو مصطلق، (شعبان ۶ھ) میں جسے غزوۃ المریسیع بھی کہتے ہیں، کھل کر سامنے آئی، جب بنی مصطلق کو شکست دینے کے بعد لشکر اسلام ابھی مریسیع نامی بستی میں ٹھہرا ہوا تھا، کہ جہجاہ بن مسعود غفاری اور سنان بن وبرۃ الجہنی ۵۳ نامی اشخاص کا پانی کے مسئلے پر جھگڑا ہو گیا۔ اول الذکر حضرت عمرؓ کے ملازم تھے اور ان کا گھوڑا سنبھالنے کی خدمت انجام دیتے تھے، مؤخر الذکر بنو عوف بن خزرج کے حلیف تھے۔ جھگڑا بڑھا تو عوفی نے اپنے حلیف (انصار) کو مدد کے لئے پکارا اور غفاری نے مہاجرین کو مدد کے لئے پکارا اور قریب تھا کہ فریقین کے مابین تلواریں کھنچ جاتیں ۵۴ کہ رسول اللہ ﷺ کو خبر ہوئی آپؐ انہوں نے شدید تنبیہ کی کہ یہ کیا جاہلیت کی پکار تھی جو تمہاری زبانوں سے نکل رہی تھی۔ تم اس جاہلیت کی پکار کو چھوڑ دو، یہ بڑی گھناؤنی چیز ہے۔ ۵۵

ایک غفاری اور ایک عوفی حلیف کے اس جھگڑے کو عبداللہ بن ابی نے جو خود بھی عوفی تھا، مہاجر اور غیر مہاجر کا مسئلہ بنا کر فتنہ برپا کرنے کی کوشش کی، اس نے انصار کو یہ کہہ کر برانگیختہ کیا کہ یہ سب کچھ تمہارا اپنا ہی کیا دھرا ہے، تم نے ان لوگوں کو اپنے ملک میں جگہ دی۔ ان پر اپنے مال تقسیم کیے، یہاں تک کہ اب یہ پھل پھول کر خود ہمارے ہی دشمن بن گئے۔ ہماری اور ان قریش کے کنگلوں (اصحاب محمد ﷺ) کی حالت پر وہی مثل صادق آتی ہے کہ

اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کرتا کہ تجھی کو پھاڑ کھائے، تم لوگ ان سے ہاتھ روک لو تو یہ چلتے پھرتے نظر آئیں، خدا کی قسم مدینے پہنچ کر ہم میں سے جو عزت والا ہے (یعنی عبداللہ بن ابی) وہ ذلیل (یعنی حضرت محمد ﷺ) (معاذ اللہ) کو نکال باہر کرے گا۔ ۵۶؎ اس پر سورۂ منافقون کی ساتویں اور آٹھویں آیات نازل ہوئیں۔ ۵۷؎ اسی غزوے سے واپسی پر واقعۂ افک پیش آیا جس میں منافقین نے اہم کردار ادا کیا جس کے تدارک کے لئے سورۂ النور کی آیات (۱۱ تا ۲۱) نازل ہوئیں۔

جنگِ تبوک کے موقع پر بھی انہوں نے مسلمانوں میں بدگمانیاں پھیلائیں، ایک تو وہ قحط کا زمانہ تھا، دوسرے پھل پک رہے تھے اور ہر شخص پھل کی حفاظت اور پکنے پر اس کو اتارنے کا خواہش مند تھا۔ تیسرے گرمی، دھوپ اور لو شدید تھی کہ اس شدید گرمی کے موسم میں جنگ کے لئے نہیں جانا چاہئے۔

وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ط (التوبہ:۸۱) [اور وہ (منافقین) کہتے ہیں کہ اس سخت گرمی میں مت نکلو۔]

اسی گروہ منافقین نے مسجد قبا کے مقابلے میں مسجد ضرار بنائی تھی۔ اس کی بنیادیں اٹھائی ہی اس غرض سے گئی تھیں کہ مسلمانوں میں تفرقہ ڈالیں، یہی وجہ ہے کہ حکم خداوندی کے بموجب رسول اللہ ﷺ نے اسے ڈھا دیا تھا۔ ۵۸؎ پورے عہد رسالت میں منافقوں کا یہ شیوہ رہا کہ وہ مسلمانوں میں فتنہ پھیلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ چونکہ نسلی بنیادوں پر عصبیت کو برانگیختہ کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے، لہٰذا یہ اسی طرز کے فساد پھیلاتے تھے۔

منافقین کے علاوہ مدینہ میں یہودیوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی باوجود اس کے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ میثاقِ مدینہ میں شامل ہو کر بظاہر اُن کے حلیف تھے، مگر وہ بھی منافقوں کی طرح اپنی حاسدانہ چالوں سے باز نہیں آتے تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑا جس نے اوس و خزرج میں عصبیت کی ایسی آگ بھڑکا دی کہ ان کے

مابین تلواریں کھنچ گئیں، حالانکہ یہی اوس وخزرج تھے، جنہیں اسلامی تعلیمات نے ایک رشتۂ اخوت ومودت میں جوڑ رکھا تھا۔ جبکہ اسلام سے قبل یہی اوس وخزرج لڑلڑ کر بدحال ہو چکے تھے۔ اس واقعہ کی رسول اللہ ﷺ کو خبر ہوئی تو آپؐ بہ عجلت موقع پر پہنچے اور اوس وخزرج کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"یہ کس قسم کی جاہلانہ حرکتیں کرتے ہو؟ حالانکہ میں تمہارے اندر موجود ہوں۔ خدا نے تم کو ہدایت کی اور اسلام کی بزرگی بخشی، جاہلیت کی سب باتیں تم سے دور کردیں اور تم میں محبت اور الفت قائم کردی (پھر تم یہ کیا کرتے ہو)؟" ۹۵

رسول اللہ ﷺ کی دردمندانہ ناراضی سے دونوں قبائل اتنے پشیمان ہوئے کہ رو پڑے اور آپس میں ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے لگے۔

بنیادی طور پر یہ نفاق ایک بیماری تھی جس کا شکار عموماً کمزور دل، ضعیف العقیدہ اور کم علم یا پھر سازشی لوگ جلد ہو جاتے تھے۔ اس نوع کے لوگ عہدِ رسالت سے خاص نہیں تھے بلکہ اس قسم کے لوگ ہر معاشرے اور ہر ماحول میں مل جاتے ہیں چنانچہ عہدِ رسالت میں واضح اسلامی تعلیمات کے باوجود جاہلی عصبیت کے مظاہروں کے بہت حد تک ذمہ دار یہی منافقین یا یہود مدینہ تھے، جن کی شرارتوں اور فتنہ انگیزیوں کا بعض اوقات سچے مسلمان بھی نشانہ بن جاتے تھے۔ اس صورت حال سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا مشن ان لوگوں کی وجہ سے کتنا دشوار ہو گیا تھا۔

منافقینِ مدینہ کے علاوہ مسلمانوں کے دو گروہ اور ایسے تھے جن کو بعض سیاسی وسماجی معاملات، عصبیت کے جاہلی مظاہرے پر آمادہ کر لیا کرتے تھے، ان میں پہلا گروہ مؤلفۃ القلوب کا تھا اور دوسرا اعراب کا۔

مؤلفۃ القلوب میں وہ لوگ شامل تھے جن کا اسلام فتحِ مکہ یا اس کے بعد کا ہے۔ جب انہوں نے اچھی طرح یہ محسوس کر لیا کہ اسلام ایک بڑھتی ہوئی سیاسی طاقت ہے اور اس کے دائرۂ اثر میں آئے بغیر کوئی چارہ نہیں تو یہ لوگ بعض سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لئے

مسلمان ہو گئے تھے، مگر ان کا تقویٰ اور ایمان سابقینِ اولین کے مقابلے کا نہیں تھا۔ اس کی طرف قرآن بھی اشارہ کرتا ہے:

لَا يَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ (الحدید:۱۰)

[تم میں سے جو لوگ فتح ۶۰ کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور جہاد کیا۔ ان کا درجہ بعد میں جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے، اگرچہ اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں۔]

اس گروہ میں سے بعض تو آگے چل کر بہترین مسلمان ثابت ہوئے اور مختلف آزمائشوں میں انہوں نے اپنے ایمان کی پختگی ثابت کردی مگر ان میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جن کے حلق سے اسلام پوری طرح اترا ہی نہیں تھا چنانچہ ان کی جب بھی آزمائش ہوئی وہ ناکام ثابت ہوئے۔

مثلاً فتح مکہ کے بعد غزوہ حنین (شوال ۸ھ) کے موقع پر بنو ہوازن کی زبردست تیر اندازی میں جو لوگ رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے، ان میں طلقا ۶۱ کے علاوہ یہی جدید الاسلام افراد تھے۔ ان میں عصبیت کا جذبہ بھی بدرجہ اتم تھا، چنانچہ جب جنگِ حنین میں ابتداً مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی تو صفوان بن امیہ، جو اس وقت تک مشرک تھا، اس کے بھائی نے کہا ''آج سحر باطل ہوگیا!'' یہ گویا مسلمانوں کی شکست پر یک گونہ اظہار مسرت تھا، تو صفوان نے کہا ''چپ رہ، تیرے منہ میں خاک، مجھے یہ پسند ہے کہ کوئی قریشی میرا سردار ہو، بہ نسبت اس کے کہ ہوازن کا کوئی شخص میرا سردار بنے۔'' ۶۲

ان کی دوسری آزمائش اس وقت ہوئی جب غزوہ حنین کی غنائم کی تقسیم کا وقت آیا، ان کے حریصانہ رویے نے ثابت کردیا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔

پھر رسول اللہ ﷺ کی وفات، ان کے لئے ایک اور آزمائش تھی، ان میں سے بیشتر اس آزمائش میں بھی ثابت قدم نہ رہ سکے اور فتنہ ارتداد میں ملوث ہو گئے تاہم مؤلفۃ القلوب میں سارے ہی کمزور ایمان والے نہیں تھے، جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا۔ ان میں سے بہتوں کا اسلام پختہ اور مضبوط ہوا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اکثر اہلِ مکہ نے مرتد ہو کر اسلام سے پھر جانے کا ارادہ کیا، ان کا فتنہ اس قدر بڑھا کہ عاملِ مکہ، عتاب بن اسید ۶۳ لوگوں سے خائف ہو کر رو پوش ہو گئے۔ اس موقع پر سہیل بن عمرو ۶۴ (جو خود بھی مؤلفۃ القلوب میں سے تھے) کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی، پھر رسول اللہ ﷺ کی وفات کا ذکر کیا اور کہا "آپ کی وفات سے اسلام کمزور نہیں ہوا بلکہ اور زیادہ قوی ہو گیا ہے۔ پس جو شخص اسلام میں شک کرے گا ہم اس کی گردن مار دیں گے۔" اس بات کو سن کر لوگ اپنے ارتداد سے باز رہے اور عتاب بن اسید بھی اپنی رو پوشی ختم کر کے ظاہر ہو گئے۔ ۶۵

عتاب بن اُسید اور سہیل بن عمرو کی طرح بہت سے مولفۃ القلوب آزمائش میں ثابت قدم رہے۔ انہی سہیل بن عمرو کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ فتحِ مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے معاذ بن جبل کو اہل مکہ کی تعلیم کے لئے مکہ میں چھوڑ دیا تھا۔ لوگ ان سے قرآن کی تعلیم حاصل کرتے تھے، انہی میں سہیل بن عمرو بھی تھے۔ ضرار بن الخطاب نے ان سے کہا "اے ابو یزید! تم ایک خزرجی کے پاس قرآن سیکھنے جاتے ہو، حالانکہ تمہیں اپنی قوم (یعنی قریش کے فرد) کے پاس جانا چاہئے۔" سہیل بن عمرو نے کہا "انہی باتوں کی وجہ سے ہم پیچھے رہ گئے اور دوسرے ہم سے آگے نکل گئے۔ یہ سب جاہلیت کی باتیں ہیں جن کو اللہ نے اسلام کے ذریعہ ختم کر دیا ہے۔" ۶۶

مسلمانوں کا ایک اور گروہ جن کے بارے میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ خلفائے راشدین اور بنو امیہ کے زمانے میں جاہلانہ عصبیت کا مظاہرہ کرنے کے لئے سب سے بڑے ذمہ دار تھے، اَعراب تھے۔

أعراب کا لفظ دراصل "شتربان بدوی" کے لئے استعمال ہوتا تھا، لیکن اس مفہوم میں نخلستانی باشندے بھی شامل کر لیے جاتے تھے۔ زمانہ قبل از اسلام میں یہ لفظ ان بدویوں اور نخلستانوں کے باشندوں کے لئے استعمال ہوتا تھا جو ربع خالی کے شمال میں آباد تھے۔ قرآن نے أعراب کا لفظ صرف بدویوں کے لئے استعمال کیا ہے اس میں وسطی، شمالی، اور جنوبی عرب کے حضری باشندے شامل نہیں تھے۔ نہ انہوں نے کبھی اپنے آپ کو أعراب کہلوانا پسند کیا۔

اسلام کے سلسلے میں حضری عرب زیادہ بہتر مسلمان ثابت ہوئے تھے، جبکہ اعراب دین میں ایسے مخلص نہ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شہری لوگ عموماً اہل علم اور اہل حق کی صحبت سے مستفید ہو کر دین اور اس کی حدود کو کافی حد تک جان لیتے ہیں مگر بدوی چونکہ ساری عمر بالکل ایک معاشی حیوان کی طرح شب و روز رزق ہی کے پھیر میں پڑے رہتے ہیں اور حیوانی زندگی کی ضروریات سے بلندتر کسی چیز کی طرف توجہ کرنے کا انہیں موقع ہی نہیں ملتا، اس لئے دین اور اس کے حدود سے ان کے ناواقف رہنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ قرآن اسی طرف اشارہ کرتا ہے:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ (الحجرات:۱۴)

[یہ بدوی کہتے ہیں کہ "ہم ایمان لے آئے" ان سے کہو تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ "ہم مطیع ہو گئے" ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔]

یہ أعراب مدینے میں ایک مضبوط اور منظم طاقت کو اٹھتے دیکھ کر پہلے تو مرعوب ہوئے پھر اسلام اور کفر کی آویزشوں کے دوران میں ایک مدت تک موقع شناسی اور ابن الوقتی کی روش پر چلتے رہے، پھر جب اسلامی حکومت کا اقتدار حجاز اور نجد کے ایک بڑے حصے پر چھا گیا اور مخالف قبیلوں کا زور اس کے مقابلے میں ٹوٹنے لگا تو ان لوگوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں لیکن ان میں کم لوگ ایسے تھے جو اس دین کو دین حق سمجھ کر سچے دل سے ایمان لائے ہوں اور مخلصانہ طریقے سے اس کے تقاضوں کو پورا کرنے

پر آمادہ ہوں۔ بیشتر بدویوں کے لئے قبول اسلام کی حیثیت ایمان و اعتقاد کی نہیں بلکہ محض مصلحت اور حکمتِ عملی (Policy) کی تھی۔ اَعراب وہ سارے فوائد تو حاصل کرنا چاہتے تھے جو مقتدر طاقت کے ساتھ الحاق یا وابستگی سے حاصل ہو سکتے تھے۔ مگر اس کے عوض جو اخلاقی بندشیں اسلام ان پر عائد کرتا تھا، یا عبادات کی پابندی جو عائد ہو جاتی تھی یا زکوٰۃ کی وصولی جو اُن کے نخلستانوں اور گلوں سے کی جاتی تھی اور وہ نظم و ضبط اور روحانی و جسمانی تطہیر جس کا تقاضا اسلام ان سے کرتا تھا، وہ ان کو شدت کے ساتھ ناگوار تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی آنکھ بند ہوتے ہی زکوٰۃ اور نماز میں فرق کرنے اور جھوٹے مدعیان نبوت کے گرد جمع ہونے لگے اور عام طور سے ارتداد میں مبتلا ہو گئے۔

یہ اَعراب اسلام سے زیادہ جاہلیت کے نزدیک تھے۔ وہ قبائل عصبیت اور نسلی فخر و غرور، جس کو توڑنے اور کم کرنے پر رسول اللہ ﷺ نے پورا زور صرف کر دیا تھا، ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ جب حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فتنۂ ارتداد سے نبٹنے کے بعد ان کو ملکوں کی عظیم فتح پر لگا دیا تو یہ دور دراز پھیل گئے، ان میں خوشحالی آ گئی، ایمان کی حرارت کم تھی، لہٰذا یہ جلد ہی دنیا میں غرق ہو گئے۔ یہی لوگ تھے جن سے نسلی عصبیت کے مظاہرے ہوتے تھے (اس کی تفصیل آئندہ باب میں آ رہی ہے)۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان محفوظ کیا کہ:

"فخر و تکبر شتر بانوں یعنی اُونی خیموں میں رہنے والوں میں ہے۔"[۲۷]

المختصر عہد رسالت میں اسلامی نفسیات کے ساتھ ساتھ جاہلی نفسیات بھی چلتی رہی اور یوں اسلامی رجحانات اور جاہلی رجحانات کے مابین نزاع برپا رہی تاہم یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اسلام کے اس ابتدائی دور میں اسلامی نفسیات کا جاہلی نفسیات پر نمایاں غلبہ ہو گیا تھا، وہ سماجی مساوات جو رسول اللہ ﷺ قائم کرنا چاہتے تھے، قائم کر دی گئی، ایک ایسی اسلامی حکومت قائم ہو گئی جو بہ زور اپنے عقائد و نظریات کو قائم کر سکتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد امورِ حکومت ایسے تربیت یافتہ اصحاب کے پاس آئے جو خود جاہلی عصبیت سے پاک تھے اور

تقویٰ کے بلند معیار کو پہنچتے تھے، لہٰذا وہ خلفاء بھی جاہلی رسوم و رواج کے خلاف سرگرم عمل رہے اور یوں اسلامی اور جاہلی رجحانات کے درمیان بپا نزاع میں غلبہ اسلام ہی کو حاصل رہا۔

خلاصۂ بحث:

اسلام کی آمد کے ساتھ ہی عرب میں ایک نظریاتی انقلاب آیا اور پورے عربی معاشرے کی قلب ماہیت ہوگئی۔ قرآن کے فلسفۂ اخلاق نے انہیں ایک بالکل مختلف قوم بنا دیا۔ ہجرت مدینہ کے بعد پہلا اسلامی معاشرے اور اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا جو اپنے مزاج، فکر اور اقدار کے حوالے سے عہد جاہلیت کے عربی معاشرے اور قبائلی حکومتوں سے بالکل مختلف تھے۔ جاہلی معاشرے کی بنیاد نسلی عصبی، قبائلی منافرت اور لامرکزیت پر تھی، سماج اَحرار (آزاد و صریح عرب)، موالی (حلیف، آزاد کردہ غلام) اور غلاموں کے طبقات میں بٹا ہوا تھا۔ اس کے برعکس اسلامی معاشرے کی بنیاد، اخوت، عدلِ اجتماعی اور مساوات پر تھی۔ قرآنی تعلیمات کی بنیاد پر مدینے میں جو اسلامی معاشرہ وجود میں آیا اس کی اولین خصوصیت یہ تھی کہ انسانی حاکمیت کی جگہ اللہ کی حاکمیت قائم کر کے سب انسانوں کے لئے عدل و انصاف کی سہولت مہیا کی گئی۔ اس معاشرے کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ رنگ، نسل، قبیلے اور ذات برادری کو ترک کر کے تقویٰ کو معیارِ فضیلت قرار دیا گیا اور تیسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ بنیادی انسانی ضرورتوں میں تمام مسلمانوں کے ساتھ مساویانہ سلوک روا رکھا گیا۔

ان نظریاتی بنیادوں پر اٹھایا جانے والا مدنی معاشرہ ایک عادل اور متوازن معاشرہ تھا۔ جہاں رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانوں میں اسلامی روح کے مطابق قبائلی، نسلی اور وطنی عصبیتوں سے بالاتر ہو کر تمام لوگوں کو برابری کا درجہ عطا کیا گیا۔ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا کہ عہدِ رسالت و خلافت راشدہ میں قبائلی تفاخر کلیتہً ختم ہوگیا تھا، ظاہر ہے جب قبیلہ موجود تھا تو قبائلی عصبیت و تفاخر اس سے وابستہ ایک ایسی نفسیاتی کیفیت تھی جس کا مظاہرہ ہوتا رہتا تھا، البتہ رسول اللہ ﷺ نے اس عصبیت کا رخ ''قبیلے'' سے ''دین'' یا ''امت'' کی طرف

پھیرنے کی کوشش کی تھی، جس میں آپ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے تھے۔

اس نئے اسلامی معاشرے میں سماجی طبقات تو وہی تھے، یعنی مدینے میں صریح، موالی اور غلام کے طبقات تو تھے، لیکن ان کے حقوق و فرائض اس سلیقے سے مرتب کیے گئے کہ ان طبقات کے درمیان پایا جانے والا سماجی تفاوت، مغائرت اور خلیج کم سے کم ہوگئی۔ ان طبقات کے مقابلے میں مدنی معاشرے میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ صرف دو طبقات رہ جائیں، ایک مسلم طبقہ، دوسرا غیر مسلم طبقہ۔ پھر مسلم طبقے کی اگر مزید درجہ بندی کرنی ہو تو وہ قبائلی یا نسلی بنیادوں پر نہیں بلکہ تقویٰ اور سبقت الی الاسلام پر ہو۔ جیسا کہ قرآن نے بعض کو سابقین اولین، بعض کو مولفۃ القلوب اور بعض کو اعراب کا نام دیا ہے۔

اس مسلمہ حقیقت کے باوجود کہ اسلام نے قبائلی مفاخرت اور نسلی تعصب کی جگہ اسلامی اخوت و مساوات پر مبنی ایک معاشرہ مدینے میں قائم کر دیا تھا، عہد رسالت ہی میں فتح مکہ کے بعد جب پورے جزیرۃ العرب میں اسلامی تعلیمات کے نفاذ کا معاملہ درپیش ہوا، اور پورا جزیرۃ العرب اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہوا تو صورت حال ہی بدل گئی کیونکہ مختلف افراد یا گروہوں افراد نے اسلامی تعلیمات کو مختلف پیمانوں پر قبول کیا، لہٰذا عہد رسالت میں جزیرۃ العرب کا معاشرہ ایک ملا جلا معاشرہ تھا، اس معاشرے میں بعض لوگ وہ تھے جنہوں نے پوری آمادگی اور قلب صمیم سے اسلام کی دعوت، ابتدائی سالوں میں ہی قبول کر لی تھی، یہ سابقون اولون تھے، انہیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ رہنا نصیب ہوا، لہٰذا ان کی قلب ماہیت ہوگئی۔ یہ قلیل التعداد لوگ تھے۔

دوسرے وہ لوگ تھے جنہوں نے قدرے تاخیر سے اسلام قبول کیا، رسول اللہ ﷺ کی براہ راست صحبت انہیں قدرے کم نصیب رہی مگر یہ اچھے مسلمان ثابت ہوئے۔ تعداد میں یہ اول الذکر گروہ سے زیادہ تھے۔

تیسرا گروہ وہ تھا جو فتح مکہ کے بعد اسلام لایا صرف اس لیے کہ اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا، اسلام اس وقت کی پھیلتی اور بڑھتی ہوئی سیاسی اور فوجی قوت تھی۔ یہ زیادہ تر اہل

البادیہ تھے، جن کو قرآن ''اعراب'' کا نام دیتا ہے، یہ سب سے کثیر التعداد گروہ تھا، جو اسلام کی حقیقی روح سے کافی حد تک نا آشنا تھا۔

اب اس نئے اسلامی معاشرے میں موالی کی سماجی حیثیت کے تعین کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔ چونکہ باب اوّل میں ہم لفظ موالی کی تحدید کر چکے ہیں اور یہ طے کر چکے ہیں کہ زیر نظر مقالے کی حد تک ہم ''آزاد کردہ غلاموں'' ہی پر بحث جاری رکھیں گے۔ لہٰذا یہ دیکھنا ضروری ٹھہرا کہ غلامی کے بارے میں اسلام کا یہ رویہ کیا تھا۔

بعثتِ محمدیؐ کے وقت عرب اور بیرون عرب دنیا بھر کے معلوم معاشرے غلاموں سے بھرے ہوئے تھے اور ان قوموں کا سارا معاشی و معاشرتی نظام انہی غلاموں کے سہارے چل رہا تھا۔ تاہم اسلام غلامی کو محض ایک اتفاقی حادثہ سمجھتا ہے۔ فطرت کا مستقل انتظام نہیں سمجھتا، اسلام نے حریت کا جو تصور پیش کیا ہے اس کے مطابق آزادی ہر انسان کا مقدس فطری حق تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ عربوں میں غلام بنانے کے جو مروجہ طریقے تھے، اسلام نے ان کو کلیتہً ختم کر دیا تاہم جنگی قیدیوں کی حد تک اس بات کی گنجائش رہ گئی کہ انہیں غلام بنایا جا سکتا تھا۔ جنگ کی صورت میں قیدیوں کو غلام بنالینا ایسا رواج تھا جو اس وقت عرب سمیت تمام اقوام میں رائج تھا۔ اسلام کو یہ گنجائش یا اجازت اسی وجہ سے دینی پڑی کہ جنگ ہمیشہ کم از کم دو قوموں یا ملکوں کے مابین معاملہ ہوتا ہے، ان میں اگر ایک فریق جنگی قیدیوں پر تصرف سے باز آجائے تو دوسرا فریق کھل کھیلے گا اور اپنے حریف کو با آسانی ہلاکت میں ڈال دے گا۔ چونکہ یہ دوطرفہ معاملہ تھا لہٰذا اسلام لا رق فی الاسلام کا یک طرفہ فیصلہ سنا ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس طرح مسلمان تو کبھی کسی جنگی قیدی پر قابض نہ ہوسکتے جب کہ مدمقابل کفار، جنگ کی صورت میں مسلمانوں کو قیدی بنا کر اسلامی ریاست پر زبردست سیاسی، معاشی اور اخلاقی دباؤ بڑھا سکتے تھے۔ دراصل جنگ ''سبب'' تھا اور غلامی اس کا ''نتیجہ''۔ جب تک سبب موجود رہے گا، نتیجہ بھی نکلتا رہے گا۔ غلامی کو یکسر ختم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ سبب (یعنی جنگ) کو ختم کیا جاتا جو عملاً ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اسلام کو غلامی کی یہ شکل مجبوراً اس وقت تک برداشت کرنی پڑے گی

جب تک دشمن اور غیر اقوام اس سلسلے میں ایک ہی لائحہ عمل پر متفق نہ ہو جائیں۔

تاہم عہد جاہلیت کے ثمرے کے طور پر عربی معاشرے میں جو غلام پہلے سے موجود تھے یا جنگوں کی صورت میں جو جنگی قیدی غلام بن گئے تھے، ان کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے ایک طرف تو اسلام نے ان غلاموں کے حقوق متعین کر کے انہیں معاشرے کا سود مند شہری بنانے کی کوشش کی دوسری طرف ان کی آزادی کے لئے بہت سے راستے کھول دیئے۔ قرآن نے غلاموں کو آزاد کرنا ایک انتہائی نیکی کا عمل بتا کر مسلمانوں کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ زیادہ سے زیادہ غلام آزاد کریں۔

دوسری طرف بعض جرائم سرزد ہو جانے کی صورت میں مسلمانوں کو کفارے کے طور پر غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔ اس طرح سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں غلام، صرف عہد رسالت میں آزاد ہوئے۔ یہ آزاد کردہ غلام موالی تھے۔ جو عددی اعتبار سے معاشرے کا ایک بہت بڑا حصہ تھے، ان موالی میں عرب بھی تھے اور غیر عرب بھی۔

عہدِ رسالت میں اسلامی تعلیمات کی وجہ سے پورے معاشرے کی قلب ماہیت ہوگئی تھی۔ غلامی کی بیخ کنی کرنے کی پوری کوشش کی گئی اور اس کے باوجود غلام رہ جانے والوں کا سماجی رتبہ اتنا بڑھا دیا اور انہیں ایسے حقوق عطا کیے کہ فی الواقع غلامی کی شکل بدل گئی۔ جو معاشرہ غلاموں کو ایک مناسب سماجی مقام دینے پر آمادہ ہو، ظاہر ہے اس کا رویہ موالی (آزاد کردہ غلاموں) سے نسبتاً زیادہ بہتر ہوگا۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے متقی اصحاب کا عمل بہترین مثال ہے، جس سے انکار کرنا یا جس کی تردید کرنا غیر مسلم مؤرخین کے لئے بھی آسان نہیں۔

رسول اللہ ﷺ جس طرز کا معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے، اس میں افضلیت کی بنیاد ''تقویٰ'' تھی۔ جو متقی ہے وہ معاشرے کا سب سے افضل شخص ہوگا، خواہ وہ حر ہو یا موالی یا غلام۔ تاہم اس معاشرے کے کچھ گروہ ایسے بھی تھے جو قصداً اس خیر خواہانہ فضا کو مسموم کرتے تھے۔ یہ منافقین مدینہ اور یہود مدینہ تھے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کا ایک اور گروہ جن کے بارے میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ خلفائے راشدین اور بنو امیہ کے زمانے میں جاہلانہ

قبائلی عصبیت کا مظاہرہ کرنے کے سب سے بڑے ذمہ دار تھے، اعراب تھے۔ ان تینوں عوامل کی وجہ سے اسلامی معاشرے کی فضا کبھی کبھی ناگوار ہو جاتی۔ وگرنہ عمومی صورت حال یہ تھی کہ اسلامی معاشرے میں غلاموں کے علاوہ موالی بھی ایک بہتر سماجی مرتبے کے حامل تھے، جس کا تصور عہد جاہلیت میں بہرحال نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہی وہ اسلامی تعلیمات تھیں جنہوں نے آگے چل کر "مسئلہ موالی" کو سلجھانے میں اہم کردار ادا کیا۔



حوالہ جات:

۱۔ الطبقات الکبریٰ، جلد ۴، ص ۷۳۔ سیر اعلام النبلاء، جلد ۲، ص ۳۵۷۔ الاستیعاب، جلد ۱، ص ۷۶۔

۲۔ الطبقات الکبریٰ، جلد ۴، ص ۷۴۔ (الاستیعاب، جلد ۲، ص ۳۶۷، میں یہی بات ذکوان کے حوالے سے کہی گئی ہے۔)

۳۔ البدایہ و النہایہ، جلد ۵، ص ۳۱۸، ۳۱۹۔

۴۔ ابو رافع مولیٰ رسول اللہ ﷺ کے نام میں سخت اختلاف ہے۔ مختلف روایتوں میں ان کا نام ابراہیم، اسلم، ہرمز اور ثابت آیا ہے۔ قبطی (مصری) تھے اور عباس بن عبدالمطلب کے غلام تھے۔ انہوں نے ابو رافع کو رسول اللہ ﷺ کو ہبہ کر دیا تھا۔ جنگ بدر کے بعد ابو رافع نے مدینے کی طرف ہجرت کی اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مقیم ہو گئے احد، خندق اور دیگر مشاہد میں شریک رہے۔ جب ابو رافع نے رسول اللہ ﷺ کو حضرت عباسؓ کے اسلام لانے کی خوشخبری سنائی تو آپؐ نے انہیں آزاد کر دیا۔ ان کی شادی رسول اللہ ﷺ کی مولاۃ سلمیٰ سے ہوئی اور ان کے یہاں عبید اللہ ابن ابی رافع پیدا ہوئے، جو حضرت علی کے دور خلافت میں ان کے خازن اور کاتب تھے۔ ابو رافع کی وفات حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مدینے میں ہوئی (الطبقات الکبریٰ، جلد ۴، ص ۷۳-۷۵) اور بعض کے مطابق کوفے میں ۴۰ھ میں انتقال کیا (الاستیعاب، جلد ۱، ص ۸۳-۸۵، نیز جلد ۴، ص ۱۶۵۶-۷، نیز جلد ۴، ص ۱۸۶۴)۔

۵ الطبقات الکبریٰ، جلد۴، ص ۷۳۔ سیر الاعلام النبلاء، جلد۲، ص ۹ (مادہ: ابورافع)

۶ البدایہ و النہایہ، جلد۵، ص ۳۱۳۔

۷ حضرت سلمان فارسی مولیٰ رسول اللہ ﷺ غزوۂ بدر و احد میں شریک نہیں تھے، کیونکہ عرصہ غلامی میں تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے غزوۂ خندق میں ہی حصہ لیا۔ (المعارف، ص ۱۱۷)۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ہر دس آدمیوں پر چالیس ہاتھ (ذراع) خندق کھودنے کی ذمہ داری لگائی تو مہاجرین وانصار میں سے ہر دو نے چاہا کہ سلمان کو انہیں دے دیا جائے کیونکہ وہ قوی الجثہ اور مضبوط الاعضاء تھے۔ مہاجرین نے کہا سلمان ہم میں سے ہیں۔ انصار نے کہا، نہیں سلمان ہم میں سے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "سلمان ہم اہلِ بیت میں سے ہیں۔" (ابن ہشام، جلد۳، ص ۲۲۴؛ الطبقات الکبریٰ، جلد۴، ص ۸۳؛ ابی الفرج عبدالرحمٰن بن علی بن محمد بن علی ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ)، صفۃ الصفوۃ، جلد۱، ص ۲۱۵؛ دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن، ۱۳۵۵ھ)۔

۸ تفسیر ابن کثیر، جلد۲، ص ۶۳۔

۹ سورۃ الانعام کی سورہ ہے، جو ایک ہی رات کے اندر ایک ہی دفعہ میں نازل ہوئی۔ تفسیر ابن کثیر، جلد۲، ص ۲۵۔

۱۰ "ترش رو ہوا اور بے رخی برتی، اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ تمہیں کیا خبر شاید وہ سدھر جائے نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لئے نافع ہو۔ اور جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو۔ حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے۔ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور ڈر رہا ہوتا ہے، اس سے تم بے رخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں۔ یہ تو ایک نصیحت ہے، جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔" (عبس: ۱-۱۲) (یہ واقعہ ابن ہشام نے بیان کیا ہے، جلد۱، ص ۹۰-۳۸۹)۔

۱۱ Reuben. Levy, *The Social Structure of Islam*, p. 56. (بحوالہ کتاب الاغانی، جلد۱۳، ص ۱۱۰، بولاق، ۱۲۸۵ھ۔)

۱۲ الطبقات الکبریٰ، جلد۱، ص ۷۵، ۷۸؛ تاریخ طبری، جلد۲، ص ۲۵۲۔

۱۳ ڈاکٹر حمید اللہ، رسول اکرم کی سیاسی زندگی، ص ۳۲، دارالاشاعت، کراچی (بار ششم)۔

۱۴ کتاب الازمنہ و الامکنہ، جلد۲، ص ۱۶۵۔

۱۵ رسول اکرم کی سیاسی زندگی، ص ۳۲۔

۱۶ اسیران بدر میں سے چند اہم نام یہ ہیں۔ عقیل بن ابی طالب (بنو ہاشم)، نوفل بن حارث بن عبدالمطلب (بنو ہاشم)، عمرو بن ابی سفیان (بنی عبد شمس)، خالد بن ہشام بن مغیرہ (بنی مخزوم)، ولید بن ولید بن مغیرہ (بنی مخزوم)، سہیل بن عمرو۔ اسیران بدر جو سب کے سب یا تو قریش تھے، یا ان کے حلفاء اور موالی و غلام کی تفصیلی فہرست سیرۃ ابن ہشام میں دیکھی جا سکتی ہے۔ (ابن ہشام کہتے ہیں جنگ بدر میں مشرکین کے علمبردار ابو عزیز کی ماں کو جب ابو عزیز کے قید ہونے کی خبر ہوئی تو اس نے لوگوں سے دریافت کیا کہ ایک "قریشی" مرد کو چھوڑنے کا زیادہ سے زیادہ کیا فدیہ لیا جاتا ہے؟ لوگوں نے کہا چار ہزار درہم۔ چنانچہ اس نے چار ہزار درہم مدینہ بھیج کر ابو عزیز کو چھڑا لیا۔ ابن ہشام، جلد۲، ص ۳۰۰۔)

۱۷ کتاب الاغانی کا مصنف ابو الفرج اصفہانی ۲۸۴ھ بمطابق ۸۹۷ء میں اصفہان (ایران) میں پیدا ہوا۔ نسلاً وہ قریشی عرب تھا، آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کی نسل سے تھا، مسلکاً شیعہ تھا۔ اس نے بغداد میں تعلیم حاصل کی اور اپنی عمر کا زیادہ تر حصہ وہیں گزارا۔ اسے آلِ بُوَیہ کی (بالخصوص ان کے وزیر المہلبی کی، جس کا وہ ندیم تھا) سرپرستی حاصل رہی۔ اس نے ۱۴ ذی الحجہ ۳۵۶ھ بمطابق ۲۰ نومبر ۹۶۷ء کو وفات پائی۔ مرنے سے پہلے وہ دیوانگی میں مبتلا ہوگیا تھا۔ کتاب الاغانی (نغموں کی کتاب) اس کی اہم تصنیف ہے جس میں اس نے وہ سب اصوات یا نغمے یکجا کر دیے ہیں جو معروف مغنیوں ابراہیم موصلی، اسماعیل بن جامع اور فلیح بن العوراء نے خلیفہ ہارون الرشید کے حکم سے منتخب کیے اور جن پر آگے چل کر اسحاق بن ابراہیم موصلی نے نظر ثانی کی تھی۔ ابو الفرج نے اس مجموعے میں معبد اور ابن سریج اور کئی اور گویوں کے علاوہ خلفاء اور ان کے جانشینوں کے نغموں کا بھی اضافہ کیا اور پھر ہر نغمے کے ساتھ اس کی دھن بھی بتائی۔ ابو الفرج نے ان شاعروں کے متعلق جن کے نغمے اس مجموعے میں شامل ہیں، معلومات مہیا کی ہیں اور ان کے کچھ حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کا نمونہ بھی دیا ہے۔ کتاب الاغانی کا پہلا ایڈیشن بولاق سے ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۹ء میں بیس جلدوں میں شائع ہوا۔ دوسرا اور تیسرا ایڈیشن قاہرہ سے بالترتیب ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۶ء میں منظر عام پر آیا۔ تاحال آخری ایڈیشن بیروت سے ۱۹۵۶-۷ء میں چھپا۔ یہی ایڈیشن مجھے اس مقالے کے

لئے دستیاب ہو سکا۔

۱۸ Levy, p. 63.

۱۹ ایضاً، (حاشیہ)۔

۲۰ حسن ابراہیم حسن، النظم الاسلامیہ، ص ۳۱۶۔

۲۱ الاستیعاب، جلد ۳، ص ۱۸۴۹؛ تاریخ طبری، جلد ۲، ص ۵۶۳۔

۲۲ صحیح بخاری، جلد ۵، ص ۱۵، نیز جلد ۶، ص ۱۲۲ (بخاری میں ولید کی بیٹی کا نام ہند آیا ہے)؛ المعارف، ص ۱۱۹؛ الطبقات الکبریٰ، جلد ۳، ص ۸۵؛ الاستیعاب، جلد ۲، ص ۵۶۸، جلد ۴، ص ۱۹۰۱۔

۲۳ الطبقات الکبریٰ، جلد ۳، ص ۴۵، سیر اعلام النبلاء، جلد ۲، ص ۲۰۰؛ صفة الصفوة، جلد ۱، ص ۱۴۹؛ الاستیعاب، جلد ۴، ص ۱۹۵۴، جب جنگِ موتہ میں زید بن حارثہ شہید ہو گئے تو ام کلثوم نے زبیر بن العوام سے شادی کی جس سے ایک بیٹی زینب پیدا ہوئی۔ (زبیر سے طلاق کے بعد) عبدالرحمٰن بن عوف سے نکاح ہوا، جن سے دو بیٹے ابراہیم اور حمید پیدا ہوئے۔ (ابن قتیبہ کے مطابق محمد، ابراہیم، حمید اور زید چار بیٹے عبدالرحمٰن ابن عوف سے پیدا ہوئے۔ کتاب المعارف، ص ۱۰۴)۔ ابن عبدالبر کے مطابق ابراہیم، حمید اور اسماعیل تین بیٹے ام کلثوم سے تھے (الاستیعاب، جلد ۲، ص ۸۴۵)۔ عبدالرحمٰن کے انتقال کے بعد پھر انہوں نے عمرو بن العاص سے نکاح کیا اور انہی کے نکاح میں ام کلثوم کا انتقال ہو گیا۔ (صفة الصفوة، جلد ۲، ص ۳۱، الاستیعاب، جلد ۴، ص ۱۹۵۴)۔

۲۴ ام ایمن جن کا نام برکہ بنت ثعلبہ بن عمرو بن حصن ابن مالک بن سلمہ بن عمرو بن النعمان تھا (الاستیعاب، جلد ۱، ص ۱۲۸)، رسول اللہ ﷺ کے والد عبداللہ کی لونڈی تھیں اور حبشی الاصل تھیں۔ عبداللہ کے انتقال کے بعد وہ ورثے میں رسول اللہ ﷺ کو ملیں۔ آپ ؐ نے ان کو آزاد کر دیا۔ وہ دو ہجرتیں کرنے والوں میں سے تھیں۔ ان کی شادی عبید بن حارث الخزرجی (ابن الجوزی کے مطابق عبید بن زید، جن کا تعلق بنی حارث سے تھا۔ صفة الصفوہ، جلد ۲، ص ۲۹) سے ہوئی، جس سے ایمن پیدا ہوئے۔ انہی پر ان کی کنیت ام ایمن ہے۔ ایمن نے بھی ہجرت کی اور جہاد کیے۔ اس کے بعد ان کی شادی زید بن حارثہ سے ہوئی، جن سے اسامہ

پیدا ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا تھا "کون ایک جنتی خاتون سے شادی کرے گا؟" زید نے ہامی بھری تو یہ نکاح ہوا۔ یہ واقعہ ہجرت سے قبل کا ہے۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد ۱، ص ۴۹۷؛ المعارف، ص ۶۳، سیر اعلام النبلاء، جلد ۲، ص ۶۰-۶۱؛ الاستیعاب، جلد ۳، ص ۱۷۹۳۔) زید بن حارثہ کی بیویوں کی تفصیل الطبقات الکبریٰ، جلد ۳، ص ۴۵ پر دی گئی ہے۔

۲۵ حضرت بلال حبشی، امیہ بن خلف کے غلام تھے، مکہ میں قبیلہ بنو جمح کے درمیان مقام سراۃ میں غلام پیدا ہوئے۔ ان کی ماں کا نام حمامہ تھا، لہٰذا انہیں بعض دفعہ ابن حمامہ بھی کہا گیا۔ وہ سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے تھے، جس کی وجہ سے ان کا آقا ان پر بدترین مظالم ڈھاتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پانچ یا سات اوقیہ (تقریباً ۲۳ تولے سونے) کے عوض انہیں خرید کر آزاد کردیا تھا۔ مکے میں رسول اللہ ﷺ نے ان کی مواخاۃ عبیدہ بن حارث بن مطلب سے کرائی تھی۔ ہجرت کے بعد آپؐ نے ان کے اور ابورویحہ خثعمی کے درمیان رشتہ مواخاۃ قائم کیا تھا۔ عہد رسالت میں مسجد نبوی کے موذن بھی تھے اور رسول اللہ ﷺ کے خاندانی اخراجات کے نگران بھی۔ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد شام جا کر آباد ہوگئے اور وہیں ۲۰ھ میں ساٹھ سال سے زائد عمر میں وفات پائی۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد ۳، ص ۲۳۲ تا ۲۳۶؛ المعارف، ص ۷۶؛ صفۃ الصفوۃ، جلد ۱، ص ۱۷۱ تا ۱۷۳؛ الاستیعاب، جلد ۱، ص ۹-۱۷۸۔)

۲۶ الطبقات الکبریٰ، جلد ۳، ص ۲۳۷۔

۲۷ جمہرۃ انساب العرب، ص ۱۷۸۔ (فاطمہ بنت قیس کو جب ان کے پہلے شوہر نے طلاق دے دی اور انہوں نے اپنی عدت پوری کرلی تو نکاح ثانی کے لئے رسول اللہ ﷺ سے مشورہ طلب کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا کسی نے تمہیں پیغام دیا ہے۔ انہوں نے کہا معاویہ نے، ابوجہم نے اور اسامہ نے۔ رسول اللہ ﷺ نے جواباً فرمایا کہ ابوجہم مزاجاً سخت آدمی ہیں، معاویہ کے پاس پیسہ کم ہے البتہ تم اسامہ سے نکاح کرلو۔ فاطمہ بنت قیس، جو قریش کے اشراف سے تعلق رکھتی تھیں، ایک مولیٰ سے شادی پر راضی ہوگئیں۔ (سیر الاعلام النبلاء، جلد ۲، ص ۳۵۹)

۲۸ الطبقات الکبریٰ، جلد ۳، ص ۴۲، نیز جلد ۵، ص ۱۷۰ (جب اسامہ نے انہیں طلاق دے دی تو

رسول اللہﷺ نے ان کا نکاح نعیم بن عبداللہ النحام سے کرادیا۔ (الاستیعاب، جلد ۴، ص۱۸۵۳)

۲۹ ترجمہ: لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔ (الحجرات:۱۳)

۳۰ کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملے میں فیصلہ کردے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔ (الاحزاب:۳۶)

۳۱ گب مزید کہتا ہے "افریقہ، ہندوستان اور انڈونیشیا کے عظیم اور جاپان کے محدود مسلم معاشرے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ کس طرح اسلام مختلف نسلوں اور روایات، نہ مٹنے والے اختلافات کو تحلیل کردیتا ہے، اگر مشرق و مغرب کے عظیم معاشروں میں مخالفت کی بجائے باہمی تعاون پیدا کرنا ہے تو اس کے لئے اسلام کی خدمات حاصل کرنا لازمی ہوگا۔ (ایچ۔ اے۔ آر گب، *Whither Islam*، لندن، ۱۹۳۲ء، ص۳۷۹۔)

۳۲ جواہر لعل نہرو، *Discovery of India*، کلکتہ، ۱۹۴۶ء، ص ۲۲۵۔

۳۳ ڈاکٹر تارا چند، *Society and State in the Mughal Period*، ۱۹۶۱ء، ص ۸۸-۸۹۔

۳۴ اے۔ جے۔ ٹائن بی، *Civilization on Trial*، نیویارک، ۱۹۴۸ء، ص ۲۰۵۔

۳۵ سروجنی نائیڈو، *Speeches & Writings of Sarojini Naidu*، مدراس، ۱۹۱۸ء۔

۳۶ مالکم ایکس، *The Autobiography of Malcolm-X (Essex)*، ۱۹۶۵ء، ص ۳۱۹-۳۲۰۔

۳۷ صحیح بخاری کی حدیث ہے "ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ سالم مولیٰ ابوحذیفہ مہاجرین اولین کی امامت قبا میں کیا کرتے تھے درآں حالیکہ اصحاب رسول موجود ہوتے تھے۔ ان میں ابوبکرؓ، عمرؓ، ابوسلمہؓ، زیدؓ اور عامرؓ بن ربیعہ بھی ہوتے تھے۔ (صحیح بخاری، جلد ۸، ص ۱۱۵) اس میں حضرت ابوبکر کا نام غالباً سہواً آ گیا ہے کیونکہ حضرت ابوبکرؓ نے ہجرت رسول اللہﷺ کے ساتھ کی تھی، ان دونوں کی آمد سے قبل قبا میں حضرت سالمؓ مہاجرین اولین کی امامت کیا کرتے تھے۔

ابن سعد مقتدیوں میں حضرت عمرؓ اور ابوسلمہ کا نام لیتے ہیں۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد۳، ص ۸۸)

۳۸ دوسرے صاحب سے مراد عبداللہ بن حفص بن غانم تھے۔ جن کے پاس علم تھا اور جن کی وفات کے بعد یہ علم سالم کو دیا گیا۔ (تاریخ طبری، جلد۳، ص ۲-۲۹۱)

۳۹ صحیح بخاری، جلد۴، ص ۲۱۷؛ الطبقات الکبریٰ، جلد۳، ص ۲۳۳۔

۴۰ ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری، اصح السیر، (اصح المطابع، کراچی) ص ۶۰۷۔

۴۱ طبری، جلد۲، ص ۵۲۶، ۵۶۸؛ الطبقات الکبریٰ، جلد۳، ص ۸۳؛ صفۃ الصفوۃ، جلد۱، ص ۲۱۵۔

۴۲ تفسیر ابن کثیر، جلد۳، ص ۲۵۲ (سورۃ احزاب، بحوالہ مسند احمد) علامہ ابوالعباس محمد بن یزید المعروف بالمبرد النحوی (م ۲۸۵ھ)، الکامل فی اللغۃ و الادب، جلد۲، ص ۲۵۷، ۲۵۸۔ (یہ بات الطبقات الکبریٰ، جلد۳، ص ۳۶ پر یوں لکھی ہوئی ہے، حضرت عائشہؓ نے کہا "رسول اللہ ﷺ نے زید کو جب بھی بھیجا امیر لشکر بنا کر بھیجا اور اگر وہ آپ کے بعد مدینے میں رہ گئے تو آپ کے نائب کے طور پر رہے۔") زید بن حارثہ، جمادی الآخرہ ۳ھ، ربیع الاول ۶ھ، جمادی الاولیٰ ۶ھ، جمادی الآخرہ ۶ھ میں دو مرتبہ، رجب ۶ھ، رمضان ۶ھ اور جمادی الاولیٰ ۸ھ میں بھیجے جانے والے سرایا کے امیر لشکر تھے، آخری سریہ موتہ میں آپ شہید ہو گئے۔

۴۳ الطبقات الکبریٰ، جلد۳، ص ۴۳۔

۴۴ حضرت اسامہ کے لشکر میں شامل اصحاب میں حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ، ابوعبیدہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، سعیدؓ، سلمہؓ بن اسلم اور قتادہؓ بن نعمان بھی شامل تھے۔ یہ واقدی، ابن عساکر اور ابن سعد کی روایت ہے، لیکن ابن تیمیہ نے اس سریہ میں حضرت ابوبکرؓ کی شرکت سے بشدت انکار کیا ہے۔ کیونکہ حضرت ابوبکر کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیماری میں امامت نماز کے لئے امام مقرر کیا تھا۔ علامہ زرقانی کہتے ہیں کہ ان دونوں امور میں کوئی بعد نہیں، ابتداً رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق کو بھی اس سریہ میں شرکت کا حکم دیا، لیکن جب بیمار ہوئے اور مرض بڑھ گیا تب ان کو نماز کی امامت کا حکم دیا۔ جس کی وجہ سے سریہ کی شرکت سے ان کا استثناء ہو گیا۔ (اصح السیر،

ص ۵۲۵)

۲۵ صحیح بخاری، جلد ۲، ص ۲۱۳، نیز جلد ۵، ص ۸۳، ۱۲۵۔ الطبقات الکبریٰ، جلد ۴، ص ۶۵۔ (طبقات میں ان جملوں کا اضافہ ہے "ان دونوں سے ہر خیر کا گمان کیا گیا ہے، تم لوگ اسامہ کے متعلق خیر کی وصیت قبول کرو کیونکہ وہ تمہارے بہترین لوگوں میں سے ہیں۔" الطبقات الکبریٰ، جلد ۴، ص ۶۶، ۶۷، ۶۸۔ تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۱۸۴۔ الکامل للمبرد، جلد ۲، ص ۲۵۷۔ صفۃ الصفوۃ، جلد ۱، ص ۲۱۰۔)

۲۶ واقعہ یہ تھا کہ ایک دفعہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے اپنے عجمی الاصل غلام کو اس کی عجمی ماں کی وجہ سے عار دلائی۔ اس غلام نے جا کر رسول اللہ ﷺ نے شکایت کر دی، رسول اللہ ﷺ نے ابو ذر سے فرمایا "تم ایسے شخص ہو جس میں زمانہ جاہلیت کی عادات باقی ہیں۔ یہ تمہارے بھائی اور تمہارے خادم ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارے ماتحت کر دیا ہے۔ پس جس شخص کے ماتحت اس کا بھائی ہو، وہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھاتا ہو اور وہی پہنائے جو خود پہنتا ہو اور ان کو ایسے کام پر مجبور نہ کرو جو ان کے لئے دشوار ہو اور اگر ان کو ایسے کام کے لئے کہو تو اس میں ان کی مدد کرو۔" (صحیح مسلم، جز ثالث، ص ۳-۱۲۸۲، کتاب الایمان) اس تنبیہ پر ابوذر نے اپنی اصلاح کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابوذر اس غلام کو وہی کھلاتے اور پہناتے تھے جو وہ خود کھاتے اور پہنتے تھے۔

۲۷ صہیب ابن سنان رومی، نمر بن قاسط کی اولاد میں سے تھے۔ ان کے والد سنان بن مالک یا چچا کسریٰ کے ابلہ میں عامل تھے۔ صہیب روم میں کسی طرح غلام بنا لیے گئے۔ ان کو بنو کلب نے خرید کر کے مکے میں عبداللہ ابن جدعان کو بیچ دیا۔ عبداللہ نے انہیں آزاد کر دیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ مکے آئے تو ابن جدعان کے حلیف بن گئے۔ (الاستیعاب، جلد ۲، ص ۷۲۸) قدیم الاسلام تھے اور اسلام کی راہ میں شدید سختیاں برداشت کی تھیں۔ ہجرت کے بعد بدر، احد، خندق اور تمام مشاہد میں شریک رہے۔ حمران بن ابان مولیٰ عثمان بن عفان کے چچا زاد بھائی تھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے انتقال پر ان کو نماز کی امامت پر مامور کیا تھا۔ ستر سال سے زائد عمر میں ۳۸ھ میں مدینے میں انتقال کیا اور بقیع میں دفن ہوئے۔ (المعارف، ص ۱۱۴-۱۱۵؛ الطبقات الکبریٰ، جلد ۳، ص ۹-۲۲۶؛ الاستیعاب، جلد ۲، ص ۷۲۶ تا ۷۳۳؛ صفۃ

الصفوۃ، جلد ا، ص ۰۷-۱۶۹؛ سیر الاعلام النبلاء، جلد ۲، ص ۱۰-۱۶۔)

۴۸ الاستیعاب، جلد ۲، ص ۶۲۷، نیز ۷۳۳۔ سیر الاعلام النبلاء، جلد ۲، ص ۱۵ (مادہ: صہیب ابن سنان)۔

۴۹ یوم بعاث، اوس و خزرج کے مابین لڑی جانے والی مشہور جنگ ہے جو بعثت نبوی سے قبل لڑی گئی۔ ان دنوں بنو خزرج کا سردار عمرو بن نعمان تھا اور بنو اوس کا سردار حضیر الکتائب بن سماک تھا۔ اس جنگ میں بنو اشجع (قبیلہ غطفان سے) اور بنو جہینہ (قبیلہ قضاعہ سے) بنو خزرج کے حلیف تھے۔ جبکہ بنو قریظہ، بنو نضیر اور مزینہ، اوس کے حلیف تھے۔ یہ جنگ سالوں چلی جس نے اوس و خزرج کے کس بل نکال دیے۔

۵۰ ابن ہشام، جلد ۲، ص ۲۳۴۔

۵۱ ابن ہشام، جلد ۲، ص ۶۴؛ طبری، جلد ۲، ص ۳-۵۰۴۔

۵۲ ابن ہشام، جلد ۲، ص ۱۷۳۔ اس خفیہ ساز باز کا راز سورہ حشر میں کھول دیا گیا۔ "تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنہوں نے منافقت کی روش اختیار کی ہے۔ یہ اپنے کافر اہل کتاب بھائیوں سے کہتے ہیں اگر تمہیں نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے، اور تمہارے معاملہ میں ہم کسی کی بات ہرگز نہ مانیں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے، مگر اللہ گواہ ہے کہ یہ لوگ قطعی جھوٹے ہیں۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ ہرگز نہ نکلیں گے اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی ہرگز مدد نہ کریں گے اور اگر یہ ان کی مدد کریں بھی تو پیٹھ پھیر جائیں اور پھر کہیں سے کوئی مدد نہ پائیں گے۔ ان کے دلوں میں اللہ سے بڑھ کر تمہارا خوف ہے کیونکہ یہ ایسے لوگ ہیں جو کچھ بوجھ نہیں رکھتے۔" (الحشر: ۱۱-۱۳)

۵۳ دونوں اصحاب کے نام مختلف روایات میں مختلف بیان کیے گئے ہیں۔ ہم نے یہ نام ابن ہشام کی روایت سے لیے ہیں۔ (ابن ہشام، جلد ۳، ص ۲۹۰) ابن عبدالبر نے بھی یہی نام اختیار کیے ہیں۔ (الاستیعاب، جلد ا، ص ۲۶۸، نیز جلد ۲، ص ۶۵۶)۔

۵۴ تاریخ طبری، جلد ۲، ص ۶۰۵؛ الاستیعاب، جلد ۲، ص ۶۵۶-۶۵۷۔

۵۵ صحیح بخاری، جلد ۳، ص ۱۶۰، نیز جلد ۶، ص ۶۵، ۶۶۔

۵۶ طبری، جلد ۲، ص ۶۰۵؛ الاستیعاب، جلد ا، ص ۲۶۸؛ الطبقات الکبریٰ، جلد ۲، ص ۶۴۔

۵۷ ''یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسولؐ کے ساتھیوں پر خرچ کرنا بند کردو تاکہ یہ منتشر ہو جائیں، حالانکہ زمین اور آسمان کے خزانوں کا مالک اللہ ہی ہے مگر یہ منافق سمجھتے نہیں ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم مدینہ واپس پہنچ جائیں تو جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے گا، حالانکہ عزت تو اللہ، رسول اور مومنوں کے لئے ہے۔'' (المنافقون: ۷-۸)

۵۸ ''اور (منافقوں میں سے وہ لوگ بھی ہیں) جنہوں نے اس غرض سے ایک مسجد بنا کر کھڑی کی کہ (مسلمانوں کو) نقصان پہنچائیں اور کفر کریں اور مومنوں میں تفرقہ ڈالیں اور ان لوگوں کے لئے ایک کمین گاہ پیدا کردیں جو اس سے قبل اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے لڑ چکے ہیں، وہ (منافق) ضرور قسمیں کھائیں گے کہ (مسجد بنانے سے) ہمارا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ بھلائی کا کام ہو، لیکن اللہ اس بات پر گواہ ہے کہ یہ (منافق) اپنی قسموں میں قطعاً جھوٹے ہیں۔'' (التوبہ: ۱۰۷)

۵۹ ابن ہشام، جلد ۲، ص ۳۰۲۔

۶۰ بعض روایتوں میں یہاں ''فتح'' سے مراد صلح حدیبیہ کو بیان کیا گیا ہے، تاہم اکثر روایات کے مطابق یہاں فتح سے مراد فتح مکہ ہے (جامع البیان عن تاویل آی القرآن (تفسیر طبری) از ابوجعفر محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) الجزء السابع والعشرون (جلد ۲۷)، ص ۲۲۰، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۴ء، مصطفیٰ بابی حلبی، مصر)۔

۶۱ طلقاء سے مراد مکہ کے وہ خاندان یا افراد ہیں جو آخر وقت تک دعوت اسلامی کے مخالف رہے۔ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے انہیں معافی دے دی اور وہ اسلام میں داخل ہوئے، تاہم ان میں سے بعض غزوۂ حنین تک بھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔

۶۲ علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون، کتاب العبر (تاریخ ابن خلدون)، جلد ۳، ص ۳، مصر۔

۶۳ عتاب بن اُسید بن ابی العیص ابن امیہ بن عبد شمس القرشی الاموی، کی کنیت ابوعبدالرحمٰن یا ابومحمد تھی۔ یہ فتح مکہ کے دن اسلام لائے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں مکہ کا عامل مقرر کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں ان کے عہدے پر برقرار رکھا۔ عتاب ابن اسید اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتقال ایک ہی دن ہوا۔ عتاب بہت صالح اور فاضل شخص تھے۔ (الاستیعاب، جلد ۳، ص ۱۰۲۳-۴)۔

۶۴ سہیل بن عمرو بن عبد شمس بن عبد ود بن نصر بن مالک بن حسل بن عامر بن لؤی کی کنیت ابویزید تھی۔ عہد جاہلیہ میں یہ اشراف قریش میں شمار ہوتے تھے۔ ام المومنین حضرت سودہ کے پہلے شوہر سکران بن عمرو کے (جو قدیم الاسلام اور مہاجرین حبشہ میں سے تھے) بھائی تھے (المعارف، ص ۱۲۳)۔ خطیب قریش تھے، جنگِ بدر میں قریشِ مکہ کی طرف سے شرکت کی اور گرفتار ہوئے۔ صلح حدیبیہ میں قریش مکہ کی طرف سے اہم کردار ادا کیا۔ اسی دوران ان کا بیٹا ابوجندل مسلمان ہوگیا۔ مگر سہیل بن عمرو نے اسے مسلمانوں کے ساتھ مدینے نہ جانے دیا۔ فتح مکہ کے بعد اپنے شرک پر قائم رہنے کے باوجود جنگ حنین میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے شریک ہوئے۔ جعرانہ میں اسلام لائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس دن غنائم کی تقسیم کرتے ہوئے سہیل کو اونٹ عطا کیے۔ مولفۃ القلوب میں سے تھے، لیکن ان کا اسلام بہت اچھا تھا، فتنۂ ارتداد میں یہ مضبوطی سے اسلام پر قائم رہے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ نے چند احادیث روایت کی ہیں۔ شام کی فتوحات میں شریک رہے، پھر ۱۸ھ کے عمواس کے طاعون میں شام میں وفات پا گئے۔ (الطبقات الکبری، جلد ۵، ص ۳۵۳؛ جمھرۃ انساب العرب، ص ۱۶۶، جلد ۳، ص ۱۶۶؛ الاستیعاب، جلد ۲، ص ۶۶۹-۶۷۲۔)

۶۵ ابن ہشام، جلد ۳، ص ۲۲۶؛ صفۃ الصفوۃ، جلد ۱، ص ۸-۳۰۷۔

۶۶ ایضاً۔

۶۷ صحیح بخاری، جلد ۳، ص ۱۵۳۔



باب چہارم

موالی: عہد خلافت راشدہ میں

عہد خلافت راشدہ میں لفظ "مولیٰ" کے مفہوم نے وسعت اختیار کی اور تمدنی طور پر ہونے والی عظیم تبدیلیوں کے نتیجے میں موالی کی سماجی حیثیت میں بھی تغیر آیا۔ فتوحات اسلامی کے نتیجے میں غیر عرب خصوصاً عجمی موالی کا نیا عنصر معاشرے میں شامل ہوا۔ مولیٰ کی اس نئی قسم کو ہم "مولی الاسلام" کا نام دیں گے۔ نیز اسی عہدِ خلافت راشدہ میں عرب "موالی" کی قسم سے خارج ہو گئے کیونکہ اس بات پر پابندی لگا دی گئی کہ عربوں کو نہ تو غلام بنایا جا سکتا ہے نہ ذمی۔ یوں جو نئی معاشرتی طبقہ بندی سامنے آئی، وہ عرب، موالی اور غلام کی تھی۔

معاشرے کو عہد رسالت کے نظریات سے قریب تر رکھنے کے لئے خلفائے راشدین نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا، فتوحات کے نتیجے میں آنے والے تیز رفتار تمدنی تغیر نے حالات میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر دی، جس کے نتائج حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری سالوں میں ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔

جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو مدینہ کی اسلامی حکومت کا دائرہ جزیرۃ العرب تک ہی محدود تھا، البتہ ہمسایہ اقوام کو اسلام کی دعوت دی جا چکی تھی اور ان کے ساتھ سرحدی جھڑپوں کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں فتوحات ملکی کے عظیم سلسلے کا آغاز ہوا جو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد تک جاری رہا، جس کے نتیجے میں عراق،

ایران، شام اور مصر مکمل طور پر فتح ہو گئے۔ ساسانی بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا۔ رومیوں کو سمٹنے پر مجبور ہونا پڑا اور اسلامی حکومت کا جھنڈا دو عظیم براعظموں پر لہرانے لگا، ان عظیم فتوحات کے نتیجے میں نہ صرف ایک وسیع رقبہ مملکتِ اسلامیہ کا جز بنا بلکہ لاکھوں افراد اسلامی ریاست کے شہری بنے جن کا تعلق مختلف قومیتوں اور مختلف تہذیبوں سے تھا۔ ان میں ایرانی عنصر سب سے زیادہ نمایاں اور قوی تھا۔ لہٰذا ذیل میں عراق و ایران کے حوالے سے اسی نئے عنصر پر روشنی ڈالی جائے گی۔

ساسانیوں کا پایۂ تخت مدائن تھا جو عراق کا ایک شاندار شہر تھا۔ عراق، دجلہ و فرات کی وادی میں جنوبی حصے کی جانب واقع ہے۔ جس کی زمین سرسبز و زرخیز، پانی بکثرت اور فضا معتدل ہے۔ یہ علاقہ آبادی اور مدنیت میں روئے زمین پر خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ پرانے زمانے میں بھی قریب تین ہزار سال قبل مسیح سے لے کر پے در پے متمدن قومیں اسی حصۂ زمین پر حکمران رہیں بابلی، اشوری، کلدانی، یونانی اور ایرانی تمام قوموں نے عراق میں مختلف سلطنتیں قائم کیں۔ پرانے زمانے میں عرب بھی اس سرزمین سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ بکر اور تغلب نے، جو ربیعہ کے قبائل تھے، اس سرزمین پر قدم رکھا اور مشہور لخمی قبیلے نے یہاں اپنی حکومت قائم کرلی۔ یہ حیرہ میں مناذرہ کی حکومت کہلاتی تھی، جس کا تذکرہ باب دوم میں ہو چکا ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں عراق کی فتح کے بعد یہاں بصرہ اور کوفہ کی چھاؤنیاں بسائی گئیں جو بہت جلد دو عظیم شہروں کی شکل اختیار کر گئیں۔ مدائن اور بابل و حیرہ کا تمدن یہاں منتقل ہو گیا اور چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ نے جب کوفہ کو اپنا دارالخلافہ بنایا تو ان شہروں کی عظمت کو چار چاند لگ گئے۔

۱۴ھ/ ۶۳۵ء میں حضرت عمرؓ کی ہدایت پر عراق میں بصرہ کی پہلی فوجی چھاؤنی قائم کی گئی۔ جس کے بنیادی مقاصد میں ایک تو یہ تھا کہ عراق، خلیج فارس اور ایران کے راستوں کی نگرانی کی جا سکے، اس کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ آئندہ فرات و دجلہ کے مشرق کی طرف شروع ہونے والی مہمات کے لئے یہ شہر نقطۂ آغاز بن سکے، نیز اس چھاؤنی کو آباد کرنے کی ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ عرب صحرا کی آب و ہوا سے متمتع ہوتے رہیں۔

بصرہ کے ابتدائی آباد کار عرب فوجی تھے، جنہوں نے جنگ نہاوند (۲۱ھ/ ۶۴۲ء) نیز اصطخر، فارس، خراسان، بجستان کی تسخیر (۲۹ھ/ ۶۵۰ء) میں حصہ لیا جس سے ایک طرف تو مال غنیمت کی صورت میں شہر بصرہ میں خوشحالی آئی دوسری طرف غلاموں اور موالی کی تعداد میں بھی معتدبہ اضافہ ہوا، گوکہ یہ اضافہ کوفہ کے مقابلے میں بہت کم تھا۔

سب سے پہلے بصرہ میں وہ دو ہزار سپاہی آباد ہوئے جو جنگ قادسیہ میں شریک تھے، پھر حضرت عتبہ بن غزوان کے ساتھ پانچ ہزار افراد مزید آئے[۳] اس کے بعد یہ تعداد مسلسل بڑھتی رہی۔ جلد ہی بصرہ پانچ قبائلی حلقوں میں تقسیم ہوگیا:

۱۔ اہل العالیہ: یعنی حجاز کے بالائی علاقوں کے باشندے۔
۲۔ بنوتمیم: مُضری قبائل میں انہیں اولین درجہ حاصل ہے۔
۳۔ بنوبکر بن وائل: یکے از قبائلِ ربیعہ۔
۴۔ بنوعبدالقیس: یکے از قبائل ربیعہ۔
۵۔ بنوازد: یمنی قبیلہ (ازدسراۃ وازدعُمان)۔

ان میں بنوازد یمنی تھے باقی سب عدنانی قبائل تھے، بصرہ کے فوجیوں کا طبقہ انہی عرب عناصر سے مرکب تھا۔ اس کے مقابلے میں موالی بہت کم تھے۔ ان موالی میں عراق کے اصل باشندے اور باہر سے آئے ہوئے گروہ مثلاً ایرانی، ہندی، سندھی اور زنجی وغیرہ شامل تھے۔ انہوں نے مختلف قبائل سے عقدِ مُوالات کے تحت تعلق جوڑ لیا تھا، جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے آقاؤں کے تنازعات کو بھی اپنا لیا تھا۔

عراق میں آباد ہونے والا دوسرا شہر کوفہ تھا، جس کی بنیاد حضرت عمرؓ کے زمانے میں، انہی کے حکم پر حضرت سعد بن ابی وقاص نے ۱۷ھ/ ۶۳۸ء میں رکھی تھی۔ یہ شہر دریائے فرات کے مغربی کنارے پر ایک وسیع میدان کے بہت بڑے رقبے پر آباد کیا گیا تھا تاکہ دارالخلافہ مدینے تک نقل وحمل میں طبعی رکاوٹیں اثر انداز نہ ہوسکیں، اس شہر کو بسانے کا خاص مقصد یہ تھا کہ عربوں کو ایک مضبوط اور دفاعی اعتبار سے ایک مستحکم چھاؤنی حاصل ہوسکے اور نئے مفتوحہ

صوبوں کے لوگوں کو آسانی سے قابو میں رکھا جا سکے۔

لفظ ''کوفہ'' کے عام معنی ہیں ''ریت کا گول ٹیلا''، اس نام سے پتا چلتا ہے کہ شہر کا قدیم ترین حصہ اسی نوع کی بلندی پر بسایا گیا ہوگا۔ کوفہ کا محل وقوع بصرہ سے زیادہ صحت افزا سمجھا جاتا تھا۔ عرب جوں جوں مشرق کی طرف بڑھتے گئے، کوفہ کی اہمیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی اعتبار سے یہاں کی آبادی بھی تیزی سے بڑھنے لگی۔ کوفہ میں چالیس ہزار خاندانوں کی آبادکاری کی گنجائش تھی۔ ہر قبیلے کے آباد ہونے کے لئے الگ الگ حد بندی کر دی گئی تھی۔ ابتداً کوفے کے دو حصے کیے گئے، ایک مشرقی حصہ تھا جو بہترین تھا اور دوسرا مغربی حصہ تھا۔ اس کے بعد قرعہ اندازی کی گئی۔ مشرقی حصہ اہل یمن کے حصے میں آیا اور مغربی حصہ نزاریوں کے۔ کوفہ میں یمن کے لوگ نزاریوں کے مقابلے میں زیادہ تھے۔ چنانچہ یمنی بارہ ہزار اور نزاری آٹھ ہزار تھے۔ جو قبائل کوفہ میں آباد ہوئے، ان میں بنو سُلیم، بنو ثقیف، بنو ہمدان، بنو بجیلہ، بنو تیم اللات، بنی تغلب، بنی اسد، بنو کندہ، بنو ازد، بنو مزینہ، بنو تمیم، بنو عارب اور بنو مذحج وغیرہ شامل تھے۔

کوفہ کی آبادی کے عناصر میں عرب فوجیوں کے علاوہ سوداگر، کاریگر اور دوسرے مزدور بڑی تعداد میں آ کر آباد ہوئے، جن میں سے بیشتر ایرانی النسل تھے۔ اس کے علاوہ جہاد کے معرکوں میں مال غنیمت کے ساتھ تقسیم ہونے والے لونڈی اور غلام اپنے مالکوں سمیت کوفہ میں بس رہے تھے جن سے ایک نئی نسل پیدا ہو رہی تھی۔ آزاد ایرانیوں نے بھی عربوں سے عقد ولاء کر کے کوفہ کے شہر میں بسنا شروع کر دیا تھا۔ یہ موالی کہلائے، کوفہ میں ان کی خاصی بڑی تعداد آباد تھی۔ یہ ایرانی موالی اپنی ایک مخصوص تہذیب رکھتے تھے۔ ساسانیوں کے دور عروج کا تمدن کتنا ہی شاندار رہا ہو مگر دور زوال کا تمدن کبھی بھی قابل تقلید نہیں ہوتا لہٰذا ایرانی موالی اپنی تمدنی خامیوں کے ساتھ اسلام میں داخل ہو گئے۔ مسلمان ہونے والے ایرانیوں کی ایمانی کیفیت بھی دو طرح کی تھی، کچھ تو وہ تھے جنہوں نے صمیم قلب کے ساتھ اسلام قبول کر لیا تھا، تاہم زیادہ تر ایسے تھے جن کا اسلام ''اعراب'' کے اسلام سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔

کوفہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہی خاصی ترقی کر گیا تھا۔ یہاں تین سو "اصحاب الشجرہ" (یعنی وہ اصحاب جنہوں نے بیعت رضوان میں شرکت کی تھی) اور ستر بدری صحابی آئے۔ تاہم اکثریت "اعراب" کی تھی، جو اپنی سابقہ قبائلی و نسلی عصبیتوں کے ساتھ آکر آباد ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے کوفہ جلد ہی قریشی، غیر قریشی تصادم میں الجھ گیا۔ یہ بحران حضرت عثمانؓ کے دور میں شروع ہو چکا تھا۔ جس کا اندازہ گورنر کوفہ، سعید بن العاص کے خط، بنام حضرت عثمانؓ سے ہوسکتا ہے، انہوں نے اہل کوفہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا:

"اہل کوفہ کے معاملات خراب ہو گئے ہیں، قدیم اور شریف خاندان مغلوب ہو گئے ہیں۔ بعد میں آنے والے لوگ اور اعراب، یہاں کے معاملات پر غالب آگئے ہیں، یہاں تک کہ شرفاء اور بہادر اشخاص کو کوئی نہیں پوچھتا۔"[۴]

اہل کوفہ ابتداء سے ہی تلون المزاجی کا مظاہرہ کرتے رہے، ان کی اکثریت، ناقابل اعتبار تھی۔ حضرت عمرؓ بھی ان سے شاکی تھے۔ یہ لوگ خلیفہ کے مقرر کردہ عمال سے جلد ہی اکتا جاتے اور ان کی شکایتیں کر کر کے انہیں معزول کرا دیتے۔ اس کی وجہ وہاں کی آبادی کا تنوع تھا۔ جتنی مختلف آبادی تھی، اتنی ہی مختلف اور متنوع ان کی پسند ناپسند اور خواہشات تھیں، اپنے عہد خلافت کے آخری چھے سالوں میں حضرت عمرؓ کو تین بار کوفہ کا عامل بدلنا پڑا۔ چنانچہ ایک مرتبہ سخت برہم ہو کر کہا "خدا کی پناہ! کوفہ کے لوگ بھی عجیب و غریب ہیں، اگر میں ان پر کوئی مضبوط آدمی حاکم بناتا ہوں تو یہ لوگ اس میں کیڑے نکالنے شروع کر دیتے ہیں اور اگر کسی کمزور کو حاکم بناتا ہوں تو یہ اس کی تحقیر و تذلیل شروع کر دیتے ہیں۔"[۵]

اہل کوفہ کا ایک سیاسی کردار یوں تو ابتداء سے ہی نظر آتا ہے تاہم حضرت علیؓ نے خلیفہ بننے کے بعد کوفہ کو دارالخلافہ بنایا تو اس شہر کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی۔

شام بھی حضرت عمرؓ کے عہد میں زیر نگیں ہوا۔ شام قدیم زمانہ میں فنیقی، کلدانی، اموری، یونانی اور کنعانی وغیرہ مختلف قوموں اور ان کی تہذیب و تمدن کا مرکز تھا۔ فراعنہ مصر، یونانی، رومی اور آخر میں غسانہ عرب کی رزم گاہ رہ چکا تھا۔ جب اسلام کے زیر نگیں آیا ہے اس

وقت یہ رومی سلطنت کے ماتحت تھا اس کے باشندے مذہبا عیسائی اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے رومی تھے۔ اصل باشندگان ملک کے علاوہ یہاں ارمن، یہود رومی اور بعض عرب قبائل جن میں مشہور غسان، لخم، جذام، کلب، قضاعہ اور تغلب تھے، آباد تھے۔ یہ عرب قبائل شام کے جنوبی حصے میں زیادہ آباد تھے، ان قبائل عرب کی زبان آرامی اور عربی کا ملغوبہ تھی۔ یہ لوگ اپنے آپ کو شامی ہی سمجھتے تھے۔ حجاز کے عربوں سے ان کا تعلق محض تجارتی تھا، یہی وجہ ہے کہ شام کے محاذ پر جنگ ہوئی تو انہوں نے مسلمانوں کے مقابلے میں رومیوں کا ساتھ دیا۔

شام کا ایک اہم شہر حُمص تھا، آمد اسلام سے قبل بے شمار عرب یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ۸۱ ق م سے ۹۶ء تک حمص پر عربوں کا ایک مقامی خاندان حکومت کرتا تھا۔ بنوتنوخ بھی ان قبائل میں شامل تھے جو اس علاقے میں آ کر بس گئے تھے۔ عربوں کی فتح کے زمانے میں بے شمار نیم خانہ بدوش قبائل جنوب سے آ کر حمص میں آباد ہوئے جس کی وجہ سے حمص، یمنی عربوں کا اہم مرکز بن گیا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمان حمص میں بغیر کسی خونریزی کے ۱۶ھ/ ۶۳۷ء میں داخل ہوئے تھے۔ اسلامی صوبہ بننے کے بعد ایک روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ کے پانچ سو صحابہؓ اس شہر میں سکونت کے لئے آئے۔

شام کا ایک اور علاقہ ''حلب'' تھا۔ یہاں بھی اسلامی فتوحات سے قبل بڑی تعداد میں عرب آباد تھے، خصوصاً حاضر حلب کی بیرونی بستی پوری کی پوری تنوخ قبیلے پر مشتمل تھی۔ اس لئے جب مسلمانوں نے ۱۶ھ میں خالدؓ بن ولید کی سرکردگی میں حلب پر یلغار کی تو کسی نے ان کا جانفشانی سے مقابلہ نہیں کیا۔ اہل شہر نے بغیر کسی مزاحمت کے ہتھیار ڈال دیے۔ عربوں میں سے بعض نے فوراً اسلام قبول کر لیا لیکن بیشتر مقامی لوگ عبدالملک بن مروان کی خلافت سے قبل مسلمان نہیں ہوئے۔ حلب میں آبادی کا بڑا عنصر شامی تھا جو مذہبا عیسائی تھے۔

دمشق، جو کہ شام کا اہم صوبہ تھا، اس کا سقوط ایک انتہائی اہم واقعہ تھا، جس نے شام پر رومیوں کی سیادت کا خاتمہ کر کے اس شہر کو پھر سامی حلقہ اثر میں ڈال دیا اور اس کا رخ از سر نو صحرا اور مشرق کی طرف ہو گیا۔ اہل دمشق نے بھی عرب فاتحین کا خوشدلی سے خیر مقدم

کیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ اسلام کے بہت زیادہ قریب ہیں اور انہیں توقع تھی کہ وہ مسلمانوں کے زیر حکومت زیادہ آزادانہ زندگی بسر کرسکیں گے۔

مصر بھی حضرت عمرؓ کے زمانے میں مفتوح ہوا۔ مصر تہذیب وتمدن کا قدیم گہوارہ رہ چکا تھا، جس کی تعمیر میں قدیم اہل مصر، یونانیوں اور رومیوں نے حصہ لیا تھا۔ اسکندریہ، فلسفہ اور مذہب کے مختلف مکاتب فکر اور مشرقی افکار ونظریات کا مرکز رہ چکا تھا۔ یہاں مصر کے اصل باشندوں کے علاوہ یہودی اور رومی بھی آباد تھے۔ مسلمانوں نے مصر کو فتح کیا تو وہاں رومی تہذیب پھیلی ہوئی تھی۔ مصر کی فتح مکمل ہوجانے کے بعد دیگر عربوں نے مصر کا رخ کیا اور فسطاط میں انہوں نے اپنے قبائل کے ناموں کے مطابق نشان زدگی شروع کردی۔ وہ شہروں اور دیہاتوں میں پھیل گئے اور اسی کو اپنا وطن بنالیا، زراعت ان کا پیشہ تھا۔ بہت سے قبطی بھی مسلمان ہوگئے تھے۔ عربوں کے نسب، مصریوں کے نسب کے ساتھ خلط ملط ہوگئے، کیونکہ باہمی شادیوں کا رواج بڑھ گیا تھا۔ مصر پر عربوں کا اثر غالباً سب سے زیادہ پڑا۔ یہ بات بظاہر خاصی حیرت انگیز ہے کہ جن مصریوں نے یونان وروم کے پر زور تمدن کو نہ مانا انہوں نے اسلامی تہذیب وتمدن کو اس حد تک اپنالیا کہ بالکل عرب ہوگئے۔ مصر میں فراعنہ کا قدیم تمدن نیز وہ تمدن جسے یونانیوں اور رومیوں نے بعض شہروں میں قائم کیا تھا، بالکل ناپید ہوگیا اس کی جگہ نوزائیدہ اسلامی تمدن نے لے لی۔ ۶

ان فتوحات کا مقصد قرب وجوار کی حکومتوں کے لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا نہیں تھا۔ ۷ بلکہ ان جنگوں کی ابتدا اسلامی ریاست کے دفاع کے لئے ہوئی تھی، لہٰذا مسلمان سپہ سالار اپنے مدمقابل کو تین میں سے کسی ایک بات کو اختیار کرنے کی آزادی دیتے تھے، پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ اسلام قبول کرلیں اور مسلمان ہوجائیں۔ ایسی صورت میں ان کے حقوق و فرائض دیگر مسلمانوں کے برابر ہوں گے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ جزیہ دینے پر آمادہ ہوجائیں اور اسلامی حکومت میں اہل الذمہ بن کر رہیں۔ تیسری اور آخری صورت جنگ تھی۔ ۸ (بشرطیکہ اول الذکر دونوں باتیں مدمقابل کو منظور نہ ہوں۔)

مسلمان قائدین کی پہلی فرخدلانہ پیشکش کے نتیجے میں بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ وہ لوگ جو اسلام لے آئے تھے ان کے ساتھ حلف وولاء کا معاملہ کرکے انہیں موالی قرار دیا گیا، موالی کی اس نئی قسم کو جیسا کہ باب کے شروع میں لکھا گیا "مولی الاسلام" کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ان کے وہی حقوق رکھے گئے جو مسلمانوں کے تھے اور ان پر وہی فرائض عائد کیے گئے جو دیگر مسلمانوں کے تھے۔ یہ غیر عرب نومسلم عموماً کسی عرب قبیلے کے ساتھ حلف یا ولاء کا معاملہ کرلیتے تھے گو کہ یہ لازمی نہیں تھا، اگر وہ لوگ آپس میں مل کر جداگانہ قبیلے کی شکل اختیار کرنا چاہتے تو انہیں اس کی مکمل آزادی حاصل تھی۔ اپنے سپہ سالاران لشکر کو حضرت عمرؓ نے اس ضمن میں ایک واضح پالیسی دی تھی، چنانچہ مختلف لشکروں کے امراء کے نام یہ فرمان جاری کیا:

"ومن اعتقتم من الحمراء فاسلموا فالحقوهم بمواليهم، عليهم ما عليهم. و ان احبوا ان يكونوا قبيلة و حدهم فاجعلو هم اسوتكم في العطاء والمعروف." (فی حدیث طویل ۹)

[غیر عرب اقوام کے جن غلاموں کو تم آزاد کرو اور وہ مسلمان ہو جائیں تو ان ان کا شمار ان کے آزاد کنندہ کے زمرے میں کرو، جو مراعات انہیں حاصل ہوں وہی ان نومسلموں کو دو اور جو ذمہ داریاں ان پر ہوں وہی نومسلموں پر بھی لگاؤ اور اگر یہ لوگ باہم مل کر جداگانہ قبیلے کی شکل اختیار کرنا چاہیں تو انہیں اس کی آزادی دو اور وظائف اور دیگر دستور وغیرہ میں ان سے اسی طرح کا سلوک کرو۔ (یہ ایک طویل روایت کا اقتباس ہے)]

ان امیران لشکر کو اس بات کی خصوصی تاکید کی گئی تھی کہ ان موالی کے ساتھ مسلمانوں کا عام برتاؤ مساویانہ اور روادارانہ ہونا چاہئے۔ یہی نہیں بلکہ جس عامل کے خلاف انہیں کے برخلاف شکایت ملتی اس سے باز پرس بھی کرتے تھے۔۱۰

ان فتوحات کے دوران کئی دفعہ محاربین نے مسلمان سپہ سالاروں سے اس قسم کی بات پوچھی کہ اگر وہ مسلمان ہو جائیں گے تو ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ یہ وہ پریشانی

تھی جو اُن کے دلوں میں فطری طور پر اٹھ رہی تھی۔ اس کا جواب انہیں ہر سطح پر یہی دیا گیا کہ مسلمان ہو جانے والوں کے ساتھ مساوی سلوک کیا جائے گا۔ ایک مسلمان کے جو حقوق و فرائض ہیں وہی حقوق و فرائض ان کے ہوں گے۔ چنانچہ بنو تغلب [11] کے ساتھ معاہدہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے لکھوایا:

''میرا معاہدہ یہ ہے کہ تم میں سے جو کوئی مسلمان ہوگا اس کے حقوق و فرائض وہی ہوں گے جو تمام مسلمانوں کے ہیں، اور جو اسلام قبول نہ کرے اسے جزیہ دینا ہوگا۔'' [12]

اہلِ مدائن کے نام حضرت خالدؓ بن ولید نے جو خط لکھا تھا اس میں بھی اسی قسم کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ ''......اور جو شخص ہماری طرح نماز پڑھے، ہمارے قبلے کی طرف رخ کرے اور ہمارے ہاتھ کا ذبیحہ کھائے، وہی مسلم ہے، اس کے حقوق اور ہمارے حقوق برابر ہیں۔'' [13]

مساویانہ طرزِ عمل کی پیش کش غیر عربوں کے لئے انتہائی پرکشش تھی۔ بالخصوص جب مسلمانوں کی مساویانہ طرزِ معاشرت کا ایرانیوں اور رومیوں کی ناہموار اور غیر مساوی طرزِ معاشرت سے مقابلہ ہوتا تو یہ وصف خصوصیت کے ساتھ اور نمایاں ہو جاتا کیونکہ اس وقت کے ایرانی، ہندوستانی اور رومی معاشرے بدترین قسم کے نسلی اور طبقاتی تعصبات میں گرفتار تھے۔ یہ نسلی امتیازات ان کے دانشوروں کے خیالات کا نچوڑ تھے۔ [14] جبکہ قرآن قبائلیت اور نسلیت کی واضح نفی کر کے، اس کی سخت حوصلہ شکنی کرتے ہوئے مساوات و اخوت کا اصول متعارف کراتا ہے، جو طبقاتی کشمکش کے شکار لوگوں کے لئے ایک امید افزا پیغام تھا لہٰذا اسلام کو مشرق و مغرب میں شرف قبولیت حاصل ہوا اور تین براعظموں پر اسلامی حکومت کا جھنڈا لہرانے لگا۔ گستاؤ لیبان کا یہ کہنا درست ہے ''یہ رواداری و ملائمت عربوں کی فتوحات کے پھیل جانے اور ان کے مذہب، نظامات اور زبان کے ہر جگہ بآسانی مقبول ہو جانے کا ایک سبب تھا۔'' [15]

جن محاربین نے مسلمان قائدین کی پہلی پیش کش کو قبول نہیں کیا (یعنی اسلام قبول نہیں کیا) تاہم جزیہ دینے پر آمادہ ہو گئے، ان سے کوئی تعرض نہ کیا گیا، نہ ان کی عبادت گاہوں کو

مسمار کیا گیا اور نہ انہیں لونڈی غلام بنایا گیا۔ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کاکتانی لکھتا ہے:

''ابتدائی سالوں میں عربوں نے کسی شخص کے ساتھ مذہب کی بناء پر بدسلوکی روا نہیں رکھی اور نہ انہوں نے کسی کا مذہب تبدیل کرانے کی زحمت اٹھائی۔ چنانچہ ابتدائی فتوحات کے بعد، اسلامی عہد حکومت میں عیسائی عربوں نے ایسی مذہبی آزادی کی راحت پائی، جو انہیں کئی نسلوں سے نصیب نہیں ہوئی تھی۔'' ۱۶

نکلسن کو بھی مسلمانوں کی اس خوبی کو تسلیم کرنا پڑا ہے، ۱۷ اسی طرح گستاولیبان بھی عرب فاتحین کے مثالی سلوک، مساویانہ طرز عمل اور منصفانہ رویہ کا اعتراف کھلے دل سے کرتا ہے۔ ۱۸ ولندیزی مورخ دخویے (De Goeje) لکھتا ہے: ''فی الحقیقت شام میں لوگ عربوں کی جانب بہت مائل ہو گئے تھے اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ عربوں نے مفتوحوں سے جو سلوک کیا اگر اس کا مقابلہ وہاں کے سابق مالکوں کے بے اصول ظلم سے کیا جائے تو بڑا ہی سخت فرق نظر آتا ہے۔'' ۱۹

اس طرز عمل کا نتیجہ یہ تھا کہ پہلی صدی ہجری میں شام و فلسطین کی عام زبان تک عربی ہو گئی اور یہ علاقے آج تک خالص عربی ہیں۔

جن لوگوں نے نہ تو پہلی تجویز قبول کی اور نہ دوسری، بلکہ جنگ کرنے پر کمر بستہ رہے ان سے جنگ کی گئی اور اس وقت کے مروجہ قوانین جنگ کے مطابق فاتحین، مفتوحہ قوم کے مال پر تصرف کرتے، ان کے محاربین کو قیدی بنا لیتے۔ تاہم قیدی بنانا ضروری نہیں تھا جیسا کہ عراق و شام کی فتوحات کے دوران خالدؓ بن ولید اور ان کے تمام فوجی افسروں نے مفتوحہ علاقوں کے کاشتکاروں سے کوئی تعرض نہیں کیا کہ حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے ان کو ایسی ہی ہدایات دی گئی تھیں البتہ ان جنگجو لوگوں کی اولاد کو جو اہل عجم کی خدمات ملکی انجام دیتے تھے، گرفتار کر لیا، اس طور سے عین التمر کے قیدی سب سے پہلے غیر عرب جنگی قیدی تھے جو مدینہ لائے گئے۔ ۲۰ ۱۲ھ سے یہ سلسلہ شروع ہوا تو صدیوں تک جاری رہا۔

حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ان کی مرضی کے خلاف فتوحات کا دائرہ وسیع سے

وسیع تر ہوتا چلا گیا، ایران، عراق، الجزیرہ، شام اور مصر کی فتوحات کے ساتھ ہی غلاموں، لونڈیوں اور آزاد کردہ غلاموں یعنی موالی کی اتنی کثرت ہوگئی کہ حضرت عمرؓ کو اپنی قوم، یعنی عربوں کے دین اور ان کی بعض قابل ذکر شخصی صفات کے ضائع ہونے کی فکر ہوگئی۔ فتوحات کا دائرہ وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی یہ فکر اور تشویش بھی شدید تر ہوتی چلی گئی۔ اہواز اور اس کے قریبی علاقوں کی فتح پر حضرت عمرؓ کا یہ کہنا کہ "کاش ہمارے اور فارس کے درمیان آگ کا پہاڑ حائل ہوتا۔ نہ تو ہم ان تک پہنچ سکتے اور نہ ہی ان کی رسائی ہم تک ہوتی۔ مجھے مال غنیمت سے کہیں زیادہ مسلمانوں کی سلامتی عزیز ہے اور اسے غنیمت پر ترجیح دیتا ہوں۔" ۲۱ ابتدا حضرت عمرؓ بن العاص کو مصر کی طرف پیش قدمی کی اجازت نہ دینا اور حضرت امیر معاویہؓ کو حکماً بحری جنگوں سے روک دینا ۲۲ یہ سب کچھ دراصل اسی تشویش کے مظہر تھے۔

اس سلسلے میں ان کی سوچ یہ تھی کہ عربوں کو منتشر ہو کر غیر اقوام کے علاقوں اور ملکوں میں اقلیت بن کر نہیں رہنا چاہیے۔ ان کے خیال میں عرب قوم کے لئے اس سے زیادہ ضرر رساں اور کوئی بات نہیں کہ وہ مختلف ملکوں میں پھیل کر اپنی جمعیت کو منتشر کردیں۔ چنانچہ حفظِ ماتقدم کے طور پر انہوں نے کچھ اقدامات کیے مثلاً حضرت عمرؓ، کبار صحابہ کا حجاز سے باہر جانا خصوصاً عراق وشام سے آگے پھیل جانے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اس بات کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ عرب عجمیوں کی سی عادات واطوار اختیار کرلیں، وہ عربوں کو اس بات کی تاکید کرتے رہتے تھے کہ وہ اپنے انساب یاد کریں وہ کہتے تھے:

تعلموا النسب ولا تکونوا کنبیط السواد اذا سئل احدھم عن اصلہ قال: من قریۃ کذا و کذا ۲۳

[اپنے نسب نامے یاد رکھو اور جب تم سے نسب کی بابت پوچھا جائے تو نبطیوں کی طرح مت کہو کہ ہم فلاں گاؤں کے ہیں۔]

حضرت عمرؓ غیر قوم کے لوگوں کا مدینے میں آکر آباد ہونا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ۲۴ عراق میں جو نئے شہر کوفہ اور بصرہ کے بسائے گئے، اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ عرب

سپاہیوں کو مقامی لوگوں سے اختلاط سے روکا جاسکے۔

حضرت عمرؓ کے ان اقدامات سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ غیر عرب اقوام کو پسند نہیں کرتے یا انہیں کمتر اور عربوں کو برتر سمجھتے تھے، درست تجزیہ نہیں ہوگا۔ انہوں نے عربوں کو متنبہ کردیا تھا کہ اگر عجمی قیامت کے دن اپنے نیک اعمال لے کر آگئے اور ہم بغیر عمل کے حاضر ہوئے تو اہل عجم ہی رسول اللہ ﷺ کے اس دن زیادہ قریب ہوں گے کیونکہ عمل کی کمی کو نسب پورا نہیں کرسکتا۔ ۲۵

اصل بات یہ تھی کہ حضرت عمرؓ ان اقدامات کے ذریعہ عربوں کے دین کو خالص اور ان کی مخصوص صفات کا دفاع چاہتے تھے۔ حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ عربوں میں دینی حمیت اور قومی غیرت جاگی رہے اور رسول اللہ کا دین اغیار (غیر مسلموں) کے ہاتھوں مسخ ہونے سے بچ سکے، اس کے پیچھے غیر عربوں (موالی) کے لئے کسی قسم کا جذبہ حقارت بہرحال نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے موالی کے مقابلے میں عربوں کو نہ تو کوئی خاص مراعات دیں اور نہ قومیت اور مساوات میں فرق ڈالنے والی کوئی بات کی۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں جو شخص بھی اسلام لاتا تھا اس کو مسلمان عرب کے برابر حقوق حاصل ہوتے تھے۔ اس پالیسی پر آپ کے بعد بھی عمل ہوتا رہا۔ ۲۶

جب حضرت مغیرہ بن شعبہ نے ایرانی سپہ سالار رستم سے گفتگو کی تو اسی بات پر فخر کیا تھا۔ انہوں نے کہا "ہمیں تمہاری عقلمندی کی خبریں پہنچتی رہی تھیں مگر ہم نے تم سے زیادہ بے وقوف قوم نہیں دیکھی۔ ہم اہل عرب مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو غلام بنائے ہوئے نہیں ہے۔ بجز اس صورت کے کہ وہ کسی جنگ میں ہمارے ہاتھ آئے۔ میرا خیال تھا کہ تم میں بھی ہمارے جیسی قومی ہمدردی ہوگی، مگر تم نے عملی طور پر بہترین انداز میں مجھے مطلع کردیا ہے کہ تم میں سے کچھ افراد دوسروں کے دیوتا ہیں...... تمہاری حکومت کمزور ہوچکی ہے اور تم ضرور ہار جاؤ گے، کیونکہ کوئی ملک ان عادات وخصائل کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔" ۲۷

حضرت مغیرہ بن شعبہ کا یہ جملہ "ہم اہل عرب مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو غلام بنائے ہوئے نہیں ہے۔" غالباً حضرت عمرؓ کے اس حکم کی طرف

اشارہ کرتا ہے جس کے تحت یہ لازم کیا گیا کہ کوئی عرب کسی کا غلام نہیں رہ سکے گا۔ اسے لازماً چھے یا سات گائے کے عوض آزاد کردیا جائے گا۔ انہوں نے کہا:

"عربوں کے لئے یہ بری بات ہے کہ ان کے کچھ افراد اپنے ہم جنسوں کے مالک بن جائیں۔"

ان کا کہنا تھا کہ چونکہ اب فراخی و کشادگی نصیب ہوگئی ہے اور اہل عجم کو مفتوح کرلیا گیا ہے لہٰذا عہد جاہلیت اور عہد اسلام کے عرب قیدیوں کو فدیہ لے کر لازماً رہا کردیا جائے۔ یہ فیصلہ حضرت عمرؓ نے مشورے کے بعد کیا۔ مشورے میں طے پایا کہ ام ولد کے علاوہ ہر عرب قیدی یا غلام چھے یا سات گائے زر فدیہ دے کر مالک سے آزادی حاصل کرلے۔ اس ضمن میں قبائل حنیفہ اور کندہ کو خاص رعایت دی گئی تھی کیونکہ جنگوں میں مارے جانے کی وجہ سے ان کے مردوں کی تعداد کم ہوگئی تھی۔ ۲۸ طبری نے اس بیان میں اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ "اہل دبا اور دوسرے تمیں دستوں کو بھی آپ نے فدیہ سے مستثنیٰ قرار دے دیا تھا۔" ۲۹

حضرت عمرؓ نے جب تمام عرب قیدیوں یا غلاموں کو زر فدیہ لے کر آزاد کردیا تو کوئی عرب غلام نہیں رہ گیا البتہ چند ام ولد قریش میں رہ گئیں، مثلاً بشریٰ بنت قیس بن ابی الکسیم جو سعد بن مالک کے پاس تھیں اور ان کے بیٹے عمر کی ماں تھیں۔ زرعہ بنت مشرح جو عبداللہ بن عباس کے پاس تھیں اور ان کے بیٹے علی کی ماں تھیں اور چند دوسری ام ولد۔ ۳۰

یہ واقعہ بھی حضرت عمرؓ ہی کے دور کا ہے جب ایک غلام کی دی گئی پناہ کو تسلیم کیا گیا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ مسلمان فوجیں، ایران کے مشہور شہر جندی شاپور کا محاصرہ کیے ہوئے تھیں۔ ایک روز اہل شہر نے خود شہر پناہ کا دروازہ کھول دیا۔ مسلمانوں کو سخت تعجب ہوا۔ دریافت کرنے پر جواب ملا "تم لوگوں نے جزیہ پر ہم سے مصالحت کرلی ہے اور اب ہمارے تمہارے درمیان کوئی مناقشہ نہیں رہا۔" تحقیق پر معلوم ہوا کہ ایک غلام مکنف، جو سُوس کا رہنے والا تھا، اس نے امان نامہ بشرط ادائے جزیہ لکھ کر تیر میں باندھ کر پھینکا تھا۔ مسلمانوں نے خلیفہ وقت کو لکھ کر پوچھا حضرت عمرؓ نے جواباً غلام کے امان دینے کو جائز رکھا اور لکھا کہ

''مسلمانوں کا غلام بھی مسلمان ہے، اس نے جس کو امان دی اسے تمام مسلمانوں نے امان دی۔'' ۳۱؎

C.I. Huart اس واقعہ کو جھٹلاتے ہوئے لکھتا ہے ''سیف بن عمر کی کہانی، جس کی رو سے اس شہر کا سقوط غلام مکنف کی جعل سازی کا نتیجہ تھا، محض ایک خیالی افسانہ معلوم ہوتی ہے۔'' ۳۲؎

C.I. Huart اس واقعہ کو خیالی افسانہ قرار دینے کے لئے کوئی دلیل پیش نہیں کرتا جبکہ اسلامی تاریخ کے ایک دو نہیں چار اہم ماخذ یعنی تاریخ طبری، تاریخ ابن اثیر، تاریخ ابن خلدون اور کتاب الاموال اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ کوئی انوکھا فیصلہ نہیں تھا۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان موجود تھا:

و ان ذمة الله واحدة، يجير عليهم ادناهم و ان المومنين بعضهم موالي بعض دون الناس. ۳۳؎

[بے شک اللہ کا ذمہ ایک ہے۔ ان کا ایک ادنیٰ آدمی بھی ان کی طرف سے ذمہ لے سکتا ہے اور بے شک مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور موالی ہیں ماسوائے دوسرے لوگوں کے۔]

یہ وہ زمانہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات پر سختی سے عمل ہو رہا تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کا یہ طرز عمل افسانہ نہیں عین متوقع تھا۔ در اصل بیشتر غیر مسلموں کے لئے مسلمانوں کی مساوات و رواداری سخت تعجب خیز تھی۔ جب خود انہیں اس آزمائش سے گزرنا پڑا تو بعض اوقات وہ ثابت قدم نہ رہ سکے۔ جبلہ بن الایہم، شاہ غسان کی مثال تاریخ میں موجود ہے۔ (جس کا تذکرہ اسی مقالے کے باب سوم، فصل اول میں کیا جا چکا ہے۔)

الغرض فتوحات کا جو سلسلہ حضرت عمرؓ کے دور سے چلا آ رہا تھا، حضرت عثمانؓ کے عہد میں مزید آگے بڑھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ اس سلسلے کو آگے بڑھانے پر اسی طرح مجبور تھے، جس طرح حضرت عمرؓ خود کو مجبور پاتے تھے۔ ایرانی اور رومی اپنی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے

خلیفہ ثالث کو مجبور کرتے رہے کہ وہ فوج کشی کا سلسلہ جاری رکھیں چنانچہ کئی مفتوحہ علاقوں مثلاً آذربائیجان، آرمینیا، رے، اصطخر، خراسان اور بجستان وغیرہ نے بغاوت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے جس جزیہ کی ادائیگی پر مصالحت کی تھی اسے روک لیا تھا، رومیوں نے بھی بدعہدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شام پر حملہ کردیا۔ اسکندریہ کے رومیوں نے اپنا عہد توڑ دیا اور قسطنطین رومی نے ان کی مدد کی۔ ان حالات کے پیش نظر خلیفۂ ثالث کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان ریاستوں اور علاقوں کو دوبارہ سے اسلامی حکومت کے دائرۂ اطاعت میں لے آئیں تاکہ اسلامی حکومت کی طاقت کا سکہ اس طرح جم جائے کہ وہ مزید بگاڑ پیدا کرنے کی جرأت نہ کرسکیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے انہی فتوحات کے تسلسل میں عہد عثمانؓ میں، ایرانیوں اور رومیوں کے بعض شہر بھی فتح کرلیے جو اس سے قبل انہوں نے فتح نہیں کیے تھے، مثلاً طرابلس الغرب، قبرص اور طبرستان وغیرہ۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ طبرستان حضرت عمرؓ کے زمانے میں فتح ہوچکا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ ہی کے زمانے میں فتح ہوا ہو اور باغیانہ روش کی وجہ سے حضرت عثمانؓ کو از سرنو فتح کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔ اس طرح اپنی خلافت کے آغاز میں ہی حضرت عثمانؓ نے مفتوحہ اقوام کو یہ بات اچھی طرح سمجھادی کہ حضرت عمرؓ کے قتل ہوجانے سے مسلمانوں کی اجتماعی قوت میں کوئی کمزوری نہیں آئی ہے۔

ایک قابل غور بات یہ ہے کہ جو علاقے دوبارہ سے باغی ہوئے ان میں سے بیشتر کا تعلق ایران سے تھا، یعنی سابقہ ساسانی مملکت سے، غالباً اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ایرانی، خصوصاً ان کے طبقہ امرا اپنے آپ کو عربوں سے بدرجہا بہتر اور مہذب سمجھتے تھے، شاہان کسریٰ کے شاندار تمدن کے سامنے عرب انہیں کمزور اور حقیر نظر آتے تھے، چنانچہ یہ عربوں کے ہاتھوں اپنی شکست کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر پا رہے تھے۔ پھر اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کا بادشاہ یزدگرد زندہ تھا، جس سے ان کو تقویت تھی۔ اس کے برعکس مصر و شام کی (یہ دونوں رومی سلطنت کے صوبے تھے) یہ حالت نہیں تھی، یہاں کے لوگ اسلامی فتوحات سے قبل قسطنطنیہ کے بادشاہ کو بھاری خراج ادا کرتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے عائد کردہ جزیہ اور ان کی

رواداری کو اپنے سابقہ آقاؤں کے مقابلے میں بدرجہا غنیمت سمجھا لہٰذا انہوں نے عربی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے میں ایرانیوں کے نقش قدم پر چلنا ضروری نہیں سمجھا۔ اسی طرح عراق کی فتح کے بعد، تاریخ ہمیں ایسا کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں بتاتی کہ وہاں کوئی فوجی یا سیاسی بغاوت ہوئی ہو اور اس میں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے کی کوئی تخصیص نہیں۔ اس کا سب سے قوی سبب یہ تھا کہ عراق کی اکثریتی آبادی عرب قبائل پر مبنی تھی، جو ماضی قریب و بعید میں جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر عراق و شام تک پھیل گئے تھے۔

اس کا دوسرا سبب فوجی چھاؤنیوں (کوفہ، بصرہ) کا قیام تھا، جن کا مقامی آبادی پر خاطر خواہ رعب واثر تھا۔

اور اس کا تیسرا سبب یہ تھا کہ مدائن، کسریٰ کا پایہ تخت تھا، جو اُن کے ملک میں (یعنی عراق میں) واقع تھا۔ ایرانی فوجیں مدائن اور تمام عراق سے پسپا ہو کر ایران کی طرف چلی گئی تھیں اور مدائن ان عرب فاتحین اور ان عراقیوں کے لئے خالی ہو گیا تھا، جو سینکڑوں سال سے یہاں رہ رہے تھے، یہی وجہ ہے کہ تاریخ ہمیں عراق سے اٹھنے والی کسی بغاوت کا پتہ نہیں دیتی۔

تاہم جو علاقہ فارس کے اطراف سے عراق کے مشرق تک پھیلا ہوا تھا وہاں کے رہنے والے ایرانیوں کے دلوں میں انقلاب کے لئے خیالات باقی تھے اور انہیں یہ کمزوری امید بھی تھی کہ کسریٰ یزدگرد اپنی جلاوطنی کی جگہ سے، جو ترک علاقوں میں تھی، ان کی طرف واپس آکر اپنے ملک کو اپنے آبا آلِ ساسان کی مجد و بزرگی سے دوبارہ سرفراز کرے گا۔ اس امید کا باعث کوئی دینی عقیدہ نہ تھا بلکہ یہ ان کی قومی غیرت وعصبیت تھی۔ وہ ہر اعتبار سے خود کو عربوں سے بہتر سمجھتے تھے۔ عرب ان کے خیال میں ایک وحشی اور اجڈ قوم تھی جو کسی طرح بھی ان کی آقائیت کی سزاوار نہیں تھی۔

المختصر عہد عثمانیؓ میں اسلامی مملکت میں بڑی وسعت ہوئی، فتوحات کی اس کثرت کا ایک منطقی نتیجہ موالی کی کثرت کی صورت میں سامنے آیا۔ عراق، ایران، شام اور مصر کے ہزار ہا

افراد نے اسلام قبول کیا، جنہیں عرب اسلامی معاشرے نے "عہد موالات" کے حوالے سے بآسانی اپنے اندر سمو لیا، یہ نو مسلم موالی کہلائے۔ یہ لوگ نئے اسلامی معاشرے اور عرب سماج میں مدغم ہونے کے لئے اور جدید اسلامی معاشرے میں سہولتیں اور بہتر تحفظات حاصل کرنے کے لئے وہاں آباد کسی قبیلے سے حلف و ولاء کے تعلقات قائم کر لیتے اور اسی عرب قبیلے میں محسوب ہوتے اور اس طرح ان کی حمایت و حفاظت حاصل کر لیتے۔

ان موالی میں سیاسی اور سماجی اعتبار سے سب سے اہم کردار ایرانی موالی کا رہا ہے۔ جنہوں نے تاریخ کے ہر دور میں، خصوصاً پہلی اور دوسری صدی ہجری میں نمایاں کردار ادا کیا بے جا نہ ہوگا کہ آگے بڑھنے سے قبل عرب و ایران تعلقات کے پس منظر کو بیان کر دیا جائے۔

ایرانیوں سے عربوں کے تعلقات بہت قدیم تھے۔ ان کے تجارتی کاروان ایران جاتے اور وہاں اپنا مال بیچتے اور اپنی ضروریات کا سامان خرید کر واپس آتے تھے۔ اسی طرح ایرانی تجار بھی کاروباری اغراض سے عرب آتے رہتے تھے۔ ایرانیوں سے عربوں کے سیاسی روابط بھی نہایت گہرے اور دیرینہ تھے۔ پڑوسی عراق میں عربوں کی نقل مکانی کے سلسلے زمانہ قدیم سے جاری تھے۔ عرب و عراق کی سرحدوں پر اور عراق عرب کے درمیان ان کی کثیر التعداد آبادی تھی۔ انہیں عرب آبادکاروں کی ایک ریاست حیرہ میں قائم تھی (جس کا باب دوم میں تذکرہ کیا جا چکا ہے) ان عربوں کا تعلق قحطانی قبیلے بنو لخم سے تھا۔ انہوں نے ایرانی مدنیت کے آثار قبول کرتے ہوئے خانہ بدوشی بالکل ترک کر کے شہری زندگی گزارنی شروع کر دی تھی۔ یہ عرب مدتوں ایرانیوں کے حلیف بن کر ان کے پڑوس میں آباد رہے اور ایرانیوں نے ان سے بہت سے فوائد بھی حاصل کیے۔ عراق عرب اور اندرون عرب، ایرانیوں کے سیاسی مفادات کی نگرانی انہی کے ذمہ تھی۔ حیرہ کے لخمی حکمران، ایرانی حکومت کے اس حد تک وفادار تھے کہ وہ ایران و روم کی جنگوں میں رومیوں کے خلاف بڑی بہادری سے لڑتے تھے۔[۳۴] ان کے باہمی تعلقات اس درجہ دوستانہ تھے کہ کسریٰ ایران، یزدگرد اول (۳۹۹ء تا ۴۲۰ء) نے

اپنے ولی عہد بہرام کو تعلیم وتربیت کی غرض سے حیرہ بھیج دیا تھا لیکن ایرانی اپنے عرب حلیفوں کو اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے اور موقع ملنے پر انہیں ذلیل کرنے سے بھی باز نہ آتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے حیرہ کے لخمی سردار، نعمان بن منذر سوم کو اپنے پایہ تخت مدائن بلا کر قید کر دیا۔ جس کا قید ہی کی حالت میں تھوڑے دنوں بعد انتقال ہو گیا تھا۔ نعمان نے حیرہ سے مدائن جاتے وقت اپنی قیمتی زرہیں اور بعض دوسری اشیا بنو بکر کے رئیس ہانی بن مسعود شیبانی کے پاس امانتاً رکھوادی تھیں۔ نعمان کی موت کے بعد ایرانی حکومت نے حیرہ میں اپنا گورنر مقرر کر دیا اور ایک عرب سردار ایاس بن قبیصہ طائی کو برائے نام حکومت حیرہ کا رئیس نامزد کر دیا۔ ایرانی بادشاہ خسرو پرویز کے، حکومت حیرہ پر براہ راست حکومت کرنے کے اس غلط فیصلے سے ایران کے وفادار عربوں میں بد دلی پیدا ہوئی اور جب ایرانی شہنشاہ نے ہانی بن مسعود سے نعمان کی امانت کی واپسی کا مطالبہ کیا تو عربوں میں مزید اشتعال پیدا ہوا۔ ہانی نے ایرانی حکمران کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اس انکار پر ہانی کے خلاف ایک ایرانی فوج اسی ایاس طائی کی سرکردگی میں سرکش عرب قبائل کو سزا دینے کی غرض سے روانہ کی گئی۔ اس فوج کے ساتھ ایرانیوں کے وفادار عرب قبائل طے اور ایاد کی کمک بھی تھی۔ عربوں سے اس فوج کا مقابلہ "ذی قار" نامی چشمے کے قریب ہوا۔ عربوں نے جان پر کھیل کر ایرانیوں کا مقابلہ کیا اور انہیں شکست دی۔ ذی قار کی یہ تاریخی جنگ ۶۰۴ء تا ۶۱۱ء کے درمیان کسی وقت ہوئی ۳۵ یہ ایرانیوں کے خلاف باقاعدہ جنگ میں عربوں کی پہلی فتح تھی۔ اس واقعہ کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو ہوئی تو آپؐ نے اظہار مسرت کیا اور فرمایا:

"الیوم اول یوم انتصف فیه العرب من العجم و بی نصروا" ۳۶

[یہ پہلا موقع ہے جب عربوں نے ایرانیوں پر غلبہ حاصل کیا اور یہ مدد انہیں اللہ عزوجل کی جانب سے میرے وسیلے سے عطا ہوئی۔]

عرب عجم تعلقات میں جنگ ذی قار کو اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ اس کامیابی سے عربوں کا ایرانیوں کے مقابلے میں احساس کمتری ختم ہوا اور ایرانی برتری کا طلسم ٹوٹنے لگا،

عربوں اور ایرانیوں میں جنگ ذی قار کے بعد سے ایک طرح کی قومی رقابت قائم ہوگئی۔ جیسا کہ بیان کیا گیا، اس جنگ میں کئی عرب قبائل ایرانیوں کی طرف سے لڑے تھے، لہٰذا اسے متحدہ عرب کی متحدہ ایران سے جنگ ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا مگر یہ ضرور ہے کہ اس جنگ کے بعد عربوں میں ایرانیوں کے خلاف قومی جذبات بیدار ہوئے اور عربوں اور ایرانیوں کے مابین وہ قومی عصبیت اور رقابت پیدا ہوگئی جو وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی رہی۔

رسول اللہ ﷺ کے مکی دور میں رومیوں اور ایرانیوں کے درمیان برابر کشمکش جاری رہی، اس کشمکش میں مسلمانوں کی ہمدردیاں، اہل کتاب ہونے کے ناتے، رومیوں کے ساتھ رہیں۔ چنانچہ جب ایرانیوں نے رومیوں کے اندرونی خلفشار اور بدامنی سے فائدہ اٹھا کر شام پر حملہ کیا اور انطاکیہ اور القدس سمیت پورے شام پر قبضہ کرلیا اور مصر سے بھی رومیوں کی حکومت ختم کر کے اپنا تسلط جمالیا تو ایرانیوں کی ان پے در پے کامیابیوں سے فطرتاً مسلمانوں کو رنج ہوا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ پر سورۂ روم کی آیات نازل ہوئیں۔

الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۝ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ۝ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ (الروم:۱-۴)

[رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہوگئے ہیں اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہوجائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور یہ دن وہ ہوگا جب کہ (اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر) مسلمان خوشیاں منائیں گے۔]

چنانچہ یہ پیش گوئی اس وقت پوری ہوگئی جب روم اور ایران کی جنگ میں رومی غالب آگئے اور ہرقل نے ایرانیوں کو مصر اور شام سے بے دخل کر کے اپنے کھوئے ہوئے مقبوضات حاصل کر لیے۔ صلیب مقدس کو واگزار کرالیا بلکہ پیش قدمی کر کے ایرانی دارالحکومت کو گھیر لیا اور نینوئی کی جنگ میں ایرانیوں کو شکست فاش دے کر ان کی کمر توڑ دی۔ رسول اللہ

ﷺ کو اس واقعے کی اطلاع صلح حدیبیہ کے دن ملی اور آپ ؐ نے اس پر مسرت کا اظہار کیا۔

اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ شمال میں حکومت حیرہ کے علاوہ، بحرین، عمان اور عرب کے ساحلی علاقوں پر بھی ایرانی اقتدار قائم تھا۔ عمان پر جلندری کا خاندان کسریٰ کی جانب سے حکمران تھا جبکہ بحرین، حیرہ کے لخمیوں کی ماتحتی میں تھا۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے قبائلی سرداروں کے بھی ایرانی حکومت سے ماتحتانہ تعلقات تھے۔ ان میں سے بعض کو حکومت ایران کی جانب سے تاج عطا کر کے اپنے قبائل پر ایک طرح کا حق حکمرانی بھی بخشا گیا تھا مثلاً بنو حنیفہ کا سردار ہوذہ بن علی جو اس لئے ''ذوالتاج'' کہلاتا تھا کہ بادشاہ ایران نے اسے ایک زرتار کلاہ عنایت کی تھی۔

خود یمن پر بعثت نبوی سے قریبی زمانے میں حکومتِ ایران کا قبضہ ہو گیا تھا اور وہاں ایرانی فوجی گورنر ایرانی فوج کے ساتھ مقیم تھا، یمن کے ایرانی قابضین نے مقامی آبادی سے تعلقات زن وشوئی بھی قائم کر لیے تھے اور اس کے نتیجے میں جو نئی نسل وجود میں آئی، اسے ''ابناء الملوک'' یا صرف ''ابناء'' یعنی بادشاہ زادے کہا جاتا تھا۔ اپنے ان عرب باجگزار روسا کے ذریعے ایرانی حکمران، عربوں کی سرحدی یلغاروں کی روک تھام کرتے اور عرب کے اندرونی علاقوں کو بھی اپنا مطیع فرمان خیال کرتے تھے۔ عرب علاقوں میں، ایرانی اثرات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بعض عرب قبائل نے مجوسیت اختیار کر لی تھی۔

ان سیاسی اور مذہبی اثرات کے سبب ایرانی حکومت عربوں کو اپنی رعایا اور مطیع فرمان سمجھتی تھی۔ جنگ ذی قار کی ہزیمت کے باوجود عجم، عربوں کو حقیر و کمتر ہی خیال کرتا تھا۔ [۳۷] چنانچہ ۷ھ میں رسول اللہ ﷺ نے جو تبلیغی خط خسرو پرویز کے نام روانہ کیا تھا، اسے اس نے پھاڑ دیا اور قاصد (عبداللہ بن حذافہ سہمی) سے گستاخانہ پیش آیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے ایرانی گورنر (باذان) کو یہ حکم بھجوایا کہ ''مدینے کے نبی'' کو گرفتار کر کے مدائن روانہ کرے۔ اس سے دربار ایران کے عربوں کے ساتھ اہانت آمیز رویے کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ [۳۸] اپنے دور زوال میں تمام تر کمزوریوں اور انتشار کے باوجود ایرانی حکومت عرب میں اسلام کی اشاعت اور

عربوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی فکر سے غافل نہ تھی۔ چنانچہ حروب ردّہ کے دوران ہی مقامی ایرانی آبادی اور ساسانی حکمرانوں کی شہ پر حیرہ کے لخمی خاندان کے ایک فرد منذر بن نعمان کو اہل بحرین نے اپنا حاکم بنا کر مسلمانوں کے خلاف لڑائی کا ڈول ڈالا تھا۔۳۹ نیز سجاح تمیمیہ نے دعویٰ نبوت کے بعد جب مدینے پر حملے کی غرض سے عرب کا رخ کیا تو اس میں بھی ایرانی حکومت اور اس کے عراق کارپردازوں کی ریشہ دوانیوں کا دخل تھا۔۴۰

بہر حال خلیفہ اول ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں ملکوں کی عظیم فتح کا آغاز ہوا تو ایران سے جنگ کرنے کے لئے بنو بکر بن وائل ہی کے مثنیٰ بن حارثہ۴۱ نے اپنی خدمات پیش کیں، کیونکہ انہیں جنگ ذی قار کی وجہ سے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ ایرانی ایسے ناقابل شکست بھی نہیں جیسا کہ انہیں تصور کیا جاتا ہے۔ مثنیٰ کی ایک تقریر سے انہی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

بہر حال عہد فاروقی میں قریب قریب سارا ایران فتح ہو گیا۔ ان جنگوں میں طرفین کے ہزاروں افراد کام آئے۔ مفتوحین کے مقتولوں کی تعداد ہر اعتبار سے زائد تھی۔ پھر بقیۃ السیف میں سے بہتوں نے اسلام قبول کر لیا۔ بہتوں نے جزیہ دینے پر آمادگی ظاہر کی اور بہتوں کو قید و بند اور غلامی بھگتنی پڑی۔ قومی عصبیت کے حوالے سے ایرانیوں کے لئے یہ ایک سانحہ عظیم تھا۔ جس نے مسلمان عربوں کی متحدہ جمعیت کے آگے ان کی قومیت کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ اس چیز نے ان کے دلوں میں گرہیں ڈال دیں اور جلد ہی ان نفرتوں کے نتائج سامنے آنے لگے۔ ابولولو فیروز، مدینے میں ایرانی غلاموں یا موالی کے بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیرتا اور روتا تھا، ساتھ ہی کہتا جاتا "عمر نے میرا کلیجہ کھا لیا ہے۔"۴۲ اور پھر بالآخر اس نے خلیفہ ثانی کو جو فتوحات ایران کے اصل ذمے دار اور روح رواں تھے، قتل کر دیا، ان کے علاوہ اس نے تیرہ مزید مسلمانوں کو زخمی کیا جن میں سے نو زخموں کی تاب نہ لا کر شہید ہو گئے۔۴۳

حضرت عمرؓ پر کامیاب قاتلانہ حملہ مغلوب ایرانیوں کی طرف سے عربوں کے خلاف پہلی بڑی منتقمانہ کارروائی تھی۔ حضرت عمرؓ خود بھی اس خطرے کو محسوس کرتے تھے۔

عہد صدیقیؓ، فاروقیؓ اور عثمانیؓ کی فتوحات کا تسلسل حضرت علیؓ کے دور خلافت میں

قائم نہ رہ سکا بلکہ ان فتوحات کا سلسلہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری سالوں ہی میں ۳۱ھ میں رک گیا تھا۔ اس کا سبب وہ داخلی انتشار تھا جو اسلام دشمن قوتوں نے برپا کیا تھا اور جس کی وجہ سے نہ صرف خلیفۂ ثالث کو مدینے میں قتل کیا گیا بلکہ خلیفۂ رابع، حضرت علیؑ کو سکون و اطمینان سے حکومت کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔

المختصر، ان حیرت انگیز اور عظیم فتوحات کے نتیجے میں اسلامی معاشرے میں موالی کی تعداد بڑھی، عربوں کو سابق الاسلام ہونے اور فاتح ہونے کی وجہ سے ان موالی پر خود بخود ایک نفسیاتی برتری حاصل ہوگئی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے سابقین اولین اور اصحاب بدر کو یہ برتری مولفۃ القلوب یا اعراب پر حاصل تھی۔ تاہم اس برتری میں کسی قسم کا بے جا احساس تفاخر نہیں تھا۔ البتہ اعراب میں بہت سے کندۂ ناتراش ایسے ضرور تھے جن سے عصبی جاہلیتوں کا مظاہرہ ہوجایا کرتا تھا، لیکن اسے عہد خلافت راشدہ کا عمومی مزاج نہیں گردانا جاسکتا۔

وہ غیر عرب جنہوں نے اسلام قبول کیا، انہیں بھی کیفیت ایمان کے اعتبار سے دو اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اولاً وہ موالی جن کا اسلام خالص تھا، انہوں نے اسلام کی روح کو اس طرح سمجھا کہ ان کی قلب ماہیت ہوگئی اسی گروہ سے ان اکابر علماء، مشائخ اور ارباب زہد وورع کا تعلق ہے جو پہلی صدی ہجری کے نصف آخر یا دوسری صدی ہجری میں اسلامی دنیا پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ثانیاً وہ موالی تھے جنہوں نے بظاہر اسلام قبول کرلیا تھا لیکن نفسیاتی طور پر وہ اپنے قدیم مذہب وثقافت کے حلقۂ اثر سے باہر نہیں آسکے تھے۔ ان کے ذہنوں سے اپنے قومی افتخار اور تہذیبی برتری کے خیالات محو نہیں ہوسکے تھے، اسی احساس نے آگے چل کر شعوبیت کی شکل اختیار کرلی، یہ طبقہ بلاشبہ اکثریت میں تھا، جس نے بعض اوقات اسلام کو شدید نقصان پہنچایا۔

خلاصہ بحث:

جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو مدینے کی اسلامی حکومت کا دائرہ جزیرۃ

العرب تک محدود تھا البتہ ہمسایہ اقوام کو اسلام کی دعوت جا چکی تھی اور ان کے ساتھ سرحدی جھڑپوں کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔ حضرت ابو بکر صدیق کے عہد خلافت میں فتوحات ملکی کے عظیم سلسلے کا آغاز ہوا جو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد تک جاری رہا، جس کے نتیجے میں عراق، ایران، شام اور مصر مکمل طور پر فتح ہو گئے۔ ان عظیم فتوحات کے نتیجے میں نہ صرف ایک وسیع رقبۂ زمین، مملکت اسلامیہ میں شامل ہوا بلکہ لاکھوں افراد، اسلامی ریاست کے شہری بنے، جن کا تعلق مختلف قومیتوں اور مختلف تہذیبوں سے تھا۔

ان مفتوحین کے پاس دو ہی راستے تھے، یا تو وہ اسلام قبول کر لیں اور مسلمانوں کے مساوی حقوق حاصل کر لیں، دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ جزیہ دینے پر آمادہ ہوں اور اسلامی حکومت میں اہل الذمہ بن کر رہیں۔ وہ مفتوحین جو اسلام لے آئے تھے، عموماً کسی عرب قبیلے کے ساتھ حلف یا ولاء کا معاملہ (عقد موالات) کر لیتے تھے۔ اس بنیاد پر وہ موالی کہلائے۔ موالی کی اس نئی قسم کو "موالی الاسلام" کہا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ ان کے لئے لازمی نہیں تھا کہ وہ عرب قبائل سے ہی عقد موالات کریں بلکہ ان کو اس بات کی آزادی تھی کہ وہ لوگ آپس میں مل کر جداگانہ قبیلے کی شکل اختیار کر لیں۔

عہدِ خلافت راشدہ میں خصوصاً حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں عرب، موالی کی قسم سے خارج ہو گئے، حضرت عمر فاروقؓ نے یہ لازم کر دیا کہ کوئی عرب کسی کا غلام نہیں رہ سکے گا۔ اسے لازماً چھ یا سات گائے کے عوض آزاد کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ان کے عہد میں اور بعد میں کوئی عرب، غلام نہیں رہ گیا۔

خلافتِ راشدہ کے دور میں ہونے والی فتوحات کے نتیجے میں ہزارہا غیر عربوں نے اسلام قبول کیا، ان غیر عرب نومسلموں (یعنی موالی) میں مختلف قومیتوں کے لوگ تھے، تاہم سیاسی اور سماجی اعتبار سے سب سے اہم کردار ایرانی موالی کا رہا جنہوں نے پہلی اور دوسری صدی ہجری کی اسلامی تاریخ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

وہ غیر عرب جنہوں نے اسلام قبول کیا، انہیں بھی کیفیت ایمان کے اعتبار سے دو

اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اولاً، وہ موالی جن کا ایمان خالص تھا، انہوں نے اسلام کی روح کو اس طرح سمجھا کہ ان کی قلب ماہیت ہوگئی۔ جبکہ دوسری طرف وہ موالی جنہوں نے مجبوراً اس لئے اسلام قبول کیا تھا کہ وہ بڑھتی ہوئی سیاسی طاقت تھی، خصوصاً ایرانی موالی اپنے شاندار سیاسی ماضی اور تمدن کی بنیاد پر عربوں کے مدمقابل آگئے۔ قومی عصبیت کے حوالے سے ایرانیوں کے لئے ''تسخیر ایران'' ایک عظیم سانحہ تھا جس نے مسلمان عربوں کی متحدہ جمعیت کے آگے ان کی قومیت کا شیرازہ بکھیر دیا تھا، جلد ہی ان کی یہ نفرت خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کے قتل کی صورت میں سامنے آئی۔



حوالہ جات:

۱۔ خلافت راشدہ کے دور کو خلافت علی منہاج النبوۃ کہتے ہیں کیونکہ یہ دور عہد رسالت سے متصل صالح اور متقی خلفاء کا وہ عہد حکومت ہے جسے امت محمدیہ کی اجتماعی تائید و حمایت حاصل تھی اور جس نے عدل و حق کے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے دین اسلام کے تمام ظاہری، باطنی، دنیوی اور اخروی تقاضے پورے کیے۔ اس دور خلافت میں چار خلفا گذرے:

۱۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ: ربیع الاول ۱۱ھ تا جمادی الآخرہ ۱۳ھ مطابق ۶۳۲ء تا ۶۳۴ء

۲۔ حضرت عمرؓ بن خطاب: جمادی الآخرہ ۱۳ھ تا ذوالحجہ ۲۳ھ مطابق ۶۳۴ء تا ۶۴۴ء۔

۳۔ حضرت عثمانؓ بن عفان: محرم ۲۴ھ تا ذوالحجہ ۳۵ھ مطابق ۶۴۴ء تا ۶۵۶ء۔

۴۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب: ذوالحجہ ۳۵ھ تا رمضان ۴۰ھ مطابق ۶۵۶ء تا ۶۶۱ء۔

یہ چاروں خلفا السابقون الاولون میں سے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے خاص تربیت یافتہ تھے، انہوں نے مجموعی طور پر تیس سال حکومت کی۔ اس عہد میں بہت سے ملکی معاملات اور سیاسی و تمدنی مسائل اجتہادی فیصلوں سے حل کیے گئے اور اس بات کا خصوصی اہتمام کیا گیا کہ عہد رسالت کی اسلامی روح کو مجروح نہ ہونے دیا جائے۔

۲۔ بصرہ کے لفظی معنی ''سیاہ سنگریزے'' کے ہیں۔ چونکہ اس علاقے میں سیاہ سنگریزے بکثرت

تھے، اس لئے اس جگہ کا نام بصرہ پڑ گیا۔ صحابیٔ رسول عتبہ بن غزوان بن یاسر پہلے شخص ہیں جنہوں نے حضرت عمرؓ کی ہدایت پر ۱۴ھ میں بصرہ شہر آباد کیا۔ (المعارف، ص ۲۴۶؛ طبری جلد ۳، ص ۵۹۰)

۳ شہر کوفہ میں قبائل کی آبادکاری کی تفصیل فتوح البلدان (ذکر تمصیر الکوفہ) اور طبری جلد ۴، ص ۴۰ تا ۴۸ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

۴ تاریخ طبری، جلد ۴، ص ۲۷۸۔

۵ فتوح البلدان، ص ۲۷۸؛ الکامل فی التاریخ، جلد ۳، ص ۳۲۔

۶ تمدن عرب، ص ۳۲۸، ۳۱۵۔

۷ اس کا اعتراف ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ اپنی کتاب Preaching of Islam میں کرتے ہوئے کہتے ہیں "اسلامی فتوحات کی یہ غلط توجیہ و تاویل اس مفروضے پر مبنی ہے کہ وہ جنگیں جو دراصل کفار کے ملکوں میں اسلامی حکومت و سطوت قائم کرنے کے لئے لڑی گئی تھیں، ان سے غیر مسلموں کا تبدیلِ مذہب مقصود تھا۔" گولڈ زیہر (Goldziher) نے سلطنت اسلام کی توسیع اور مذہب اسلام کی تبلیغ کے درمیان بہت خوبی سے تمیز کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "حضرت محمدؐ نے دیار عرب میں کفار کے ساتھ جو محاربہ کیا اور اپنے پیروؤں کو بھی اس کی وصیت کی، اس میں انہوں نے کفار کو مسلمان بنانے پر اتنا زور نہیں دیا جتنا اس بات پر کہ ان کو اپنے دائرہ حکومت میں داخل کیا جائے، جو بالفاظ دیگر حکومتِ الٰہیہ تھی۔ لہٰذا صدر اسلام کی اسلامی فتوحات کے دوران بھی مسلمان مجاہدین کا مقصد اولین یہ نہیں تھا کہ غیر عرب مذاہب کے لوگوں کو مسلمان بنا لیا جائے بلکہ ان کی غرض و غایت یہ تھی کہ ان کو حکومتِ الٰہیہ کے تابع کیا جائے۔ (ص ۹، حاشیہ بحوالہ گولڈ زیہر، Vorlesungen Uber DenIslam، ص ۲۵)

۸ تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۳۶۱، ۳۶۲، ۵۲۸، ۵۷۳، جلد ۴، ص ۱۱، ۱۳؛ الکامل فی التاریخ، جلد ۲، ص ۳۶۶؛ کتاب الاموال، ص ۲۰۱۔

۹ کتاب الاموال، ص ۲۲۱۔

۱۰ ایضاً۔

۱۱ قدیم عربوں میں قبائل ربیعہ میں سے بنی بکر بن وائل اور بنو تغلب بن وائل اہم قبیلے تھے۔

افتراق قبائل کے بعد بنو ربیعہ کے دوسرے قبائل کے ساتھ بنو تغلب بھی کوہستان نجد، حجاز اور تہامہ کی سرحدوں پر قابض ہو گئے، تاہم وہ آہستہ آہستہ الجزیرہ میں منتقل ہوتے رہے لہٰذا پہلی صدی ہجری میں ان کا مرکز وسطی الجزیرہ تھا۔ ظہور اسلام سے کچھ پہلے نصرانیوں سے اختلاط بڑھ جانے کی وجہ سے ان میں مسیحیت نے جڑ پکڑ لی انہوں نے آخر وقت تک اسلام کی مخالفت کی یہاں تک کہ فتح مکہ کے بعد جب اسلام مضبوط ہو گیا تو ۹ھ (عام الوفود) میں بنو تغلب کا وفد مدینے آیا۔ ان میں بعض مسلمان تھے اور بعض عیسائی جو سنہری صلیبیں پہنے ہوئے تھے۔ یہ اپنے ایمان میں بس اتنے ثابت قدم تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جب سجاح نے نبوت کا دعویٰ کیا تو بنو تغلب اس کے ہمراہ تھے۔ یہ اپنے آپ کو عرب بدوؤں سے ممتاز سمجھتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ ہم بدو نہیں بلکہ "مستعرب" "مبطی" ہیں۔ یہ زراعت پیشہ تھے، گھوڑوں کو تربیت دینے اور پرورش کرنے میں بھی مشہور تھے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ ملاح بھی تھے اور ان کی کشتیوں کی تجارت ان کے لئے اثر و رسوخ کا ذریعہ تھی اور شاید یہ بات بجا طور پر کہی گئی ہے کہ اگر اسلام کا ظہور کچھ عرصے بعد ہوتا تو تغلب نے لوگوں کو نگل لیا ہوتا۔

۱۲ تاریخ طبری، جلد۲، ص۲۰۔

۱۳ تاریخ طبری، جلد۳، ص۳۳۶۔

۱۴ Hernan Santa Cruz, *Racial Discrimination*, p. 1, New York, 1971.

۱۵ تمدن عرب، ص۱۳۱۔

۱۶ ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ، *Preachings of Islam*، ص۵۵ (بحوالہ پرنس کاتانی Annali de l' Islam یعنی تواریخ اسلام، جلد۵، ص۳)

۱۷ Nicholson, R. A., *A Literary History of the Arabs*, p 185, Cambridge, 1953.

۱۸ تمدن عرب، ص۲۳۳۔

۱۹ حمید اللہ، رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص۱۸۹۔ (بحوالہ دخوے *Memoirs sur la conquete dele syric*, p. 22.

۲۰ طبری، جلد۳، ص۳۵۰، ۳۵۳، ۳۸۵۔ (ان اوّلین ایرانی قیدیوں میں ابو زیاد (مولیٰ بنی

ثقیف)، ابوعمرہ (جو عبداللہ بن عبدالاعلیٰ، شاعر کے دادا تھے)، سیرین (ابو محمد ابن سیرین کے والد)، علاثہ (جو ابوعمرہ کہلائے)، حریث (جو بنی عباد کے ایک شخص کو دیے گئے) اور حمران (جو حضرت عثمانؓ کو دیے گئے) وغیرہ چالیس افراد تھے۔ طبری، جلد ۳، ص ۳۷۷۔)

۲۱۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، جلد ۲، ص ۳۶۳۔

۲۲۔ تاریخ طبری، جلد ۴، ص ۸۰ (حضرت امیر معاویہ والی شام نے حضرت عمرؓ سے بحری جنگ کی اجازت طلب کی تھی۔ حضرت عمر نے حضرت عمروؓ بن عاص سے سمندری مہم کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے اپنے خط میں سمندری مہم کی جو تصویر کشی کی اس سے حضرت عمرؓ سخت متردد ہوئے اور انہوں نے حضرت امیر معاویہ کو دوٹوک جواب دے دیا کہ پورے روم کے مقابلے میں ایک مسلمان کی جان زیادہ قیمتی ہے لہٰذا آئندہ مجھ سے یہ درخواست نہ کرنا۔)

۲۳۔ ابن عبد ربہ الاندلسی، ابی عمر احمد بن محمد، عقد الفرید، جلد ۳، ص ۳۱۲، مطبعۃ الجنۃ التالیف والترجمہ والنشر، قاہرہ، ۱۳۷۲ھ/ ۱۹۵۳ء۔

۲۴۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے جو کوفے کے عامل تھے انہیں خط لکھ کر ایرانی غلام ابولولو فیروز کے لئے سفارش کی تھی کہ وہ لوہار، بڑھئی اور نقاش ہے۔ ایسے کاریگر غلام کو مدینے میں آنے کی اجازت دیں، حضرت عمرؓ نے اسے اجازت دے دی جو بعد میں آپ کا قاتل نکلا۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد ۳، ص ۳۴۵)

۲۵۔ الطبقات الکبری، جلد ۳، ص ۲۹۶؛ فتوح البلدان، ص ۴۳۶۔

۲۶۔ Ameer Ali, Syed, *A Short History of the Saracens*, p. 58.

۲۷۔ تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۵۲۲۔

۲۸۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ۔

۲۹۔ تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۳۳۹۔

۳۰۔ تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۳۳۱۔

۳۱۔ تاریخ طبری، جلد ۴، ص ۹۳؛ الکامل فی التاریخ، جلد ۲، ص ۵۵۳؛ کتاب الاموال، ص ۱۸۱۔

۳۲۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۷، ص ۳۵۳، مقالہ "جندی شاپور"، مقالہ نگار *C. L. Huart*

۳۳۔ ابن ہشام، جلد ۲، ص ۱۴۸۔ یہ حدیث سنن ابی داؤد، کتاب الدیات۔ سنن نسائی، کتاب القسامہ میں بھی بیان کی گئی ہے۔

۳۴۔ رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۱۹۴، ۱۹۶۔

۳۵ نعمان بن منذر کی حکومت کے خاتمے کے بعد (یعنی ۶۰۲ء تا ۶۰۵ء کے درمیان کسی وقت) ایاس بن قبیصہ کی حکومت شروع ہوئی۔اسی کے دور میں جنگ ذی قار ہوئی، جبکہ قبیصہ کی حکومت ۶۱۱ء تک چلی۔ ان حقائق کی روشنی میں یوم ذی قار کی تاریخ ۶۰۴ء تا ۶۱۱ء کے درمیان متعین کی جاسکتی ہے۔

۳۶ الاستیعاب، جلد ۱، ص ۷۳۔

۳۷ رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۱۹۸۔

۳۸ رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۱۳۲، ۱۵۳۔

۳۹ طبری، جلد ۳، ص ۳۰۳، ۳۰۴۔

۴۰ طبری، جلد ۳، ص ۹-۲۶۷۔ (سجاح کے ہمراہ جو سردار آئے تھے انہوں نے بعد میں عراق کے مختلف محاذوں پر مسلمانوں کے خلاف سخت معرکہ آرائی کی تھی اور شکست کھا کر راہ فرار اختیار کی تھی۔)

۴۱ المثنیٰ بن حارثہ بن سلمہ بن ضمضم بن سعد بن مرہ بن ذہل بن شیبان، دور اول کے بڑے بہادر اور جری سپاہی تھے۔ الشیبانی نسبت تھی، ان کا قبیلہ ذہل بن شیبان زمانہ جاہلیت میں لوٹ مار اور غارت گری کے لئے بدنام تھا۔ خاص طور پر بنو العنبر ان کے ہاتھوں بڑے نالاں تھے۔ مثنیٰ نے ۹ھ میں اسلام قبول کیا۔ دور صدیقی کے وہ پہلے سالار لشکر تھے، جنہوں نے ایرانیوں کے خلاف میدان کارزار گرم کیا۔ ان کو سواد عراق پر حملہ کرنے کا شرف اولیت حاصل ہے عہد فاروقیؓ میں بھی مثنیٰ نے بہت سے معرکوں میں حصہ لیا اور کارہائے نمایاں انجام دیے۔ جنگ جسر میں شدید زخمی ہوئے اور جانبر نہ ہوسکے (۱۴ھ)۔ ان کی وفات کے بعد ان کی زوجہ سلمٰی بنت حفص، سعد بن ابی وقاص کے نکاح میں آگئیں۔ قادسیہ کی جنگ کے دوران مثنیٰ کی بہادری کو یاد کرتیں تو سعد سخت غیرت کھاتے اور بعض اوقات طیش میں آجاتے۔

۴۲ البدایہ و النہایہ، جلد ۷، ص ۱۱۲۔

۴۳ الطبقات الکبریٰ، جلد ۳، ص ۳۳۸۔



باب پنجم

موالی: معاشرے کا جارح عنصر

حضرت حسنؓ کی خلافت سے دستبرداری اور حضرت معاویہؓ کے برسر اقتدار آنے کے ساتھ ہی خلافتِ بنوامیہ کا دور شروع ہوا۔ عام طور پر اموی عہد کو خلافتِ راشدہ سے جدا کیا جاتا ہے کیونکہ یہ خلافت، طاقت اور عصبیت کے بل بوتے پر حاصل کی گئی تھی، جس کے حصول میں ہزاروں مسلمانوں کا خون بھی بہا تھا۔ اس سے قبل خلافت انتخاب اور اجماع سے قائم کی جاتی تھی۔ پھر بعد از خرابیِ بسیار جب یہ خلافت حضرت معاویہؓ کو حاصل ہوگئی تو انہوں نے اسے موروثی خلافت میں بدل دیا جس کا عربوں کے نیم جمہوری طرزِ فکر میں کوئی تصور نہ تھا۔ حالانکہ یہ بات کچھ اتنی مبنی بر حقیقت بھی نہیں۔ قصی بن کلاب نے جس شہری ریاستِ مکہ کی بنیاد ڈالی تھی اس میں تمام عہدے، مختلف قبائل میں موروثی طور پر قائم کیے گئے تھے۔

بہرحال یہ دونوں باتیں اموی عہد کو خلافتِ راشدہ سے جدا کر دیتی ہیں تاہم باقی خلافت کا ڈھانچا، اس کا مزاج اور صفات آہستہ آہستہ بدلیں، یہ نہیں ہوا کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد ایک دم ہی حالات بدل گئے اور معاشرہ اخلاقی تنزلی کا شکار ہوگیا۔ جو معاشرہ خلافت راشدہ کے عہد میں تاریخ کا پاکیزہ ترین معاشرہ تھا، وہ اتنی سرعت سے پست ترین معاشرے میں تبدیل ہو جائے۔ عقلی اعتبار سے یہ بات قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اصل صورت حال یہ تھی کہ حضرت معاویہؓ ایک اچھے مسلمان خلیفہ تھے، جنہوں نے اپنے دور

خلافت میں خلافتِ راشدہ کی صفات کو قائم رکھنے کی پوری پوری کوشش کی۔

یہ تو صحیح ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد شخصی حکومتوں کا دور آ گیا، لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ یہ حکومتیں جمہور کی رائے سے قطعاً آزاد اور غیر متاثر تھیں۔ قبائلی غلبے کی بنا پر حاکم ہو جانے والے سلاطین کو بھی معاشرے اور جمہور کی رائے کا احترام کرنا پڑتا تھا۔

اموی عہد کا معاشرہ ایک مختلف النوع معاشرہ (Heterogenous Society) تھا، جس میں عربوں کے علاوہ مختلف قومیتوں کے غلام اور موالی بھی نظر آتے ہیں۔ جو اپنی علاقائی نسبتوں، صلاحیتوں، مزاجوں، سیاسی رجحانات، مذہبی عقائد اور تہذیبی رویوں کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ ذمیوں میں بھی انہی اقوام کے وہ لوگ شامل تھے جنہوں نے اسلام کے مقابلے میں جزیہ کو اختیار کیا تھا اور بعینہٖ یہی صورت حال غلاموں کی تھی جو مختلف قوموں سے تعلق رکھتے تھے۔

اس قدر مختلف الخیال ہونے کے باوجود عربوں اور موالی کو چند مشترکہ اقدار نے ایک دوسرے سے جوڑے رکھا تھا: ایک تو اسلام تھا جو اُن سب کا مشترک دین تھا اور جس میں اتنی صلاحیت بہرحال تھی کہ وہ انتہائی مختلف النوع اقوام کو متحد و مجتمع رکھ سکے۔ دوسرے ایک حکومت اور ایک خلیفہ کی بیعت کے طوق نے انہیں یکجا کر رکھا تھا، یہ ساری مختلف قومیں ایک قانون کی مطیع اور حکومت میں ایک نظام کی تابعِ فرمان تھیں، تیسری عربی زبان تھی، گو کہ ابتدائی اموی عہد میں مملکت میں مختلف زبانیں ایک ساتھ چل رہی تھیں، مگر بعد میں عبدالملک بن مروان نے جب عربی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا تو مشترکہ امور میں ایک اور امر کا اضافہ ہو گیا۔ تاہم یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ ایک ایسا یک جان معاشرہ تھا جس میں کسی قسم کا تضاد، اختلاف اور کشمکش نظر نہیں آتی، ایسا تو اتنے مختلف النوع معاشرے کے لئے ممکن بھی نہیں تھا، لہٰذا ہمیں اموی معاشرے کے دونوں طبقات یعنی عرب اور موالی کے درمیان ایک کشمکش کی رو چلتی نظر آتی ہے۔

اموی عہد کے ابتدائی دور میں موالی، خصوصاً ایرانی موالی جارح اور طالع آزما نظر آتے ہیں، ان کا ایک سیاسی ماضی تھا جو ان کے اعتبار سے شاندار بھی تھا، لہٰذا انہوں نے اس کے اعادے کے لئے ہر اس طاقت کا ساتھ دیا جو بنی امیہ کی مخالفت کے لئے اٹھی۔ ان موالی نے براہ راست کوئی بڑی بغاوت تو برپا نہیں کی لیکن کسی جاری مخالفانہ تحریک میں شامل ہو کر بنو امیہ کے خلاف اپنے جذبات و احساسات کا اظہار ضرور کیا۔ اسی خواہش نے انہیں طائف کے ایک طالع آزما، مختار ثقفی کے گرد جمع ہونے پر آمادہ کیا۔ تاہم مختار کے مارے جانے کے بعد اور حجاج بن یوسف کی سخت حکمت عملیوں نے موالی کی جارحیت کا زور توڑ دیا۔

ایرانی موالی کو جارحیت کا ایک اہم موقع مختار ثقفی نے فراہم کیا۔ مختار بن ابی عبید ثقفی، جسے براکلمان "جھوٹا مدعی نبوت" (False Prophet) قرار دیتا ہے۔ا طائف کے قبیلہ بنو ثقیف سے تعلق رکھتا تھا۔ مختار ۱ھ/ ۶۲۲ء میں پیدا ہوا۔۲ ابتدائی زندگی مدینے اور طائف میں گزری تاہم ابن عبدالبر کے کہنے کے مطابق نہ اسے رسول اللہ ﷺ سے صحبت رہی نہ اس نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ روایت ہی کیا۔۳ اس کے والد ابو عبید ثقفیؓ جنگ جسر (۱۳ھ) میں شہید ہوئے تو مختار اپنے چچا سعد بن مسعود کی سرپرستی میں آ گیا۔ سعد ابن مسعود صحابی رسول تھے، جنہیں حضرت علیؓ نے اپنے دور خلافت میں مدائن کا حاکم بھی مقرر کیا تھا، جب سعد کو مدائن سے خارجیوں کے تعاقب میں جانا پڑا تو مختار ان کا نائب رہا۔۴

جب حضرت حسن نے ۴۱ھ میں امیر معاویہؓ کے مقابلے سے گریز کر کے والی مدائن سعد بن مسعود کے پاس پناہ لی تو مختار نے اپنے چچا کو یہ مشورہ دیا کہ حسن کو ان کے حریف کے حوالے کر دیا جائے۔۵ اور اس کے عوض امیر معاویہ سے امان، دولت اور عزت حاصل کر لی جائے۔ تاہم سعد کی شرافت اس حرکت کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اس ایک واقعے کے علاوہ عموماً اس کی ہمدردیاں شیعیانِ علی کے ساتھ رہیں مثلاً زیاد بن ابیہ کے سامنے اس نے حجر بن عدی کے خلاف شہادت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ نیز ۶۰ھ میں مسلم بن عقیل کی حمایت کی بلکہ طبری اور بلاذری کے بیان کے مطابق مسلم بن عقیل کوفے میں مختار ثقفی کے گھر پر اترے تھے۔۶ انہی

باتوں کو دیکھتے ہوئے عبید اللہ ابن زیاد، والی عراق نے اسے قید کر دیا تھا۔ اس کی قید کے دوران ہی واقعہ کربلا پیش آیا۔ بعد میں وہ اپنے بہنوئی عبداللہ ابن عمرؓ کی مداخلت پر رہا ہوا۔ ۸

اس کو رہا کرتے ہوئے والیِ کوفہ، عبید اللہ بن زیاد نے اسے تین دن کے اندر اندر کوفے سے نکل جانے کا حکم دیا، چنانچہ مختار مکے آگیا، جہاں عبداللہ ابن زبیر خفیہ طور پر اپنی خلافت کی تیاری میں مصروف تھے، اس نے اس شرط پر ان کی بیعت کرنی چاہی کہ وہ مختار کو کوفے کی گورنری دے دیں۔ ابن زبیر نے اس کی کوئی خاص حوصلہ افزائی نہیں کی تو وہ طائف چلا گیا۔ جہاں وہ سال بھر مقیم رہا۔ غالباً اسی زمانے میں اس کے ان خیالات میں پختگی آئی جن کی وجہ سے اس نے شیعی تحریک کو ایک نئے سیاسی اور مذہبی رنگ میں پیش کرنے اور ان کی قیادت سنبھالنے کا ارادہ کیا۔ اس ارادے کے ساتھ وہ مکے واپس آیا۔ محاصرۂ مکہ اور واقعہ حرہ میں اس کی شرکت کا پتا چلتا ہے۔ ۹ محاصرۂ مکہ کے دوران ہی یزید بن معاویہ کا انتقال ہوگیا اور عبداللہ ابن زبیر نے بصرہ، کوفہ، الجزیرہ اور شام کے بعض علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ مختار موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے کوفہ پہنچ گیا جو اس کے لئے سب سے بہتر جائے تحریک ہوسکتی تھی کیونکہ حضرت علیؓ کا مستقر حکومت رہنے کی وجہ سے کوفہ حامیان اہل بیت کا سب سے اہم مرکز تھا۔

اس زمانے (رمضان ۶۴ھ) میں کوفے کے شیعی، سلیمان ابن صرد الخزاعی ۱۰ کے زیر اثر تھے جو خفیہ طور پر حضرت حسینؓ کے خون کا انتقام لینے کے لئے اپنی قوتوں کو مجتمع کر رہے تھے۔ مختار، سلیمان کی اس تحریک میں شامل ہونا نہیں چاہتا تھا، اس لئے اس نے خود کو محمد ابن حنفیہ کا نمائندہ قرار دے کر ایک الگ تحریک شروع کردی اور کوفے میں موجود شیعیان علی سے بیعت لینی شروع کردی اور ایک بار پھر گرفتار ہوا، تاہم اس گرفتاری سے اسے سیاسی فائدہ ہی پہنچا۔

سلیمان ابن صرد الخزاعی کی معرکہ عین الوردہ میں شکست اور موت کے بعد مختار کی طاقت اور بڑھ گئی، سلیمان کے ہزیمت خوردہ سپاہی جب کوفے پہنچے تو مختار نے ان کو ملامت کرنے کے بجائے قید خانے سے ایک خط لکھا جس میں ان کی بڑی تعریف کی اور ان کے مجاہدانہ جوش کو سراہا اور ان کے دشمنوں کو اپنا دشمن گردانتے ہوئے ان کے خلاف جنگ کی نوید

دی جس پر وہ سب مختار سے مل گئے اس پر مستزاد یہ کہ اپنی چالاکیوں اور محمد ابن حنفیہ ۱۱ کی طرف سے لکھے گئے جعلی خط کی بناء پر وہ ابراہیم ۱۲ ابن اشتر کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو اس کی قوت دو چند ہوگئی۔ اپنے بہنوئی عبداللہ ابن عمر کی دوبارہ مداخلت پر وہ قید سے رہا ہوا۔ تقریباً بارہ ہزار کوفیوں نے مختار کی بیعت کر لی۔ موالی جو اس کے ساتھ شریک ہوئے، وہ اس کے علاوہ تھے۔

زیاد بن ابیہ کے زمانے (۴۵ھ تا ۵۳ھ) میں کوفے کی آبادی ایک لاکھ چالیس ہزار تھی، جن میں سے تنخواہ دار سپاہی ساٹھ ہزار تھے۔ باقی عورتیں، بوڑھے، بچے غلام اور موالی تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کم وبیش لائق جنگ آبادی کا بیس فیصد حصہ مختار کے ساتھ تھا جبکہ باقی آبادی گورنر کوفہ عبداللہ ابن مطیع کی طرفدار تھی جو کہ عبداللہ ابن زبیر کی طرف سے کوفے کے گورنر تھے اور جن کے مختار کے ساتھ دیرینہ مراسم بھی تھے۔ (آبادی کا ایک قلیل گروہ بنو امیہ کے ہوا خواہوں اور غیر جانبداروں کا بھی تھا)۔

بہرحال عربوں اور موالی کا ایک بڑا گروہ جب مختار کے ساتھ ہوگیا تو اس نے گورنر کوفہ عبداللہ ابن مطیع کے خلاف ربیع الاول ۶۶ھ میں خروج کیا۔ مختار کم عمری سے ہی سیاسی معاملات میں دخل دیتا آیا تھا۔ اسے سیاست گردی کا خاصا تجربہ ہو چکا تھا خصوصاً کوفے کے معاملات کو خوب سمجھتا تھا۔ مختار نہ تو قریشی تھا اور نہ کسی قبیلہ کا سردار۔ اس کو نہ تو خاندانی عظمت حاصل تھی، نہ مذہبی وجاہت، نہ قبائلی رسوخ، لیکن وہ ایک معاملہ فہم اور موقع شناس آدمی تھا۔ اس کے اندر حکومت اور اقتدار کی جو خواہش تھی وہ اسے حسب نسب کے زور پر نہیں حاصل کرسکتا تھا۔ لہٰذا اس نے دعوتِ انتقام اہل بیت کا سہارا پکڑ لیا تاکہ عوام الناس اس کی طرف متوجہ ہوں اور اپنی طاقت کا مرکز عربوں کو بنانے کے بجائے موالی کو بنایا۔ ان موالی میں اکثریت ایرانی موالی کی تھی جو حکومت کے موروثی ہونے کے قائل تھے کیونکہ اسلام سے قبل ان کے ملک میں بادشاہت ہمیشہ موروثی رہی تھی۔ ان کی رائے میں خلافت حضرت علیؓ کی اولاد میں رہنی چاہیے تھی۔ چونکہ مختار، حضرت علیؓ کے بیٹے ابن حنفیہ کے نمائندے کے طور پر سامنے

آیا تھا، لہٰذا موالی کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ پھر سب سے اہم بات یہ تھی کہ مختار کی کامیابی کی صورت میں شام پر عراق کو برتری حاصل ہو جاتی اور اس طرح وہ شراکتِ اقتدار کا اپنا خواب شرمندہ تعبیر کر سکتے تھے۔ چنانچہ کافی تعداد میں موالی مختار کی تحریک میں شامل ہو گئے۔

اس سے قبل یہ موالی اور غلام بظاہر اپنے آقاؤں کے ساتھ تھے، جن میں سے کسی کی ہمدردیاں بنو امیہ کے ساتھ تھیں تو کسی کی ابن زبیر کے ساتھ اور کوئی حامیان اہل بیت میں سے تھا۔ لیکن مختار کو اختیار کرنے کی صورت میں گویا ان موالی نے اپنے آقاؤں کے راستے سے خود کو الگ کر لیا تھا، جس کی وجہ سے عربوں کو سخت دھچکا پہنچا۔ یہ موالی، جنہیں "حمراء" کہہ کر پکارا جاتا تھا، زیادہ تر ایران کے حکمران طبقے سے تعلق رکھتے تھے، جو اساورہ اور مرازبہ کہلاتے تھے۔ یہ لوگ ۱۳ھ تا ۱۹ھ کی اسلامی فتوحات کے دوران مسلمان ہو گئے تھے اور خود کو ان عرب قبائل میں حلف و ولاء کی صورت میں ضم کر لیا تھا، جو رسول اللہ ﷺ کے قریب تر تھے۔

اس ضمن میں ایم۔ اے شعبان کی یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ موالی کے لئے مختار کی تحریک میں کوئی کشش نہیں تھی، مختار کی فوج میں ان کی تعداد صرف دو ہزار تین سو (۲۳۰۰) تھی، جو ایک معمولی تعداد ہے اور انہیں بھی محض غیر معمولی حال میں استعمال کیا گیا۔ شعبان لکھتا ہے:

"One point to emphasize is that he did not, as is generally believed, make a great appeal for support of the non-Arab converts, *'mawali'*. Admittedly we do hear of 2,300 *'mawali'* among his followers. Although probably exaggerated, that is a small number compared to the number of his Arab supporters. Their unimportance becomes clearer when one notes that they only recruited as an emergency measure to keep order in Kufa when the bulk of his supporters had been sent out to evangelize the country side, particularly to the north."[۱۳]

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ خروج کے وقت مختار نے شہر میں منادی کرادی کہ جو غلام ہم سے آملے گا اس کو آزاد کر دیا جائے گا۔ اس پیغامِ رحمت کو سن کر ہزاروں غلام بھاگ آئے اور مختار کی طرف سے جنگ میں حصہ لیا۔[۱۴]

چنانچہ گورنر کوفہ، عبداللہ ابن مطیع نے جنگ کے دوران اپنے فوجیوں کا خون گرم رکھنے اور انہیں ثابت قدم رہنے کے لئے اسی بات کا طعنہ دیا کہ تم لوگ اپنے غلاموں سے بھاگتے ہو! اس ضمن میں عبداللہ کی تقریر کا یہ حصہ قابلِ ذکر ہے:

"یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ تم ایک ذلیل، حقیر اور گمراہ چھوٹی سی جماعت کے مقابلے سے عاجز آگئے ہو۔ ان کے مقابلے پر چلو، اپنے حریم کی ان کے مقابلے میں حفاظت کرو۔ اپنے شہر اور اپنے خراج کو ان سے بچاؤ، ورنہ یاد رکھو کہ تمہارے حقوق میں غیر مستحق شریک ہوجائیں گے۔ بخدا مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان باغیوں میں پانچ سو افراد ایسے ہیں جو تمہارے موالی ہیں۔ ان کا امیر بھی انہی میں سے ہے، اگر ان کی تعداد زیادہ ہوگئی تو اس سے تمہاری عزت، حکومت اور دین سب خاک میں مل جائے گا۔"[۱۵]

بہر حال مختار ثقفی کے ساتھ جنگ کے نتیجے میں عبداللہ، گورنرِ کوفہ کی فوج کو شکست ہوئی اور عبداللہ بصرے کی طرف نکل گیا۔[۱۶] کوفہ پر قبضہ کرنے کے بعد مختار نے گورنر کی طرف سے لڑنے والوں کو امان دی اور غنائم کی تقسیم میں موالی کو برابر کا شریک کیا۔ کوفہ کا مختار کل بننے کے بعد مختار ثقفی نے بڑی سرعت سے عراق اور مشرقی ولایتوں میں اپنا سکہ جمالیا، ان میں موصل، آذربائیجان، ماہین، ہمدان، اصفہان، قم، حلوان اور ماسبذ ان کے علاقے شامل تھے، جہاں مختار نے اپنے حاکم مقرر کر دیے۔ تاہم عراق کا جنوبی علاقہ بشمول بصرہ، ابن زبیر کے قبضے میں باقی رہ گیا، جہاں عبداللہ ابن زبیر کی طرف سے مصعب ابن زبیر والی تھے۔

بظاہر یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ مختار نے حکومت پا کر اہلِ بیت کے قاتلوں یا ان کے مددگاروں کو کوئی سزا نہ دی حالانکہ "انتقامِ اہلِ بیت" اس کے دستور سیاسی کی نہایت

اہم دفعہ تھی۔ وہ عرب جو حضرت حسین کے خلاف، عبید اللہ ابن زیاد کی بھیجی جانے والی فوج میں شامل تھے اور قتل اہل بیت میں بالواسطہ ہی نہیں بلاواسطہ بھی شریک تھے، وہ کوفے ہی میں موجود تھے۔ مختار نے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی بلکہ سب کے ساتھ رواداری سے پیش آیا۔ شاید وہ اپنی حکومت مضبوط و مستحکم کرنے کے بعد یہ سنگین قدم اٹھانا چاہتا ہو۔ بہر حال تقریباً ایک سال تک اس نے قاتلین حسین کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ چنانچہ محمد ابن حنفیہ کا یہ شکوہ اس تک پہنچا کہ مختار ہمارے خاندان کا انتقام لینے کا مدعی ہے حالانکہ قاتلین حسین اس کے ندیم وجلیس ہیں اور شہر میں اطمینان سے تجارت کرتے ہیں۔ ۱۷ بہر حال جب کوفہ کے غیر شیعی اکابرین نے اس سے بغاوت کی اور اس میں ناکام ہوئے تو مختار نے ان کے خلاف تلوار سونت لی اور جنگ اور قتل حسین میں شرکت کرنے والا جو شخص بھی اس کے ہاتھ آیا اس کا سر قلم کرا دیا۔ مختار کے خلاف اشراف کوفہ کی بغاوت میں جو قبائل مختار کے خلاف متحد ہوئے ان میں کوفہ میں آباد بنی بجیلہ، بنو کندہ، بنو نخع، بنو قیس، تیم الرباب، بنو ربیعہ، بنو تمیم، بنی ازد اور بنی خثعم وغیرہ شامل تھے۔ عرب قبائل میں سے صرف بنو ہمدان مختار کے طرف دار تھے، اس طرف داری کا پس منظر یہ تھا کہ حضرت علیؓ بنو ہمدان کی طرف خاص میلان رکھتے تھے۔ انہیں ترجیح دیتے تھے اور ان کے بارے میں کہتے تھے "اگر میں جنت کے دروازے پر دربان ہوتا تو قبیلۂ ہمدان سے کہتا کہ سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ۔" نیز کہا "میں نے ہمدان کو تیار کیا اور انہوں نے حمیر کو تیار کیا۔" ۱۸ جنگ صفین میں ان کا ایک فرد بھی معاویہؓ اور اہل شام کے ساتھ نہیں تھا، ہاں البتہ غوطۂ دمشق کے کچھ لوگ شامل تھے۔ تاہم بعد میں مختار ثقفی اور مصعب بن زبیر کی جنگ میں بنو ہمدان کے لوگ دونوں طرف سے شریک تھے۔ چنانچہ طبری کے بیان کے مطابق ہمدان کے پانچ سو افراد جو مصعب کی فوج میں شامل تھے، ہلاک ہوئے۔ ۱۹

اشراف کوفہ کو مختار ثقفی سے جو شکایات تھیں ان میں سر فہرست یہی تھی کہ اس نے موالی کو اپنا تقرب عطا کیا اور سرکاری مال گزاری میں اس نے موالی کو بھی شریک کر لیا۔ در

اصل اس نے موالی کی ایک بڑی فوج تیار کر لی تھی جن کو سرکاری خزانے سے تنخواہ ملتی تھی۔ چنانچہ بعض عرب، جو شیعیانِ علی کے طور پر مشہور تھے، مثلاً احنف ابن قیس اور ان کا قبیلہ، وہ بھی مختار سے صرف اس لئے برگشتہ ہوگئے کہ اس نے موالی کو اپنا مقرب بنالیا تھا۔ انہی اشراف عرب میں ایک شبث بن ربعی تھا، جو اشراف کوفہ کا نمائندہ بن کر مختار کے پاس گیا اور اس نے ان الفاظ میں عربوں کی بے چینی کا تذکرہ کیا "جس طرح اللہ نے ہمیں یہ ملک (عراق) عطا فرمایا، اسی طرح موالی کو بھی بطور مالِ غنیمت ہمیں دیا، مگر آپ نے یہ غضب کیا کہ ان کو اپنا شریک کار بنایا، ہم نے انہیں آزاد کر دیا تا کہ اس کا اللہ کے یہاں سے اجر ملے اور یہ لوگ ہمارے شکرگزار رہیں، آپ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہماری آمدنی میں شریک کیا۔" ۴۰

اس سوال پر مختار نے جو جواب دیا وہ اہم ہے، اس نے کہا "اگر آپ لوگ یہ پختہ عہد کریں کہ میری حمایت میں آپ بنی امیہ اور ابن زبیر سے لڑیں گے تو ان موالی کو میں آپ کے سپرد کیے دیتا ہوں اور آپ کی مال گذاری کی آمدنی آپ ہی پر خرچ کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔ بشرطیکہ آپ لوگ میری حمایت کا ایسا عہد کریں جس سے مجھے اطمینان ہو۔" ۴۱

بہرحال یہ مذاکرات ناکام ہوگئے۔ مختار ثقفی کوفے کے عربوں کا اعتماد حاصل نہ کر سکا اگرچہ ان میں سے بیشتر حضرت علیؓ کے طرفدار تھے یا طرفداروں کی اولاد میں سے تھے۔ دراصل مختار موالی کی جانب، جن پر اس کی اصل قوت کا دار و مدار تھا، جس مہربانی اور عنایت کا اظہار کر رہا تھا وہ اس نظام کے لئے خطرے کا باعث بن گئی تھی، جس کی رو سے عربوں کو مقامی لوگوں پر سیاسی اور اقتصادی برتری حاصل تھی۔ دوسری طرف ایرانی موالی جنہیں جارح ہونے کے بجائے یک گونہ عربوں کا احسان مند ہونا چاہئے تھا کہ باوجود اس کے کہ عربوں نے عراق بزور فتح کیا تھا، وہ عراق کی زرخیز زمینوں کے مالک بھی بن سکتے تھے اور وہاں کی گرفتار شدہ رعایا یا شکست خوردہ رعایا کو اپنا لونڈی غلام بھی بنا سکتے تھے، مگر حضرت عمرؓ کی پالیسی کی وجہ سے ایسا کچھ نہیں کیا گیا چنانچہ ایرانی موالی اپنی زمینوں پر بدستور قابض

رہے اور حکومت کو خراج ادا کرنے لگے۔ عربوں نے انہیں اپنا غلام بنانے کے بجائے پھر سے عقدِ موالات قائم کر کے انہیں اپنی حفاظت میں لے لیا۔

لیکن خصوصاً ایرانی موالی عربوں کے خلاف عداوت اور کینہ رکھتے تھے۔ اس کا ایک سبب ان کی وہ سابقہ رعونت تھی، جس کی بناء پر عربوں (ترکوں اور دیلمیوں) کو اجڈ، وحشی اور جنگلی اقوام سمجھتے تھے اور ان کے دلوں میں ساسانی حکومت کے خاتمے کا کانٹا چبھتا ہی رہتا تھا اور بیشتر ایرانی موالی عربوں کے اقتدار سے چھٹکارا حاصل کرنے کے آرزومند رہتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نکلسن مختار کی تحریک کو امویوں کے خلاف نہیں بلکہ عربوں کے خلاف موالی کی تحریک سے تعبیر کرتا ہے۔۳۲ حالانکہ دیکھا جائے تو دونوں باتیں ایک ہی ہیں، یعنی اموی حکومت عربوں ہی کی حکومت تھی۔ اصل صورت حال یہ تھی کہ ایرانی موالی نے تشیع کے پردے میں دولتِ امویہ سے جنگ کی۔ ان کے دلوں میں سوائے عربوں اور عربوں کی حکومت کی ناپسندیدگی کے اور کوئی چیز نہیں تھی، وہ اپنی ''آزادی'' کے لئے اسی راہ سے کوشش کر رہے تھے۔ ۳۳ مقریزی کا بیان ہے کہ ایران کی سرزمین سے نو بنو اٹھنے والے اکثر فرقوں کے دینِ اسلام سے نکل جانے کا سبب یہ تھا کہ ایرانی قوم جو وسیع سلطنت کی مالک تھی، جس کا ہاتھ دوسری قوموں سے ہمیشہ اونچا رہتا تھا۔ جنہیں اپنی عظمت و سطوت کا قلبی شعور بھی تھا چنانچہ وہ خود کو آزاد اور سردار کہا کرتے تھے اور دوسرے لوگوں کو اپنا غلام سمجھتے تھے۔ جب وہ اس آزمائش میں مبتلا ہوئے کہ عربوں کے ہاتھوں ان کی سلطنت کا زوال عمل میں آیا تو یہ بات ان کو بڑی ہی شاق گزری اور اس مصیبت نے ان کے گھروں میں کہرام مچا دیا۔ مختلف اوقات میں وہ اسلام کو شکست دینے کے لئے جنگ آزمائیاں کرتے رہے۔ انہیں جب اس طرح کامیابی نہ ہوئی تو خفیہ تدابیر کیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے بظاہر مسلمان بن کر اور اہل بیت کی محبت ظاہر کر کے شیعوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کر لیا اور حضرت علیؓ اور ان کی اولاد پر جو ظلم ہوا تھا اس کی آڑ لے کر متفرق راہوں پر چل نکلے اور مسلمانوں کو صحیح راستے سے بھٹکا کر گمراہی کے غار میں دھکیل گئے۔۳۴

موالی کی عربوں سے عداوت طے شدہ بات تھی۔ طبری میں ایک اہم واقعہ ملتا ہے کہ ایک دن مختار ثقفی کوفے کے غیر شیعی اکابر کے ساتھ بڑے جوش وانہماک سے باتیں کر رہا تھا۔ یہ بات مجلس کے غیر عرب اعیان کو شاق گزری اور انہوں نے شکایت کے طور پر ابو عمرہ کیسان سے کہا "دیکھتے ہو! ابو اسحاق عربوں کی طرف کتنا ملتفت ہے اور ہماری طرف دیکھتا تک نہیں۔" مجلس ختم ہوئی تو مختار نے کیسان کو بلا کر پوچھا کہ غیر عرب اعیان تم سے کیا سرگوشی کر رہے تھے؟ تو اس نے کہا کہ وہ عربوں کے ساتھ آپ کے التفات اور اپنے ساتھ آپ کی سرد مہری کی شکایت کر رہے تھے۔ مختار رازداری سے بولا، تم ان سے کہہ دینا کہ میرے اس طرز عمل سے دل پر ذرا میل نہ آنے دو، ہم تم ایک ہیں، یہ کہہ کر وہ کافی دیر تک خاموش رہا، پھر یہ آیت تلاوت کی انا من المجرمین منتقمون۔ یعنی [ہم مجرموں سے انتقام لے کر رہیں گے۔] مختار کا اشارہ قاتلینِ حسینؓ کی طرف تھا۔ مختار کا یہ پیغام سن کر موالی خوش ہو گئے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے، خوش ہو جاؤ اور سمجھ لو کہ ابو اسحاق نے عربوں کو ختم کر دیا۔ ۲۵

اسی بات کا اظہار کوفے کے ایک اور سرکردہ عرب عبدالرحمن ابن مخنف نے بھی کیا تھا جبکہ وہ اشرافِ کوفہ سے گفتگو کر رہا تھا، اس نے کہا "مجھے ڈر ہے کہ تم میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ مختار کے ہمراہ تمہارے غلام اور موالی ہیں جو پوری طرح متحد ہیں۔ تمہارے غلام اور موالی دوسرے لوگوں کے مقابلے میں تم سے زیادہ شدید عداوت اور کینہ رکھتے ہیں۔ ۲۶ بہرحال کوفے کے عربوں نے مختار کے خلاف خروج کر دیا۔ یہ خروج سرکاری افواج کی عدم موجودگی میں ہوا جو ابراہیم بن اشتر کی قیادت میں عبدالملک کے خلاف جنگ پر گئی ہوئی تھیں۔ لیکن ابن اشتر کی بروقت واپسی نے اس خروج کو ناکام بنا دیا۔ اس جنگ کو "احاطہ سبیع" کا معرکہ بھی کہتے ہیں۔ یہ جنگ بدھ ۲۴ رذی الحجہ ۶۶ھ / جولائی ۶۸۶ء کو ہوئی ۲۷ جس میں عربوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سے کوفی عرب مارے گئے جن کی تعداد پانچ سو کے قریب بتائی جاتی ہے۔ اس بغاوت کے بعد مختار ثقفی نے عربوں کو نہیں چھوڑا، خصوصاً ان لوگوں کو چن چن کر قتل کرا دیا جو لوگ قتلِ حسینؓ میں مطلوب تھے۔ اس ضمن میں اقدامات کرتے

ہوئے مختار نے اپنے موالی کیسان ابو عمرہ کو اپنی خاص فوج کا سردار مقرر کیا، اسے ایک ہزار کدال زن آدمی دیئے اور حکم دیا کہ ان تمام افراد کے گھر زمین بوس کر دو جنہوں نے حضرت حسینؓ کے خلاف یزیدی فوج میں شامل ہو کر جنگ کی تھی۔ نہ صرف وہ لوگ قتل ہوئے، بلکہ ان کے مکان بھی مسمار کرا دیئے گئے اور ان کو ملنے والا وظیفہ بھی ضبط کر کے مختار اپنے حامی موالی کو دلا دیتا۔ ۲۸ اس طرح قتل ہونے والے عربوں کی تعداد دو سو اڑتالیس (۲۴۸) تھی۔ ۲۹ باقی بچ جانے والے تمام شراف و عمائدین کوفہ مصعب ابن زبیر ۳۰ کے پاس بصرہ چلے گئے۔ ۳۱

اگلے ہی مہینے ایرانی موالی کو موقع فراہم ہوا کہ وہ براہ راست شامی فوجوں سے ٹکر لیں۔ شامی فوجیں عبید اللہ ابن زیاد کے تحت تھیں جبکہ کوفے کی فوجیں ابراہیم بن اشتر کی سرکردگی میں تھیں جن میں موالی کی بڑی تعداد تھی۔ ایک اندازے کے مطابق بیس ہزار ایرانی موالی تھے جبکہ کل فوجوں کی تعداد تیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس سلسلے میں دینوری ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جب ابراہیم بن اشتر کی فوج نے پڑاؤ کیا تو شامی لشکر گاہ سے بنو قیس کے دو افراد فرات بن عالم اور عمیر بن حباب چھپ چھپا کر ابن اشتر کے پاس پہنچے۔ یہ دونوں قاتلین حسینؓ میں سے تھے، لیکن بنو مروان سے ناراض تھے اور ان کے مقابلے میں ابن اشتر کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ جب وہ ابراہیم سے ملے تو انہوں نے بڑی دلچسپ بات کہی۔ عمیر نے کہا ''جس وقت سے تمہاری لشکر گاہ میں داخل ہوا ہوں شدید کرب کا شکار ہوں، اس کا سبب یہ ہے کہ جب تک تمہارے پاس پہنچ نہیں گیا میں نے کوئی عربی گفتگو نہیں سنی، جس کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے ساتھ جو لوگ ہیں وہ سارے عجمی ہیں۔'' ۳۲

ان عجمیوں (ایرانی موالی) کے بارے میں ابراہیم کا جواب تھا ''یہ لوگ عجمی شہسواروں اور مرزبانوں کی اولاد ہیں۔'' ۳۳

اس جنگ میں ابراہیم بن اشتر فاتح رہا، شامی فوج پسپا ہو گئی۔ اس پسپائی میں فرات

بن عالم اور عمیر بن حباب کی کارگزاریوں کا بھی ہاتھ تھا، شامیوں میں سے حصین بن نمیر السکونی، شرحبیل بن ذی کلاع اور عبید اللہ ابن زیاد مارے گئے۔ یہ واقعہ محرم ۶۷ھ بمطابق اگست ۶۸۶ء کا ہے۔ شامی لشکر گاہ پر قبضہ کر لیا گیا اور جو کچھ تھا لوٹ لیا گیا۔ ۳۴

بنو امیہ کی شامی افواج سے ایرانی موالی کی یہ پہلی براہ راست اور خطرناک جنگ تھی۔ ایرانی موالی کا یہ وہ خطرناک فوجی اور سیاسی اقدام تھا جس کا انہیں خمیازہ بھگتنا پڑا۔ چنانچہ بعد میں عبدالملک بن مروان نے عراق پر قابض ہو جانے کے بعد ان موالی کے خلاف سخت اقدامات کیے، ان کو اہم سیاسی عہدوں سے محروم رکھا گیا، ان کا سماجی مرتبہ گھٹایا گیا اور انہیں باقی ماندہ اموی دور میں کمتری اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری طرف چونکہ ان ایرانی موالی نے کوفی عربوں سے اپنے تعلقات بگاڑ لیے تھے، لہٰذا ان عربوں نے مستقبل قریب میں ان موالی کی حمایت میں کبھی لب کشائی کی ضرورت محسوس نہ کی۔ البتہ انہیں خَشَبِیَۃ یعنی لٹھ باز کا اہانت آمیز نام دیا۔ ۳۵

ادھر دوسری طرف "احاطہ سبیع" کے شکست خوردہ عربوں نے جب مصعب بن زبیر سے مدد چاہی تو اس وقت بھی اشراف کوفہ مثلاً شبث بن ربعی اور محمد ابن اشعث وغیرہ نے موالی ہی کا مسئلہ اٹھایا اور کہا "ہمارے غلام اور موالی ہم پر چڑھ دوڑے ہیں، اب آپ ہماری مدد کیجیے اور مختار پر فوج کشی کیجیے۔" ۳۶ محمد ابن اشعث کی گفتگو کا غالب حصہ یہی موالی تھے۔ اس نے کہا:

"اے امیر! آپ کو اس کذاب (مختار) پر چڑھائی کرنے سے کون سی چیز مانع ہے۔ اس کذاب نے ہمارے بہترین افراد کو تہ و تیغ کر دیا ہے، گھر گرا دیے ہیں ۳۷ ہماری جمعیت کو منتشر کر دیا ہے، عجمیوں کو ہماری گردنوں پر سوار کر دیا ہے اور انہیں کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ جس طرح چاہیں ہمارے مال و متاع کو لوٹیں۔ آپ اس پر حملہ آور ہوں، ہم آپ کے ساتھ ہیں، علاوہ ازیں کوفے کے دیگر تمام عرب بھی آپ کے ساتھی اور مددگار ہوں گے جنہیں ہم

اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔"۳۸ھ

بہرحال مصعب ابن زبیر نے مختار ثقفی سے فیصلہ کن معرکے کا قصد کرلیا اور مہلب بن ابی صفرہ کی اعانت سے مختار ثقفی کے خلاف فوجی کارروائی کی۔ مصعب کی فوج عربوں کی فوج تھی، جن میں بنی تمیم، بکر بن وائل، بنو عبد قیس، بنو ازد اور نجد کے بعض قبائل شامل تھے جبکہ دوسری طرف مختار کی فوج عرب و موالی کی متحدہ فوج تھی، جس کا سپہ سالار ایک عرب احمد بن شمیط ۳۹ھ تھا۔ تاہم اس نے موالی کی جماعت پر کیسان بن عمرہ کو سردار بنایا تھا۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اس بار ابراہیم ابن اشتر کو سپہ سالاری نہیں دی گئی، کیونکہ ابن اشتر مختار کی سیادت کی مطلقاً پروا نہیں کرتا تھا۔ ۴۰ھ ابن کثیر کا بیان ہے کہ ابراہیم ابن اشتر نے جب ابن زیاد کو قتل کر دیا تو نواح میں خود مختار ہو گیا اور اس نے بلاد اقالیم کو اپنے لئے جمع کرلیا اور مختار کو کمتر سمجھا۔ ۴۱ھ

عرب و موالی کی یہ مشترکہ فوج باہم یک جان دو قالب نہیں تھی، چنانچہ دونوں طرف سے عصبیت کا اظہار ہوتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر ایک عصبیت پسند عرب سردار عبداللہ ابن وہب الجشمی نے اس بات میں کوئی کسر نہ چھوڑی کہ اس جنگ میں سارے موالی ہلاک ہو جائیں۔ عبداللہ فوج کے میسرہ کا سردار تھا اور موالی کے خلاف تعصب رکھتا تھا۔ جنگ شروع ہونے سے قبل یہ احمر ابن شمیط کے پاس آیا اور اس کو مشورہ دیا کہ آپ نے موالی میں سے زیادہ تر کو گھوڑوں پر سوار کر دیا ہے اور خود پا پیادہ ہیں۔ یہ موالی اور غلام جنگ کی شدت میں ہرگز ثابت قدم نہ رہ سکیں گے اور گھوڑوں سمیت فرار ہو جائیں گے، لہٰذا انہیں پا پیادہ کر دیں تاکہ انہیں ثابت قدم رہ کر لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔ ۴۲ھ ابن شمیط یہ سمجھا کہ یہ مشورہ نیک نیتی سے دیا جا رہا ہے، لہٰذا اس نے ایسا ہی کیا اور موالی گھوڑوں سے اتروا لیے گئے۔

بہرحال مختار کی افواج کو پہلے دجلہ کے کنارے مذار کے مقام پر شکست ہوئی۔ یہ علاقہ بصرہ سے تقریباً سو میل شمال مغرب میں تھا۔ اس کے کچھ عرصے بعد حروراء کے مقام پر تو شیعی افواج بالکل ہی درہم برہم ہو کر رہ گئیں۔ حروراء کوفہ سے دو میل پر ایک گاؤں تھا۔ جنگ

مذار نے مختار کے قصرِ اقبال کی بنیادیں ہلا دیں، یہ اس کی بڑی فوجی شکست ہی نہ تھی بلکہ اس کی اخلاقی اور الہامی ہزیمت بھی تھی۔ اب تک وہ نبی اور کاہن بنا ہوا تھا، جس کے پاس جبرئیل امین آتے تھے، جس کے تصرف میں مافوق الانسان قوتیں تھیں۔ اس کے ساتھ فرشتوں کے لشکر لڑتے تھے۔ فوج بھیجتے وقت اس نے پیش گوئی کی تھی۔

والذی کرّم وجه ابی القاسم لیدخلنّ ابن شمیطٍ البصرة فی عافیة صافیة. قضاءً مقضیاً. و قد خاب من امتریٰ و قد بعثت معه برایة ماغزلتها یدٌ ولا نسجها نساجٌ.

یعنی [قسم ہے اس خدا کی جس نے ابوالقاسم (ابن حنفیہ) کو عزت عطا کی ابن شمیط سلامتی کے ساتھ بصرے میں داخل ہوگا۔ خدا کا یہ اٹل فیصلہ ہے اس میں شک کرنے والا نامرادی کا منہ دیکھے گا۔ میں نے اس کے ساتھ ایک علم روانہ کیا ہے جس کو نہ کسی ہاتھ نے کاتا ہے نہ کسی بننے والے نے بنا ہے۔]

مختار نے علم ابن شمیط کو اس تاکید کے ساتھ دیا کہ دن کے ایک مقرر وقت میں اسے کھول کر علم بلند کرے، جونہی دشمن کی نظر اس پر پڑے گی، وہ شکست کھا کر بھاگ جائے گا۔ ۴۳

لیکن ایسا کچھ نہ ہوا تو پہلی بار ایرانی موالی بھی تذبذب کا شکار ہوئے انہوں نے کہا ''ایں بار دروغ گفت'' (اس بار مختار کی پیش گوئی جھوٹی نکلی)۔ ۴۴

اس فیصلہ کن شکست کے بعد مختار کے پاس اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے قصر میں محصور ہو کر جب تک ہو سکے مدافعت کرے۔ چنانچہ مختار نے کوفے کے قصر امارت میں پناہ لی اور بڑی بہادری سے وہاں چار ماہ ۴۵ تک مقابلہ کرتا رہا۔ آخر کار اس کے بہت سے حامی اس کا ساتھ چھوڑ گئے اور وہ خود مایوسی کے عالم میں اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ قصر سے نکل کر حملہ آور ہوا اور مارا گیا۔ یہ ۱۴ رمضان ۶۷ھ/ ۶۸۷ء کا واقعہ ہے، اس وقت مختار کی عمر ۶۷ برس تھی۔ ۴۶

مختار کے باقی ماندہ ساتھی قصر میں مزید دو ماہ محصور رہے حتیٰ کہ ان کا سامان رسد ختم ہوگیا اور انہیں غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے پڑے۔ مصعب ابن زبیر نے ان سب کو قتل کرادیا، وہ کل چھے ہزار تھے، دو ہزار عرب اور چار ہزار عجم (موالی) یہ دینوری کا بیان ہے۔ جبکہ طبری کے مطابق ان چھے ہزار میں سے صرف سات سو عرب تھے اور باقی اہل عجم (موالی) تھے۔ ۴۷
مصعب چاہتے تھے کہ عربوں کو معاف کردیا جائے اور موالی کی گردن اڑادی جائے۔ اس نے قبیلہ تمیم کے دانشمند سردار احنف بن قیس سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ خدا ترسی کا تقاضا تو یہ ہے کہ سب کو معاف کردیا جائے۔ تاہم کوفے کے ان عربوں نے، جو بھاگ کر بصرہ چلے گئے تھے اور جن کے گھر مسمار اور جائیدادیں ضبط کرلی گئی تھیں، اس مشورے کی سخت مخالفت کی، انہوں نے مصعب پر دباؤ بڑھایا اور مصعب نے انہی کی خواہش پوری کی۔ ۴۸ چنانچہ ایم اے شعبان کا یہ کہنا کہ مختار کی فوج میں صرف دو ہزار تین سو کے قریب موالی تھے، مختار کی اصل طاقت ابراہیم ابن اشتر کی فوج تھی اور اس میں کوئی بھی موالی شامل نہیں تھا۔ ۴۹ تاریخ کا کوئی درست تجزیہ نہیں ہے۔ شعبان یہ بات بلاذری کی کتاب الانساب (جلد ۵، ص ۲۳۶) کے حوالے سے کہتا ہے۔ حالانکہ انساب الاشراف جلد ۵، ص ۲۳۶ پر یہ بیان ملتا ہے کہ مختار کی اس تین ہزار کی فوج میں اکثر موالی تھے (سوائے سات سو عربوں کے) جو اس نے عبداللہ ابن زبیر کو عبدالملک بن مروان کے خلاف مدد کے لئے بھجوائی تھی۔ یہ گویا مختار کی فوج کے ایک دستے کا حال تھا، اسی پر دیگر دستوں کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مختار کی اصل طاقت موالی ہی تھے۔

مختار کی بغاوت کی شکل میں موالی کی اس جارحیت کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ چونکہ موالی معاشرے کا ایک مظلوم طبقہ تھے، امیر معاویہ اور ان کے جانشینوں کے دور میں وہ تنگ کیے اور ستائے گئے تھے، لہٰذا انہوں نے اپنی اس بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے مختار کی بغاوت میں اس کا ساتھ دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ موالی کو جو سماجی رتبہ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے خلفاء نے عطا کیا تھا، اس کو کم کرنا حضرت معاویہؓ کے لئے اتنا آسان نہ تھا۔ سماجی تبدیلیاں مہینوں میں نہیں آیا کرتیں، بلکہ سماج کے بدلنے کا ایک طویل عمل ہوتا ہے اور اس کا بہت زیادہ

تعلق وہاں کی اقتصادیات سے ہوتا ہے۔ موالی کے ساتھ اسلام کے ابتدائی دور میں کوئی اقتصادی ناانصافی یا سماجی امتیاز روا نہیں رکھا گیا، اس پر پچھلے ابواب میں وضاحت سے روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ جس سماجی رویے کو بنانے میں رسول اللہ ﷺ کے تیئیس سال اور جس کو برقرار رکھنے میں خلفائے راشدین کے تیس سال صرف ہوئے، وہ سماجی رویہ محض چند سالوں میں کلیتہً سبوتاژ کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ ابھی صحابہؓ اور تابعین کی ایک جماعت موجود تھی، خود امیر معاویہؓ بھی صحابیِ رسولؐ تھے، ان پر اس جماعت کا اخلاقی دباؤ ایسا تھا کہ وہ نری عربی عصبیت کا جاہلانہ مظاہرہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اگر موالی کے حق میں امیر معاویہؓ کی طرف سے معمولی سی بھی کوتاہی ہوتی تو صحابہ میں سے کوئی نہ کوئی ان سے بازپرس ضرور کرتا اور انہیں باز رکھنے کی کوشش کرتا۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا امیر معاویہ کے پاس شام جا کر موالی کی حق تلفی کی شکایت کرنا، تاریخی کتب میں مذکور ہے۔ ۵۰؎ چنانچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ امیر معاویہؓ یا ان کے جانشینوں نے موالی پر کوئی ایسا ظلم کیا جس کے ردعمل کے طور پر وہ مختار کی بغاوت میں اس کے ساتھ ہو گئے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ بے چین نہیں تھے، انہیں پابندی سے ان کے وظائف بھی مل رہے تھے، وہ اپنی زمینوں کی دیکھ بھال اور اپنے کاروبار آزادانہ طور پر کر رہے تھے۔

تاہم کوفے میں بیشتر عرب و موالی دونوں ایک دوسرے کے لئے تعصب رکھتے تھے، تعصب پسند عربوں میں اکثریت ان بادیہ نشینوں کی تھی جو بالکل آخر میں اسلام لائے اور اسلامی فتوحات کے نتیجے میں دیگر علاقوں میں جا کر آباد ہوئے، ان کی ابھی پوری طرح تہذیب نفس نہیں ہو سکی، اسی طرح کوفے کے موالی میں سے بھی اکثریت تعصب پسند ایرانی موالی کی تھی جن میں اپنے سیاسی و سماجی ماضی کی رعونت ابھی تک بھری ہوئی تھی اور وہ عربوں کو کمتر سمجھتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مختار ثقفی ایک طالع آزما شخص تھا جو اس وقت کے سیاسی عدم استحکام سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، ۵۱؎ جس کے لئے اس کی نظر انتخاب کوفے پر پڑی جو اس وقت سب سے زیادہ پرفتن علاقہ تھا۔ یہاں کے لوگوں کی اکثریت شیعیانِ علی کی تھی لہٰذا ان کی توجہ حاصل کرنے کے لئے مختار نے ابن حنفیہ کو مہدی اور امام قرار دیا اور خود ان کا نام نہاد وزیر و

امین بن کو کوفے کی ولایت پر قابض ہونا چاہا۔ بعد میں بھی وہ غلط طور پر اپنی تحریک کو ابن حنفیہ کی طرف منسوب کرتا رہا۔ حالانکہ درحقیقت وہ عراق میں جو کچھ کر رہا تھا وہ سب کچھ محمد ابن حنفیہ کے مشورے اور رضامندی کے بغیر ہو رہا تھا۔ ۵۲ وہ اپنے خواص سے کہتا تھا کہ اس کے پاس جبرئیل امین آتے ہیں اور اس کو وحی ۵۳ آتی ہے۔ ابن حزم نے بھی لکھا ہے کہ مختار بن ابی عبید نے کوفے میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا۔ ۵۴ اس نے ایک کرسی رکھی ہوئی تھی جس کی تعظیم کی جاتی تھی اور وہ اسے بنی اسرائیل کے اس تابوت سے مشابہ قرار دیتا تھا، جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ ۵۵

چنانچہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، صحیح العقیدہ لوگ اس سے بیزار ہونے لگے۔ اس کے ایک انتہائی قریبی ساتھی رفاعہ بن شداد کو، جو پہلے مختار کے لئے لوگوں سے بیعت لیتا تھا اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا تھا، جب مختار کا جھوٹ معلوم ہوا تو وہ اس کو قتل تک کر دینے کے درپے ہو گیا۔ ۵۶ بہرحال مختار کے کذب و افترا کی وجہ سے اس کا ساتھ چھوڑنے والوں میں زیادہ تعداد عربوں کی تھی جبکہ موالی نے اس کا ساتھ آخر وقت تک نہیں چھوڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی موالی میں سے اکثریت کا اسلام پختہ نہیں تھا کہ وہ مختار کے دعوؤں کو راسخ الاعتقادی کے خلاف نہیں سمجھتے تھے۔ یہ ایرانی موالی ابھی تک اپنے سابقہ مذہب کے تصورات کو کلیتہً ترک نہیں کر سکتے تھے، اسلام ابھی ان کے حلق سے نیچے نہیں اترا تھا، چنانچہ ان کو اپنے ساتھ دگر اعتقادی کی راہ پر لے کر چل نکلنا مختار کے لئے زیادہ آسان تھا، بہ نسبت اس کے کہ وہ عربوں کو اپنا ہم خیال بناتا جو اس کے کذب و افترا کو، اپنے بہتر دینی تصورات کی وجہ سے، زیادہ آسانی سے شناخت کر سکتے تھے۔

بہرحال مختار کا خاتمہ موالی قوت کا خاتمہ تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں موالی ان جنگوں میں مارے گئے۔ مختار کی آٹھ بڑی جنگیں اور بعض چھوٹی جھڑپیں جو، اس کے دور میں ہوئیں، ان جنگوں میں مختار کے پچاس ہزار سے زائد آدمی کام آئے، جن میں عربوں کے علاوہ موالی اور غلاموں کی اکثریت تھی۔ اسی کے لگ بھگ نقصان فریق ثانی کا بھی ہوا ہوگا۔ یہ اعداد و شمار

یقیناً حیرت انگیز ہیں۔ ان جنگوں اور اقدامات کا موالی کو سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ آئندہ انہیں اپنے علاقوں میں بھی سکون نہ ملا۔ عبدالملک بن مروان کے گورنر حجاج بن یوسف نے ان معاملات کے پیش نظر ان پر وہ سختیاں کیں کہ مدتوں وہ بنوامیہ کے خلاف سر نہ اٹھا سکے۔

جولیس ولہاؤزن کی (Julius Wellhausen) جس کی خلافت بنوامیہ پر مشہور زمانہ کتاب *The Arab Kingdom and its Fall* کی علمی دنیا میں بہت پذیرائی کی گئی اس کتاب کو اموی عہد کے ایک معروضی مطالعے کے طور پر لیا جاتا ہے۔ اس میں مسئلہ موالی کے بارے میں فاضل مصنف لکھتے ہیں:

"The non-Arabs pressed into the eleft.They came over to Islam in great numbers,especially the crowds of Iranian prisoners of war in Kufa and Basra, thus gaining their personal freedom, but not full civil and military rights with their material advantages; they became Mawali, clients of some Arabian family. Only thus, as subordinate adhernets of Arab families, were they received into the theocracy; Islam alone was not sufficient, for the theocracy was, in fact, a specifically Arab state, an Imperium of the Arabs over the conquered peoples. This was contrary to the idea of the theocracy, which was not to be an Imperium (*Mulk*), nor even allowed to have one, and especially so when it was a case of Arabs ruling over non-Arab Muslims. Faith in Allah and the acknowledgment of His supreme power utterly excluded national differences.Thus Islam was used as a suitable means of gaining for the Mawali their share in the theocracy, so as to snatch the privilege

afterwards from the Arabs. The pious Arabs themselves favoured the claims of the Mawali; the parties of the opposition, in particular, sought in them allies against the Umaiyids, who actually represented the ruling power of the Arabian nation, and not of Islam. The Khawarij led the way by admitting the Mawali with equal rights into their community and army. The Shiites followed suit with much greater effect. As saw, a Shiite sect in Kufa allied itself with the Mawali there, and so at once advanced itself and the Iranians, In Kufa itself it was certainly soon suppressed again by the Arabs and sank into oblivion, but it later transplanted itself from Kufa to genuine Iranian soil, namely, to Khurasan, and spread there among the native population that had embraced Islam. Under the standard of Islam, i.e. of Shiitism, the Khurasanites first drove the Arabs out of their own land, and then made a complete end of the Arabian rule, and set up the Abbasisds in the palce of the Umaiyids." ۵۸

ولہاؤزن کے اس بیانیے سے یہ نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ عربوں کی قبائلی گروہ بندیوں اور تنازعات کو موالی نے بھی اپنا لیا تھا۔

۲۔ بنوامیہ کی حکومت، حکومتِ الٰہیہ (Theocracy) سے زیادہ ایک ''عرب سلطنت'' تھی۔

۳۔ موالی کو آزاد عربوں کی طرح پورے شہری اور عسکری حقوق حاصل نہیں تھے۔

۴۔ دین دار عربوں اور بنوامیہ مخالف عناصر مثلاً خوارج اور شیعہ نے موالی کی غیر معمولی حمایت کی اور موقع ملا تو انہیں بنوامیہ کی حکومت کے خلاف استعمال کیا مثلاً مختار ثقفی کی بغاوت۔

۵۔ بنوامیہ مخالف عناصر خصوصاً شیعہ۔ موالی گٹھ جوڑ عراق میں تو مطلوبہ نتائج نہ لاسکا لیکن خراسان میں برگ وبار لایا جس کے نتیجے میں خراسانیوں نے پہلے عربوں کو اپنی سرزمین سے باہر نکالا اور بالآخر عرب حاکمیت کا ہی خاتمہ کرڈالا اور امویوں کی جگہ عباسیوں کو مسندِ اقتدار پر لا بٹھایا۔

مجموعی طور پر ولہاؤزن کا یہ بیانیہ مبنی بر حقیقت ہے، اس کے علاوہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ موالی جس عرب قبیلے سے حلف اور ولاء کے رشتے میں جڑتے تھے وہ اُسی قبیلے میں محسوب ہوتے تھے اور لامحالہ انہیں اس عرب قبیلے کی خصوصیات، تنازعات، دوستیاں، معاہدے اور لڑائیاں سب اپنانی پڑتی تھیں۔ وہ اپنے حلیف قبیلے کے فوائد میں بھی شامل ہوتے تھے اور نقصانات میں بھی، اور یہ معاملہ دوطرفہ تھا۔ یعنی عرب قبیلہ بھی اپنے موالی کی وجہ سے آزمائشیں برداشت کرتا تھا۔

جہاں تک دوسرے نکتے کا تعلق ہے، بنوامیہ کی حکومت ''حکومت الٰہیہ'' نہیں بلکہ ''عرب ریاست'' تھی۔ غالباً ولہاؤزن کے پیشِ نظر Theocracy کا وہ تصور تھا جس کا چلن مغرب اور عیسائی دنیا میں تھا جب کہ عیسائی مغرب کی تھیوکریسی اور مسلمانوں کا سیاسی نظم بنیادی طور پر دو مختلف نظامات ہیں لیکن اس بحث کا یہ موقع نہیں۔ ۵۹

اصولاً بنوامیہ کی حکومت کو عرب ریاست ہی ہونا تھا، جب سرزمین عربوں کی تھی، دین وہ تھا جس کے اولین حامل عرب تھے، دفاعِ ریاست میں خون عربوں کا بہا تھا، دستورِ اساسی (قرآن) عربی میں تھا تو حکومت تو عربوں ہی کی ہوگی۔ سیاسی تنظیم کے مختلف شعبوں کے لیے ان موالی (غیر عرب عناصر) پر کیسے بھروسہ کیا جاسکتا تھا جن کے ''اسلام پر ثابت قدمی اور اخلاص'' کی کوئی آزمائش ہی نہیں ہوئی تھی۔ پھر انہیں عربوں سے یک گونہ پرخاش بھی تھی، یہ عرب ہی تھے جنہوں نے ان کے سابقہ اقبال اور کروفر کا خاتمہ کیا تھا، ان کی نفرتوں کے اظہار کا آغاز قتل حضرت عمرؓ کے ساتھ ہی سلسلہ وار آگے بڑھ رہا تھا، سیاسی اور حکومتی معاملات پر یک دم ان پر بھروسہ کیا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ تاہم رفتہ رفتہ اعتماد کی فضا بحال ہوئی

تو ان کو سیاسی عہدے بھی دیے گئے جس کا تذکرہ آگے آئے گا۔

تیسرے نکتے کی قدرے وضاحت درکار ہے۔ موالی کو عسکری قیادت سے الگ رکھا گیا تھا۔ جس کی وجہ اوپر بیان کی گئی کہ اعتماد کی فضا اس وقت تک بحال نہیں ہوئی تھی لیکن سماجی حقوق انہیں کلیتہً میسر تھے۔ البتہ سماجی رتبے کے حوالے سے دو رویے سامنے آئے تھے، متعصب عربوں کا رویہ نامناسب جبکہ دین دار طبقے کا رویہ عین اسلامی، مثالی اور مساویانہ تھا۔ یہ دونوں رویے معاشرے میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے، اس پر آگے روشنی ڈالی جائے گی۔



حوالہ جات:

۱۔ *"History of the Islamic People", t. Joel Carmichael & Mosbe Perlmann, ed. Carl Brockelmann, London, 1980, p. 88.*

۲۔ الاستیعاب، جلد ۴، ص ۱۳۶۵؛ البلاذری، احمد بن یحییٰ بن جابر، انساب الاشراف، جلد ۵، ص ۲۱۳، یروشلم، ۱۹۳۶ء۔

۳۔ الاستیعاب، جلد ۴، ص ۱۳۶۵۔

۴۔ تاریخ طبری، جلد ۵، ص ۷۵۔

۵۔ تاریخ طبری، جلد ۵، ص ۱۵۸، الکامل فی التاریخ، جلد ۳، ص ۲۰۴، البدایہ والنہایہ، جلد ۸، ص ۱۴۔

۶۔ تاریخ طبری، جلد ۵، ص ۵۶۹، (یہ گھر اس زمانے میں ابن مسیب کا گھر کہلاتا تھا) نیز انساب الاشراف، جلد ۵، ص ۲۱۳۔

۷۔ مختار ثقفی کو کئی واسطوں سے حضرت عمرؓ سے قرابت تھی، مثلاً مختار کی ایک بہو حضرت عمرؓ کی پوتی ام سلمہ بنت عبید اللہ بن عمر بن خطاب تھیں۔ ان کے شوہر کا نام ابو امیہ بن مختار ثقفی تھا۔ (جمهرة انساب العرب، ص ۲۶۸) اسی طرح سے حضرت عمرؓ کے ایک پوتے یعنی عبداللہ بن عبداللہ بن عمر بن خطاب، مختار کے داماد تھے، ان کی بیوی کا نام ام سلمہ بنت مختار ثقفی تھا۔

(جمھرۃ انساب العرب، ص ۱۵۳) نیز مختار کی ایک بہن صفیہ بنت ابی عبید ثقفی، حضرت عبداللہ ابن عمر کی منکوحہ ہونے کے ناتے، حضرت عمرؓ کی بہو تھیں۔ (المعارف، ص ۱۷۲؛ الاستیعاب، جلد ۲، ص ۱۸۷۳؛ البدایہ والنھایہ، جلد ۸، ص ۲۶۴)

۸ تاریخ طبری، جلد ۵، ص ۱۷۵؛ المعارف، ص ۸۰؛ البدایہ والنھایہ، جلد ۸، ص ۲۳۹؛ انساب الاشراف، جلد ۵، ص ۲۱۳، ۲۱۵؛ الکامل فی التاریخ، جلد ۲، ص ۱۶۹۔

۹ مسعودی، جلد ۲، ص ۷۷۔

۱۰ ابومطرف، سلیمان بن صرد الخزاعی کا اصل نام یسار تھا، لیکن جب وہ اسلام لے آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کا نام سلیمان رکھ دیا۔ انہیں اپنی قوم میں بڑی ناموری حاصل تھی اور جب مسلمان کوفے میں آباد ہونا شروع ہوئے تو سلیمان بھی وہیں جا بسے، جنگ جمل اور جنگ صفین میں وہ حضرت علیؓ کی طرف سے لڑے تھے۔ امیر معاویہؓ کی وفات (رجب ۶۰ھ/اپریل ۶۸۰ء) کے بعد وہ حضرت حسینؓ کے سرگرم حامیوں میں سے تھے اور یہ ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے حضرت حسینؓ کو کوفہ آنے اور بنوامیہ کے اقتدار کو ختم کرنے کی دعوت دی، مگر جب حضرت حسینؓ ان کی دعوت پر کوفہ گئے تو سلیمان سمیت ان کے حامی ان کی کچھ مدد نہ کر سکے اور حضرت حسینؓ اپنے تمام ساتھیوں سمیت میدان کربلا میں شہید کر دیئے گئے۔ (۱۰ر محرم ۶۱ھ مطابق ۱۰راکتوبر ۶۸۰ء) تو وہ کوفی جنہوں نے حضرت حسین کو کوفہ بلایا تھا۔ اپنی بزدلی اور بے عملی پر نادم اور شرمندہ ہوئے اور اپنے جرم کی تلافی کے لئے خونِ حسینؓ کا انتقام لینے اٹھ کھڑے ہوئے، ان لوگوں کا نام "التوابون" (توبہ کرنے والے) پڑ گیا اور یہ لوگ سلیمان بن صرد الخزاعی کی قیادت میں جمع ہو گئے۔ اس پوری جماعت کا کوئی شخص بھی ساٹھ سال سے کم عمر کا نہ تھا۔ سلیمان نے اپنی جماعت کے ساتھ ربیع الثانی ۶۵ھ/نومبر ۶۸۴ء میں خروج کیا۔ شیعیانِ علی، سلیمان کی توقع سے بہت کم پُرجوش ثابت ہوئے چنانچہ سولہ ہزار آدمی جنہوں نے ان کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا، خروج کے وقت صرف چار ہزار رہ گئے۔ عین الوردہ کے مقام پر تین روزہ جنگ میں سلیمان اور ان کے بیشتر ساتھی ہلاک ہو گئے۔ یہ جنگ ۲۲ر جمادی الاولیٰ ۶۵ھ/۴ر جنوری ۶۸۵ء کو ہوئی۔ حکومت کی فوج حصین بن نمیر السکونی کی ماتحتی میں تھی۔

۱۱ کوفے روانہ ہونے سے قبل، مختار حضرت علیؓ کے بیٹے محمد ابن حنفیہ (م ۸۱ھ) سے ملا تھا جو کہ مکے میں مقیم تھے۔ یہ حضرت حسن و حسین کے چھوٹے سوتیلے بھائی تھے، ایک روایت کے مطابق ان کی والدہ ایک سندھی کنیز تھیں۔ جب حضرت حسین کوفے جانے کے ارادہ سے اپنے اہل خانہ سمیت چلے تھے تو انہوں نے ابن حنفیہ کو بھی اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی مگر مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں اور خونریزی کے پیش نظر انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ مختار ثقفی مکے میں ان سے ملا اور ان کے سامنے اپنا یہ مشن رکھا کہ میں آپ کے عزیزوں کا انتقام لینے کوفہ جا رہا ہوں اور دشمنوں کو قتل کر کے آپ کے لئے حکومت حاصل کروں گا۔ ابن حنفیہ نے مختار کی ذرہ برابر بھی حوصلہ افزائی نہ کرتے ہوئے کہا، بلاشبہ یہ تو میری خواہش ہے کہ خدا ہماری مدد کرے اور ہمارا خون بہانے والوں کو تباہ کرے لیکن میں جنگ یا خونریزی کی اجازت نہیں دے سکتا، ہمارا انصاف کرنے اور ہمارا انتقام لینے کے لئے خدا ہی کافی ہے۔" (انساب الاشراف، جلد ۳، ص ۲۱۸) اس کے باوجود کوفہ پہنچ کر مختار نے خود کو ابن حنفیہ کا نمائندہ بتایا۔ وہ کہا کرتا کہ میں مہدی وقت محمد ابن حنفیہ کے پاس سے آیا ہوں۔ مجھے انہوں نے اپنا وزیر اور امین بنا کر تم لوگوں کے پاس بھیجا ہے۔ (تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۱۶-۱۸؛ اخبار الطوال، ص ۲۹۷، ۲۹۸۔)

۱۲ ابراہیم بن اشتر، حضرت علیؓ کے مشہور سپہ سالار اشتر نخعی کا بیٹا تھا۔ اشتر ایک قبائلی لیڈر تھا جس نے عراق و ایران کی ابتدائی فتوحات میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں اور جب کوفہ آباد ہوا تو دوسرے فاتحین کے ساتھ کوفے میں آباد ہو گیا۔ خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنیؓ کے خلاف شورش برپا کرنے، ان کا محاصرہ کرنے اور انہیں قتل کرنے میں اس کا نمایاں حصہ تھا۔ حضرت علیؓ کے دور خلافت میں اس کو بڑا عروج حاصل ہوا اور وہ ان کا اہم جرنیل بن گیا۔ اشتر اور اس کا خاندان کوفہ میں خاص شرف و عزت کا حامل تھا۔ اس کا بیٹا ابراہیم بھی انہی خصوصیات کا حامل تھا۔ اپنی اسی عزت و شرف کی وجہ سے وہ مختار کی ماتحتی میں آنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر اس کا تعاون حاصل کرنے کے لئے مختار نے ابن حنفیہ کی طرف سے جعلی خط کا سہارا لیا۔ (تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۱۶-۱۷؛ اخبار الطوال، ص ۲۹۷-۸؛ انساب الاشراف، جلد ۵، ص ۲۲۲۔)

۱۳ M.A. Shaban, *Islamic History: A New Interpretation*, p. 95, Cambridge,

1971.

۱۴۔ انساب الاشراف، جلد۵، ص ۲۶۷۔

۱۵۔ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۲۸۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۱ (عبداللہ ابن مطیع نے فرار ہوکر سابق گورنر کوفہ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے گھر میں پناہ لی۔ مختار کو اس کی اطلاع مل گئی، لیکن سابقہ دوستی کے پیش نظر مختار نے خاموشی سے ابن مطیع کے پاس چند ہزار درہم بھجوائے اور کہلایا کہ مجھے تمہارے چھپنے کی جگہ کا علم ہے، غالباً رقم نہ ہونے کی وجہ سے تم ابھی تک رکے ہوئے ہو۔ اس رقم سے انتظام کر کے چلے جاؤ۔ چنانچہ ابن مطیع بصرے چلے گئے۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۸، ص ۲۶۸؛ الکامل فی التاریخ، جلد۴، ص ۲۲۶)۔

۱۷۔ انساب الاشراف، جلد۵، ص ۲۳۷۔

۱۸۔ مسعودی، جلد۲، ص ۸۳۔

۱۹۔ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۱۱۰۔

۲۰۔ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۴۴۔

۲۱۔ ایضاً؛ الکامل فی التاریخ، جلد۴، ص ۲۳۱۔

۲۲۔ Nicholson, *A Literary History of the Arabs*, p. 219.

۲۳۔ فجر الاسلام، ص ۲۷۷۔

۲۴۔ الخطط، مقریزی، باب XCIV۔

۲۵۔ الکامل فی التاریخ، جلد۴، ص ۲۲۷؛ البدایہ والنہایہ، جلد ۸، ص ۲۶۸۔

۲۶۔ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۴۴-۴۵۔

۲۷۔ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۵۷۔

۲۸۔ اخبار الطوال، ص ۵۰۰۔

۲۹۔ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۵۱ (ابن کثیر گرفتار شدگان کی تعداد پانچ سو بتاتا ہے۔ ان کے بارے میں مختار نے حکم دیا کہ جو لوگ قتل حسین میں شریک تھے انہیں قتل کر دیا جائے تو ان میں سے دو سو چالیس افراد کو قتل کر دیا گیا۔ ابن کثیر، جلد ۸، ص ۲۷۰۔)

۳۰ مصعب بن زبیر بن العوام بن خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی بن کلاب، رسول اللہﷺ کے صحابی اور حواری رسول اللہ زبیرؓ بن العوام کے بیٹے تھے۔ ان کی ماں کرمان بنت انیف کلبیہ تھیں۔ لہٰذا یہ عبداللہ ابن زبیر کے علاتی بھائی تھے۔ بہت بہادر، سخی اور وجیہ شخص تھے، بعض اوقات انہوں نے شدت پسندی کا مظاہرہ کیا، انہوں نے مروان اوّل کے عہد خلافت میں فلسطین پر خاص تدبیر سے حملہ کرکے اپنے فوجی کارناموں کی ابتدا کی، بعد میں ان کے بھائی عبداللہ نے انہیں بصرے کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ تاریخ میں مصعب کی شہرت ایک اور حوالے سے بھی ہے اور وہ یہ کہ ان کے نکاح میں بیک وقت اپنے زمانے کی دو بے حد خوبصورت، باوقار اور ذہین خواتین تھیں، ان میں سے ایک عائشہ بنت طلحہ اور دوسری سکینہ بنت حسین تھیں۔

۳۱ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۵۵۔

۳۲ اخبار الطوال، ص ۵۰۲۔

۳۳ ایضاً، ص ۵۰۳۔

۳۴ ایضاً، ص ۵۰۴؛ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۸۹۔۹۱۔

۳۵ المعارف، ص ۲۶۷۔ انہیں یہ نام اس لئے ملا کہ یہ لاٹھیوں سے مسلح رہتے تھے اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ مختار کے جو سپاہی محمد ابن حنفیہ کو عبداللہ ابن زبیر کی قید سے چھڑانے گئے وہ لاٹھیوں سے مسلح تھے، لہٰذا انہیں خشبیہ کہا گیا۔ (انساب الاشراف، جلد ۵، ص ۲۳۱)

۳۶ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۹۴۔

۳۷ گرائے جانے والے مکانات میں محمد ابن اشعث کا مکان بھی تھا۔ الدینوری کے مطابق محمد ابن اشعث معرکہ سبیع میں شریک تھا۔ (اخبار الطوال، ص ۵۱۰) جبکہ طبری کے مطابق یہ کوفے کی جنگ میں شریک نہ تھا بلکہ اس وقت اپنے قصر واقع طیزن آباد میں (جو قادسیہ کے قریب ہے) مقیم تھا۔ ادھر مختار نے ابن اشعث کے قصر کا پتا معلوم کرکے سو سواروں کا ایک دستہ اس کی گرفتاری کے لئے بھیجا، لیکن وہ فوجی دستے کی آمد سے قبل نکل گیا اور بصرہ میں مصعب ابن زبیر سے جاملا۔ مختار کی فوج نے محمد ابن اشعث کے محل کو منہدم کردیا۔ (تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۹۴)

۳۸ اخبار الطوال، ص ۵۱۲۔

۳۹ مختار ثقفی کے چند دیرینہ رفقا تھے، ۶۶ھ میں جب مختار نے اپنی تحریک پر شیعیان علی سے بیعت

لیتی شروع کی تو یہ پانچ افراد، لوگوں سے مختار کی بیعت بھی لیتے تھے اور انہیں ترغیب بھی دیتے تھے۔ (۱) سائب بن مالک اشعری (۲) یزید بن انس (۳) احمر بن شمیط (۴) رفاعہ بن شداد اور (۵) عبداللہ بن شداد جشمی۔ (ابن کثیر، جلد ۸، ص ۲۶۴۔)

۴۰ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۹۵-۹۶۔

۴۱ البدایہ والنہایہ، جلد ۸، ص ۲۸۷۔

۴۲ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۹۶؛ الکامل فی التاریخ، جلد ۴، ص ۹-۲۶۸۔

۴۳ انساب الاشراف، جلد ۵، ص ۲۵۵۔

۴۴ ایضاً، ص ۲۵۳۔

۴۵ دینوری کے مطابق یہ محاصرہ چالیس روز رہا، جبکہ طبری کا خیال ہے کہ یہ محاصرہ چار ماہ تک قائم رہا۔ (تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۱۱۵) تاہم ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ مختار محاصرے کے دوران اپنے چند جانثاروں کے ساتھ باہر نکلا اور لڑتا ہوا مارا گیا، جبکہ اس کے باقی ساتھی بدستور قصر میں محبوس رہے۔ دینوری نے مختار کی موت تک، محاصرے کی مدت گنی ہوگی، جبکہ طبری نے مختار کے بعد بھی محاصرے کی مدت کو شمار کیا ہوگا۔

۴۶ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۱۱۶؛ الکامل فی التاریخ، جلد ۴، ص ۲۷۸۔ اکثر مؤرخ مختار کا دورِ حکومت ۱۸ ماہ بتاتے ہیں، یعنی ربیع الاول ۶۶ھ سے رمضان ۶۷ھ تک۔ طبری، ابوحنیفہ الدینوری، ابن اثیر اور ابن خلدون کی یہی رائے ہے، لیکن بلاذری نے انساب الاشراف میں کئی بار اس بات کی تصریح کی ہے کہ اس کا قتل رمضان ۶۹ھ میں واقع ہوا۔ اس اعتبار سے اس کے دورِ اقتدار کی مدت ساڑھے تین سال ہوتی ہے۔ تاہم بلاذری کی روایت شاذ ہے۔

۴۷ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۱۱۶۔ (مسعودی ان کی تعداد سات ہزار بتاتا ہے۔ مروج الذہب، جلد ۲، ص ۹۰)۔

۴۸ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۱۱۶۔

۴۹ M.A. Shaban, ***The Abbasid Revolution***, p. 145, Cambridge, 1970.

۵۰ سنن ابی داؤد، جلد ۲، ص ۲۶۶۔

۵۱ جن دنوں مختار کوفے کے قصر میں محصور تھا، اور مصعب کے فوجیوں سے آخری جنگ کے لئے

قصر سے نکلنا چاہتا تھا، اس وقت اس نے اپنے خواص میں سے سائب بن مالک اشعری سے کہا "اے شیخ! آؤ نکلیں دین کی خاطر نہ سہی، احساب ہی کے نام پر لڑ جائیں۔" سائب کے منہ سے انا للہ نکلا اور کہا "اے ابو اسحاق! لوگ تو سمجھتے تھے کہ تم نے یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں محض دینی حمیت کی خاطر لیا ہے۔" مختار نے جواب دیا "نہیں! میری جان کی قسم! یہ محض دنیا طلبی تھی۔ میں نے دیکھا کہ عبدالملک نے شام کا علاقہ دبا لیا ہے، عبداللہ ابن زبیر حجاز پر قابض ہے، مصعب بصرے پر مسلط ہے، نجدہ حروری بھی یمامہ اور بحرین وغیرہ کا مالک بن بیٹھا ہے۔ نیز عبداللہ بن خازم خراسان کا حکمران ہے، میں بھی عرب ہوں اور حیثیت میں ان سے کسی طرح کم نہیں۔ مگر مقصد حاصل نہ ہوا، آخر ایک طریقہ سوجھا اور وہ تھا خونِ حسینؓ کے انتقام کی دعوت و تبلیغ۔" (اخبار الطوال، ص ۵۲۰؛ الکامل فی التاریخ، جلد ۴، ص ۲۷۳؛ یہ واقعہ قدرے لفظی تغیر کے ساتھ ابن خلدون، جلد ۳، ص ۳۰، اور تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۱۰۷ میں بھی بیان ہوا ہے۔)

۵۲ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، جلد ۸، ص ۲۳۸۔

۵۳ انساب الاشراف، جلد ۵، ص ۲۳۲۔

۵۴ جمھرۃ انساب العرب، ص ۲۶۸۔

۵۵ ابن کثیر، جلد ۸، ص ۲۹۲؛ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۸۳-۸۴؛ انساب الاشراف، جلد ۵، ص ۲۳۲؛ الکامل فی التاریخ، جلد ۴، ص ۹-۲۵۸۔

۵۶ ابن کثیر، جلد ۸، ص ۲۹۱۔

۵۷ جرمن مستشرق جولیس ولہاوزن (Julius Wellhausen) (۱۷ رمئی ۱۸۴۴ء۔ ۷ رجنوری ۱۹۱۸ء) نے اعلیٰ تعلیم گوٹنگن (Gottingen) یونی ورسٹی سے حاصل کی۔ جہاں انہوں نے پروفیسر ایوالڈ (Ewald) سے الٰہیات کا درس لیا اور پھر اسی یونی ورسٹی میں تورات کی تاریخ پر درس دینا شروع کیا۔ ۱۸۷۰ء میں وہ Gerifwald یونی ورسٹی میں الٰہیات (Theology) کے پروفیسر مقرر ہوئے، لیکن بارہ سال بعد (۱۸۸۲ء میں) وہ اس عہدے سے اپنے مذہبی عقائد کی بنا پر مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد وہ Halle یونی ورسٹی میں مشرقی زبانوں کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ۱۸۹۲ء میں وہ پھر گوٹنگن منتقل ہو گئے۔

گزشتہ صدی میں یورپ میں مطالعۂ اسلامیات کی جو عمارت کھڑی ہوئی، اس کے اساطین میں ولہاؤزن کا بھی شمار ہوتا ہے، انہوں نے اسلامی تاریخ پر جو کتابیں لکھیں، ان میں بنو امیہ کی تاریخ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جو ۱۹۰۲ء میں *Das Arabische Recich Und Seine Sturz* کے نام سے شائع ہوئی۔ مسز مارگریٹ ویر (Margrat Weir) نے اس کتاب کا جرمن سے انگریزی میں ترجمہ کیا جو کلکتہ سے ۱۹۲۷ء میں *The Arab Kingdom and its Fall* کے نام سے شائع ہوا۔ اسی ایڈیشن کو پاکستان میں پہلی بار ،رحیم برادرز ،کراچی نے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا۔ ولہاؤزن کی یہ تصنیف عہد اموی کی پہلی مستند تاریخ ہے، جو کسی مغربی زبان میں لکھی گئی، پہلی بار اس کا اردو ترجمہ ریحان عمر نے کیا جو "سلطنت عرب اور اس کا سقوط" کے نام سے ۲۰۱۸ء میں عکس پبلی کیشنز ،لاہور سے شائع ہوا۔ ولہاؤزن نے مختلف موضوعات پر محققانہ مضامین اور مقالات لکھے تھے وہ *Skizzen und Vararbeiten* کے نام سے چھ جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

۵۸ جولیس ولہاؤزن، *The Arab Kingdom and its Fall*، رحیم برادرز کراچی، ۱۹۸۰ء، ص ۷۱۔۷۳۔

۵۹ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالعۂ تہذیب از نگار سجاد ظہیر، ص ۳۰۷۔۳۰۹، قرطاس کراچی، طبع سوم، ۲۰۱۶ء۔



باب ششم

موالی: حکومتی ردعمل کی زد میں

ایک عام خیال یہ ہے کہ موالی کی سماجی حیثیت پر اصل ضرب لگانے والا حجاج بن یوسف [1] تھا اور یہ اپنے شدید عربی تعصب کی وجہ سے موالی کا دشمن تھا۔ گولڈ زیہر، حجاج کو fanatical enemy of the mawali کہتا ہے۔ تاریخ کا یہ کوئی صحیح جائزہ اور حجاج بن یوسف کی حکمت عملیوں کا یہ کوئی درست تجزیہ نہیں ہے۔ اس بات کو اگر یوں کہا جائے تو تاریخی طور پر زیادہ مناسب ہوگا کہ حجاج بن یوسف اموی حکومت کا وفادار گورنر اور ان کا انتہائی قابل اعتماد دست راست تھا۔ اپنے بیس سالہ دور ولایت میں اس نے ہر اُس مخالف کا گلا دبادیا جس نے حکومت وقت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، یا ان کے خلاف صف آرائی کی کوشش کی خواہ وہ عربی ہو یا موالی، خراسانی ہو یا عراقی، عام آدمی ہو یا صحابی رسول۔ اموی اقتدار کے خلاف جس کو حجاج نے خطرہ سمجھا اس کو برباد کردیا۔ ایک موقع پر اس کا یہ حکم ملتا ہے "سنو اور اطاعت کرو واللہ! اگر عبدالملک لوگوں کو اس گھاٹی میں داخل ہونے کا حکم دے اور وہ کسی اور گھاٹی میں داخل ہو جائیں تو ان کا خون میرے لئے حلال ہوگا۔" [2]

عبداللہ ابن زبیر کو کامیابی سے راستے سے ہٹانے کے بعد عبدالملک نے اسے حجاز یمن اور یمامہ کی گورنری سونپی تھی جہاں وہ دو سال بحیثیت گورنر رہا [3] اور جب یہاں اس نے خود کو ایک سمجھے ہوئے منتظم کے طور پر منوالیا تو عبدالملک بن مروان نے اس وقت کا سب سے

مشکل صوبہ یعنی کوفہ اس کی گورنری میں دینے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ اس تبدیلی کا فوری سبب اس سال خلیفہ کے بھائی بشر بن مروان کی، جو کہ کوفہ کا گورنر تھا، موت تھی، تاہم یہ امر بھی بعید از قیاس نہیں کہ حجاز کے لوگوں نے حجاج کی سختیوں اور تشدد کے خلاف دربار خلافت میں شکایات پہنچائیں، جس کی وجہ سے خلیفہ کو اکثر مداخلت کرنا پڑتی تھی۔ ابن قتیبہ کا بیان ہے کہ عیسیٰ بن طلحہ بن عبید اللہ ایک وفد لے کر عبدالملک بن مروان کے پاس گئے تھے۔ اس وفد میں ان کے ساتھ عمر بن عبدالرحمان بن عوف بھی تھے۔ اس وفد نے حجاز سے حجاج کی معزولی کے بارے میں بات کی۔ جس کے نتیجے میں عبدالملک نے حجاج کو حجاز سے معزول کر دیا۔[۴] نیز خارجیوں کی مسلسل سازشوں کے باعث بھی عراق کی گورنری اسلامی ریاست کا سب سے اہم انتظامی شعبہ تھا۔ حجاج نے ۳۳ برس کی عمر میں ۷۵ھ/۶۹۴ء میں یہ گورنری سنبھالی۔ اس کے تین سال بعد ۷۸ھ میں مشرقی اضلاع بھی جن میں کرمان، خراسان اور سجستان کے علاقے بھی شامل ہیں اسی کی گورنری کے تحت کر دیے گئے[۵] اور فی الواقع وہ مملکت کے نصف سے زائد رقبے پر حکمران ہو گیا۔

کوفہ میں بحیثیت گورنر وارد ہونے کے بعد اس نے جو ابتدائی خطبے دیے تھے ان سے حجاج کی مستقبل کی حکمت عملی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے، ایک خطبے میں اس نے کہا:

"اے کوفیو! میں دیکھ رہا ہوں کہ سروں کی کھیتی پک کر تیار ہو گئی ہے اور اب اس کو کاٹنے کا زمانہ آ گیا ہے، میں اسے کاٹنے کے لئے آیا ہوں۔ مجھے عماموں اور داڑھیوں میں خون لگا ہوا نظر آ رہا ہے...... اے عراقیو! مجھے کسی چیز سے خوفزدہ نہیں کیا جا سکتا، مجھ پر زور یا دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا، میں بہت جانچ پڑتال کے بعد ہوشیار اور لائق ثابت ہوا ہوں اور بہت تجربے کے بعد ڈھونڈ کر منتخب کیا گیا ہوں۔ امیر المومنین نے اپنے ترکش کے تمام تیروں کو جانچا اور مجھے سب سے زیادہ تلخ، تیز دھار اور مضبوط چوٹ لگانے والا پایا تو تمہارے اوپر مسلط کر دیا۔ کیونکہ تم فتنوں میں پیش پیش ہو اور گمراہیوں میں پڑے رہتے ہو، مگر اب سمجھ لو

کہ میں تمہیں اس طرح گٹھڑی میں باندھ دوں گا، جس طرح ببول کی لکڑیوں کا گٹھا باندھا جاتا ہے اور اس طرح بے دردی سے ماروں گا جس طرح پرائے اونٹوں کو مارا جاتا ہے۔" تمہاری مثال اُن بستی والوں کی سی ہے جن کو ہر جگہ سے امن و اطمینان کے ساتھ رزق ملتا تھا لیکن انہوں نے خدا کے انعامات و احسانات کی قدر نہ کی تو اللہ نے ان کے اعمال کی سزا میں انہیں بھوک اور خوف میں مبتلا کر دیا۔"[۶]

بخدا میں جو کچھ کہوں گا اسے پورا کروں گا، جس کام کا ارادہ کروں گا اسے پورا کر کے چھوڑوں گا اور جو کچھ بھی کروں گا وہ ٹھیک اور مناسب کروں گا، امیر المومنین نے مجھے حکم دے دیا ہے کہ تمہارے وظیفے تم کو دے دوں اور تم کو تمہارے دشمنوں سے لڑائی کے لئے مہلب بن ابی صفرہ کے پاس بھیج دوں، بخدا جس کو میں وظیفہ وصول کرنے کے تین دن بعد اس کے گھر میں بیٹھا پاؤں گا، اس کی گردن اڑا دوں گا۔"[۷]

اس خطبے سے یہ اندازہ لگانا امر دشوار نہیں کہ حجاج بنیادی طور پر ایک ظالم، جابر اور حکومتِ وقت کا انتہائی وفادار ملازم تھا۔ خود اپنے بارے میں اس کی رائے تھی کہ "میں بڑا ضدی، جھگڑالو، کینہ پرور اور حاسد ہوں اور جب کسی حاکم میں یہ صفات جمع ہوں تو وہ کھیتی اور نسل کو غارت کر دیتا ہے، الا یہ کہ لوگ اس کے مطیع و فرمانبردار ہو جائیں۔"[۸]

تین سال تک حجاج بن یوسف کو عراق میں آزمانے کے بعد عبدالملک بن مروان نے اسے خراسان اور سیستان جیسے مشکل صوبے بھی سونپ دیے۔ چنانچہ ۷۸ھ تا ۹۵ھ تک وہ عراق اور مشرقی اضلاع کا مضبوط ترین گورنر رہا، اس کا ماتحت علاقہ، کل اسلامی مملکت کے نصف سے زائد تھا۔ اسے عبدالملک بن مروان اور اس کے بعد ولید بن عبدالملک کی مکمل تائید حاصل رہی۔ عبدالملک اسے اچھی طرح آزما چکا تھا اور اسے اموی حکومت کا انتہائی وفادار پانے کے بعد اپنے جانشین ولید کو وصیت کی تھی کہ "حجاج کی عزت کرو، اس نے منبروں کو

تمہاری جلوہ افروزی کے لئے خالی کیا، تمام ممالک اور بلاد پر تمہارا علم نصب کیا اور تمہارے دشمنوں کو تمہارے لئے زیر نگیں کر لیا۔" ۹ اس طرح حجاج کو دونوں خلفا کی مکمل تائید و حمایت حاصل رہی اور اس کی مدد کرنے کے لئے شامی فوج بھی موجود تھی، جسے پہلے اس نے عراق میں اتارا تھا مگر بعد ازاں اپنی اس مددگار شامی فوج کے پڑاؤ کے لئے اس نے واسط کا نیا شہر آباد کیا ۱۰ جو کوفے اور بصرے کے درمیان تھا اور دونوں شہروں کے باغی عناصر کے لئے ایک مسلسل ڈراور سر پر لٹکتی ہوئی تلوار تھی۔

اپنے اس بیس سالہ دور ولایت کے دوران اس نے جو حکمت عملی اختیار کی وہ براہ راست موالی کے خلاف نہیں تھی، جیسا کہ جرجی زیدان یا R. Levy کا خیال ہے۔ ۱۱ اس کے نزدیک اس بات کی زیادہ اہمیت نہیں تھی کہ کون عرب ہے اور کون موالی، یہ محض ثانوی سوال ہوسکتا تھا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ جب اشراف عراق اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ کوئی غیر عرب ان کا امام ہو تو حجاج نے سعید ابن جبیر کو امام بنایا جو کہ موالی تھے اور جب کہ اشراف عراق اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ کوئی غیر عرب ان کا قاضی ہو، حجاج نے قاضی کوفہ ابو بردہ بن ابو موسیٰ اشعری کو اس بات کا حکم دیا کہ سعید ابن جبیر سے مشورہ لیے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں۔ یہی نہیں بلکہ انہیں اپنا مقرب بنایا اور ضرورت مندوں میں تقسیم کرنے کے لئے مال کا امین بنایا۔ ۱۲

حجاج بن یوسف کے نزدیک اصل اہمیت اس بات کی تھی کہ کون اموی حکومت کا وفادار ہے اور کون غدار۔ وفا داروں کے لئے، خواہ وہ عرب ہوں یا موالی۔ اس کے پاس عزت و احترام بھی تھا، وظائف اور عہدے بھی۔ غداروں کے لئے، خواہ وہ عرب ہوں یا موالی، اس کے پاس صرف ایک چیز تھی اور وہ اس کی تلوار یا اس کا کوڑا۔ اس موقع پر عبداللہ ابن مقفع ۱۳ کا واقعہ بیان کیا جاسکتا ہے۔ حجاج بن یوسف کی طرف سے لگائے جانے والے کوڑوں کی وجہ سے اس کا ہاتھ سکڑ کر خشک ہوگیا تھا، (اسی وجہ سے اسے مقفع کہتے ہیں) بصرہ میں یہ کوڑے اس وجہ سے نہیں لگائے گئے کہ وہ موالی تھا، بلکہ اس وجہ سے لگائے گئے کہ اس نے حکومت کے مال میں بے جا تصرف کیا تھا۔

ابن اشعث کی بغاوت (۸۲ھ/ ۷۰۱ء) اور دیر جماجم کے فیصلہ کن معرکے کے بعد اس نے عراقیوں کو مخاطب کر کے جو تقریر کی اس کا آخری حصہ دیکھئے:

''......اے عراقیو! میں تم سے کس چیز کی امید رکھوں اور کس بات کی توقع کروں؟ میں تم پر کس وجہ سے رحم کھاؤں اور تمہیں کس چیز کے لئے سنبھال کر رکھوں؟ کیا عداوتوں کے بعد جھوٹی باتیں بنانے کے لئے۔ میں تمہاری کس بات کو دیکھوں اور تمہاری کس چیز کا انتظار کروں؟ تم امن میں ہو یا خوف میں، دونوں صورتوں میں منافقت کرتے ہو، نہ تم کسی نیکی کی جزا دیتے ہو اور نہ کسی نعمت کا شکر ادا کرتے ہو۔''

دوسری طرف یہی حجاج شامی فوج کے لئے ایک پدر مہربان نظر آتا ہے۔ اپنی اس شامی فوج کو، جس کی مدد سے اس نے ابن اشعث کی بغاوت فرو کی تھی، مخاطب کر کے کہتا ہے:

''اے شامیو! میں تمہارے لئے اس شتر مرغ کی طرح ہوں جو اپنے بچوں کی حفاظت کرتا ہے اور ان سے گندگی کو دور کرتا ہے اور انہیں بارش سے پناہ دیتا ہے اور انہیں بھیڑیوں اور دیگر جانوروں سے بچاتا ہے، اس کی موجودگی میں نہ ان کی طرف گند آسکتا ہے، نہ ہلاکت اور نہ انہیں تکلیف ہو سکتی ہے۔''[۱۴]

چنانچہ جہاں حجاج نے ان عراقیوں کو بے دریغ قتل کیا جو ابن اشعث کی بغاوت میں پیش پیش تھے۔ اس میں عرب یا موالی کی کوئی تمیز روا نہیں رکھی۔ وہیں حکومت کی وفادار شامی فوج کو خوب خوب وظائف سے نوازا اور اس سلسلے میں بھی عرب و موالی کی کوئی تمیز روا نہیں رکھی۔ حجاج کے نزدیک اصل معیار حکومت سے وفاداری تھا۔[۱۵] اصل بات یہ ہے کہ رعایا کے تمام طبقوں کی غیر مشروط اطاعت، صرف حکومت بنوامیہ کی ہی بنیادی ضرورت نہیں تھی بلکہ ہر دور میں، ہر حکومت کی ضرورت رہی ہے۔ ماضی قریب میں موالی، خصوصاً عراق میں آباد ایرانی موالی ایک جارح عنصر کے طور پر ابھرے تھے، چنانچہ وہ بھی حجاج کی حکمت عملی کے تحت کچلے گئے، جس پر یہ کہا گیا کہ حجاج نے موالی کو ذلیل و کمتر سمجھا۔ اور ان کے خلاف اقدامات کیے،

حالانکہ اصل واقعہ یہ تھا کہ اس نے مملکت کے باغیوں کے خلاف اقدامات کیے، خواہ وہ عرب ہوں یا موالی۔

یہ بات اب بخوبی واضح ہو چکی ہے کہ مورخین میں ایک گروہ ایسا موجود تھا جس نے نہایت منظم طریقے سے بنوامیہ، خصوصاً ان کے ممتاز ترین منتظمین و مدبرین کے تمام کارناموں کو بری طرح مسخ کیا ہے۔ یہ دبستانِ عراق تھا جس کا سب سے بڑا نمائندہ سیف بن عمر ۱۶ ہے۔ تعصب کو نظر انداز کر کے اگر تاریخی تحقیق سے کام لیا جائے تو حجاج کی خوبیاں بھی منظر عام پر آئیں گی۔ تاہم اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ اس کی انتظامی حکمت عملی میں بنوقیس کی جا و بے جا طرف داری ایسا عنصر ہے جس پر اسے الزام دیا جاسکتا ہے۔ اس کی قیسی پالیسی کی وجہ سے وہ تمام یمنی جو فوج یا حکومت کے دوسرے شعبوں میں ملازم تھے اور وہ سارے باشندے جو اہل یمن کے حامی تھے۔ اس کے خلاف ہو گئے۔ اسی طرح علوی بھی اس کے سخت مخالف تھے، کیونکہ ان کے تمام دعووں کو اس نے سختی اور بے دردی سے کچلا تھا۔

حجاج کے اس عمل کو، کہ اس نے نبطیوں کے ہاتھوں پر حقارت سے مہریں لگوائیں اور بصرے سے موالی (نومسلم عجمیوں) کا وسیع پیمانے پر اخراج کیا، اس کی "موالی دشمنی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ۱۷ ایسا نہیں تھا، کیونکہ یہ کام تو حجاج اس سے قبل اشراف مدینہ اور اصحاب رسول اللہؐ کے ساتھ بھی کر چکا تھا اور وہ سب عرب تھے۔ ان میں ایک بھی موالی شامل نہیں تھا۔ حجاج جب حجاز کا گورنر تھا تو اس دوران اس کا رویہ اہل مدینہ کے ساتھ سخت اہانت آمیز تھا کیونکہ وہ انہیں خلیفہ ثالث، عثمانؓ ابن عفان کا قاتل یا ان کے قتل کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ ۱۸ چنانچہ صحابہ کی ایک جماعت کو ذلیل کرنے کے لئے ان کے ہاتھوں پر اسی طرح سیسے کی مہریں لگائیں جس طرح ذمیوں کے لگائی جاتی تھیں، ان صحابہؓ میں جابر بن عبداللہ، انس بن مالک اور سہل بن سعد ساعدی شامل تھے۔ ۱۹ یہ واقعہ صفر ۷۴ھ کا ہے۔

اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ نبطی عرب تھے اور یہ حضرت اسمٰعیلؑ کے سب سے بڑے بیٹے نابت، کے حوالے سے نبطی، نابت اور نبایوط کہلاتے ہیں۔ حضرت

اسمٰعیل کے بعد خانہ کعبہ کی تولیت نابت کے حصے میں آئی۔ اہل عرب عموماً نبط کو قوماً و اصلاً غیر عرب سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک عرب و عجم جس طرح دو متقابل نام ہیں، اسی طرح نبطی و عربی کو بھی باہم متقابل سمجھتے ہیں۔ اس کا سبب صرف معاشرت، طرز زندگی اور زبان کا اختلاف ہے ورنہ درحقیقت نبط بھی اسمٰعیلی عرب ہیں جو عراق میں پھیلے ہوئے تھے۔[۲۰] چونکہ انہوں نے عموماً حدود عرب سے باہر غیر قوموں میں اپنا مسکن بنایا اس لئے وہ اپنا نسب محفوظ نہ رکھ سکے۔ حضرت عمرؓ کہتے ہیں:

تعلموا النسب ولا تكونوا كنبيط السواد اذا سئل احدهم عن اصله قال: من قريه كذا و كذا.[۲۱]

[نسب سیکھو، عراق کے نبط کی طرح نہ بن جاؤ کہ جب ان سے ان کے خاندان کی بابت پوچھا جائے تو جواب دیتے ہیں کہ ہم فلاں شہر کے ہیں۔]

اہل عرب انباط کو عربوں سے الگ ایک بیرونی قوم سمجھتے تھے، جو درحقیقت ایک مدت تک ان کے عرب سے باہر عراق میں آباد ہونے کا نتیجہ تھا، ورنہ وہ اصلاً عرب ہی تھے، شمالی عرب کے بعض قبائل جو غلطی سے قحطانی کہلاتے ہیں، دراصل نبطی ہی ہیں۔ من جملہ دیگر قبائل کے غسان اور اوس و خزرج کے متعلق تو بتصریح ثابت ہے کہ وہ قحطانی نہیں بلکہ نبطی ہیں شام و عراق کے نبطیوں کی بیشتر آبادی اپنی قومی حیثیت کھو کر یہودیوں، یونانیوں، ایرانیوں اور رومیوں میں اس طرح گھل مل گئی تھی کہ عہد اسلام میں ان اطراف میں جب عرب پھیلے تو کوئی ایک دوسرے کو پہچان نہ سکا۔ عربوں نے ہمیشہ ان کو ایک اجنبی قوم سمجھا اور یہ خود بھی اپنے آپ کو نبطی کہتے تھے۔[۲۲]

حجاج جب واسط آیا تو اس نے تمام نبطیوں کو واسط سے شہر بدر کر دیا اور بصرے میں اپنے عامل حکم بن ایوب کو تحریری حکم بھیجا کہ بصرے میں جتنے نبطی آباد ہوں ان کو شہر سے نکال دو کیونکہ یہ لوگ دین اور دنیا میں فساد ڈالنے والے ہیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اس اقدام کی وجہ یہ تھی کہ جب ابن اشعث اور عبداللہ ابن جارود نے حجاج سے بغاوت کی تو عراق کے قرا [۲۳]

پیش پیش تھے۔ نیز بصرہ کے موالی بھی حجاج کے خلاف تھے چنانچہ ان لوگوں کی یک جہتی کو ختم کرنے کے لئے اس نے انہیں متفرق کر دیا تاکہ آئندہ وہ اس کے خلاف بغاوت نہ کر سکیں جن علاقوں کی طرف انہیں بھیجا گیا، ان علاقوں کے نام ان کے ہاتھوں پر کھدوا دیئے۔ ۴۴

حجاج کی یہ موالی دشمنی نہیں تھی بلکہ یہ ایک انتظامی معاملہ تھا۔ اگر ایک گورنر یہ محسوس کر رہا ہے کہ دیہاتوں اور دیگر علاقوں سے لوگ بڑے پیمانے پر بڑے شہروں کی طرف ہجرت کر رہے ہیں جس کی وجہ سے امن و امان کی صورت حال بگڑ رہی ہے اور فتنہ وفساد بڑھ رہا ہے تو آخر ان مسائل سے نبٹنے کے لئے اقدامات تو کیے ہی جائیں گے۔ حجاج نے یہ کارروائی اس زمانے میں کی تھی جب ابن اشعث کی بغاوت ہوئی تھی، اس طور سے یہ ایک قطعی انتظامی معاملہ تھا، اس سے موالی کی تحقیر کا پہلو نکالنا کسی طور پر درست تجزیہ نہیں۔ حجاج سے پہلے یہی انتظامی اقدام، عراق میں زیاد بن ابوسفیان نے بھی کیا جس کے نتیجے میں اس نے کوفے کے پچاس ہزار عربوں کو خراسان کی طرف منتقل کر دیا تھا۔

حجاج بن یوسف کا ایک اور اقدام جس پر اسے مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے، وہ موالی سے قبول اسلام کے بعد جزیے اور خراج کی وصولی ہے۔ حجاج سے قبل کی اموی حکومت اس بے اعتدالی سے پاک تھی۔ اس معاملے کو طے کرنے میں بڑے بڑے مورخین نے مثلاً جے ولہاؤزن، اور اس کی متابعت کرتے ہوئے لیوی، نکلسن، جرجی زیدان اور حسن ابراہیم حسن وغیرہ نے غلطی کی ہے۔ ان کے بیان کردہ حقائق سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اموی عہد میں از اول تا آخر (حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد کو چھوڑ کر) نومسلم موالی سے جزیہ لیا جاتا رہا ہے حالانکہ یہ بات قانون شریعت کے خلاف تھی۔ ۴۵

اس بات کا جواب موثر کرتے ہوئے سب سے پہلے تو جزیہ اور خراج کی تعریف متعین کر لینی چاہئے کہ بعض مورخین نے یہیں غلطی کی ہے۔

جزیہ (جمع جزئی) کی اصل کے بارے میں دو خیالات ہیں۔

(۱) ایک تو یہ لفظ خالص عربی ہے اور جزاء سے مشتق ہے۔ اس خیال کے حامل ابن منظور (لسان العرب)، امام راغب (مفردات القرآن)، زمخشری (الکشاف)، البیضاوی (انوار التنزیل و اسرار التاویل) اور آلوسی (روح المعانی) ہیں۔

(۲) دوسری رائے الخوارزمی اور لین (Lane) کی یہ ہے کہ لفظ جزیہ فارسی لفظ "گزیت" یا "گزیہ" کا معرب ہے، جس کے معنی فارسی میں خراج کے ہیں اور اس کی جمع جزئی ہے۔

اسلام کے ابتدائی زمانوں میں خراج اور جزیہ کے الفاظ ایک دوسرے کے مترادف رہے ہیں۔ لسان العرب میں ابن منظور نے جزیہ کا لفظ "زمین کا مالیہ" (یعنی خراج) کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ ۲۶ اسی طرح بلاذری نے فتوح البلدان میں ارضا علیها الجزیه من ارض الاعاجم (یعنی عجم کی زمین پر جزیہ) کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ابن عبدالحکم جزیه من ارض ۲۷ (زمین کا جزیہ) کا استعمال کرتے ہیں۔ دوسری طرف بہت سے ابتدائی مورخین نے جزیہ کے لئے خراج کا لفظ استعمال کیا ہے مثلاً امام ابو یوسف "خراج رءو سهم" ۲۸ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح یعقوبی اپنی تاریخ میں خراج رءوسهم" ۲۹ کا اور ابن عبدالحکم لفظ خراج کو "محصولِ سر" کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

ثابت یہ ہوا کہ اسلام کے ابتدائی زمانوں میں جزیہ اور خراج کے الفاظ ایک دوسرے کے مترادف رہے ہیں۔ یہ الفاظ مطلقاً ٹیکس یا مالیہ کے معنوں میں استعمال ہوتے رہے ہیں۔ ان کے درمیان فرق صرف مضاف الیہ سے متعین ہوتا تھا۔ مثلاً "جزیہ علی الارض" یا "خراج علی الارض" کا مفہوم ہمیشہ خراج یا مالیہ زمین (Land Revenue) تھا، اسی طرح "خراج علی الرءوس" یا "جزیہ علی الرءوس" کا مطلب ہمیشہ جزیہ یا "محصول سر" کے معنی میں ہی مستعمل تھا، گویا زمین (ارض) کے ذکر کے ساتھ خواہ خراج کا لفظ آئے یا جزیہ کا اس سے مراد صرف مالیہ زمین (Land Revenue) ہی ہوتا تھا، اسی طرح سر (راس) کے ساتھ جزیہ کا لفظ آئے یا خراج کا اس سے مقصود ہمیشہ "محصول سر" (Poll Tax) ہی ہوتا تھا۔ ۳۰

Tritton نے ایک نکتہ اور بھی بیان کیا ہے کہ اسلامی خلافت کے مغربی صوبوں میں

مالیے کے لئے لفظ جزیہ عام تھا جب کہ شرقی صوبوں میں خراج کا لفظ مروج تھا۔ ۳۱

ان حقائق کو ذہن میں نہ رکھنے کی وجہ سے اکثر مورخین نے خاصی غلطیاں کی ہیں۔

قرآن مجید میں جزیہ کا حکم اس آیت میں موجود ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ. (التوبہ:۲۹)

[ان لوگوں سے جنگ کرو جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتے اور نہ ان چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام کی ہیں اور نہ سچے دین کو اختیار کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی، یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں اور محکوم و مطیع ہونا قبول کریں۔]

اس ضمن میں ایک حدیث بھی نقل کی جاتی ہے:

لیس علی مسلم جزیہ ۳۲

[مسلمان پر جزیہ نہیں ہے۔]

جزیہ وہ مالیہ فرد (Poll Tax) ہے جو اسلامی حکومت اپنی غیر مسلم رعایا سے وصول کرتی ہے اور اس کے عوض انہیں جان و مال، عزت و آبرو کا تحفظ فراہم کرتی ہے۔ ۳۳ اور انہیں دفاعی اور عسکری خدمات سے بھی آزاد کر دیا جاتا ہے۔ تاہم اگر وہ خود اپنی خوشی سے مسلمانوں کے لئے عسکری خدمات انجام دیتے تو ان سے اس سال کا جزیہ ساقط کر دیا جاتا۔ ۳۴

جزیہ کتنا عائد کیا جائے، اس کی کوئی بنی بندھی رقم نہیں تھی، بلکہ یہ حاکم اور امیر لشکر کی صوابدید پر منحصر تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے یہود و نصاریٰ (اہل کتاب) اور مجوس سے (جو اہل کتاب کے مشابہ قرار دیے گئے) جزیہ قبول فرمایا ۳۵ اور انہیں مذہبی آزادی عطا کی، البتہ بت پرستوں اور مشرک عربوں سے صرف اسلام ہی قابل قبول تھا۔ جزیہ سے ان کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری کبھی قبول نہیں کی، حضرت معاذ بن جبل کو جو آپؐ کے عہد میں یمن

کے حاکم (گورنر) تھے، آپؐ نے ہدایت فرمائی:

''یہود و نصاریٰ کو اپنا دین چھوڑنے کی آزمائش میں نہ ڈالا جائے اور ان پر جزیہ عائد کیا جائے۔ ہر بالغ مرد، عورت، غلام اور لونڈی پر ایک دینار یا اس کا مساوی (سامان) واجب ہے، جو یہ رقم میرے کارندوں کو ادا کرے وہ اللہ اور اس کے رسول کی حفاظت و ذمہ داری میں آ گیا اور جو نہ دے وہ اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کا دشمن ہے۔'' ۳۶

اسی طرح آپؐ نے اہل نجران حارث بن عبد کلال، نعیم بن عبد کلال، شریح بن عبد کلال اور بحرین کے ازد عمان کو جزیہ یا اسلام قبول کرنے کا اختیار دیا، جو یا تو اہل کتاب میں سے تھے، یا مجوسی تھے۔ ہجر کے مجوسیوں، اہل ایلہ اور اہل اذرح سے ہی آپؐ نے جزیہ قبول فرمایا۔ ۳۷ غزوہ تبوک سے واپسی پر جب آپؐ مدینے تشریف لائے تو مدینے، خیبر، یمن اور نجران کے تمام اہل الذمہ پر جزیہ عائد کیا اور اس مد میں نقدی کے علاوہ اسلحہ اور دیگر سامان ادا کرنے کی بھی اجازت دی۔

حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں جزیرۂ عرب سے باہر سب سے پہلا مفتوحہ شہر بصریٰ تھا۔ آپؓ نے اس شہر کے باشندوں کو جزیہ یا اسلام دونوں کا اختیار دیا۔ جب وہ جزیہ دینے پر راضی ہو گئے تو ہر بالغ مرد پر ایک دینار، اور ایک جریب گندم سالانہ کے حساب سے عائد کیا گیا۔ ۳۸ حوران اور مآب کے لوگوں نے بھی حضرت ابو عبیدہ سے اہل بصریٰ کی شرائط پر صلح کر لی۔ ۳۹

بلاذری نے فتوح البلدان میں ذکر کیا ہے کہ حضرت خالد بن ولید نے اہل دمشق پر جو جزیہ عائد کیا، اس کی مقدار ایک دینار نقد، ایک جریب گندم اور کچھ تیل اور سرکہ تھا، لیکن حضرت ابو عبیدہ نے شام کے کچھ لوگوں پر جزیے کی ایک معین مقدار عائد کر دی، اس میں یہ شرط تھی کہ جزیہ دینے والے کم یا زیادہ ہو جائیں، تب بھی اس مقدار میں کمی یا بیشی نہیں ہوگی۔ اسی طرح کچھ لوگوں کے ساتھ یہ شرط تھی کہ ان کی استطاعت کے مطابق جزیہ وصول کیا جائے

گا۔ اگر مال و دولت میں اضافہ ہوا تو جزیہ بھی بڑھ جائے گا اور اگر مال میں کمی ہوئی تو اسی قدر جزیے میں بھی کمی کر دی جائے گی۔

گویا اسلام کے ابتدائی دور میں ہی ہم مقدار جزیہ کو مختلف دیکھ رہے ہیں چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی ہم یہ فرق دیکھتے ہیں۔ شام، عراق، مصر اور ایران کے لوگوں پر جزیہ کی مقدار اور طریق کار میں اختلاف ملتا ہے۔ ابوعبید کی ایک روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے سونا رکھنے والوں پر چار دینار، چاندی رکھنے والوں پر چالیس درہم جزیہ عائد کیا اور اس کے ساتھ اہل ذمہ کو مسلمانوں کی تین دن کی ضیافت کا بھی ذمہ دار ٹھہرایا۔ ۴۰؎ ایک اور روایت کی رو سے حضرت عمرؓ کا عائد کردہ جزیہ ۴۸ درہم، ۲۴ درہم اور ۱۲ درہم تھا۔ ۴۱؎ یعنی وہ اہل الذمہ کی استطاعت اور حیثیت کے مطابق ان سے جزیہ وصول کرتے تھے۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جب افریقہ کے بعض خطے فتح ہوئے تو آپؓ نے بربروں سے جزیہ قبول کیا اور انہیں اہل الذمہ کی حیثیت عطا کر دی۔ ۴۲؎

حضرت علیؓ اہل حرفہ سے ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں قبول کر لیتے تھے اور ذمیوں کو اس بات پر مجبور نہیں کرتے تھے کہ وہ ضرور نقد ہی ادا کریں۔

امیر معاویہؓ نے اہل مصر کی خوشحالی کو دیکھتے ہوئے ان کے جزیہ میں ایک قیراط اضافے کی تجویز دی، لیکن گورنر مصر عمرو بن العاص کے موالی وردان نے امیر معاویہؓ کی اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا کیونکہ ان کے عہد نامے کی شرائط میں لکھا ہوا تھا کہ جزیہ کی مقدار میں کبھی اضافہ نہیں ہوگا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت معاویہ اہل مصر پر ان کی دولت مندی کی بنا پر جزیہ کی رقم میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ مصر کے گورنر عمرو بن العاص کے موالی وردان ۴۳؎ کو یہ حکم تحریر کیا "ان زد علی القبط قیراطا علی کل انسان" یعنی (ہر قبطی پر ایک قیراط جزیہ میں اضافہ کردو۔) اس کے جواب میں وردان موالی عمرو بن العاص نے امیر معاویہ کو جواب دیا کہ "کیف ازید علیھم و فی عھدھم ان لایزاد علیھم" ۴۴؎ یعنی (میں ان پر

کیونکر اضافہ کر سکتا ہوں جب کہ ان کے عہد نامے کی شرائط میں یہ لکھا ہے کہ جزیہ کی مقدار میں اضافہ نہ ہوگا۔) چنانچہ اضافہ نہ ہو سکا۔ حالانکہ بعض اوقات حضرت معاویہؓ نے ذمیوں کی درخواست پر جزیہ کی رقم میں قابل ذکر کمی بھی کی تھی، مثلاً شام اور گرد و نواح کے نجرانی جزیہ میں غلے دیا کرتے تھے، اس کی تعداد امیر معاویہ نے کم کر کے نصف کر دی تھی۔ ۴۵

چونکہ ایک ہی واقعے سے مختلف ذہن، مختلف نتائج کا استنباط کرتے ہیں لہٰذا جرجی زیدان مصری جزیہ میں اضافہ کے اس واقعہ کو امیر معاویہؓ کے خلاف استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے ذمیوں پر ظلم کیا اور یہ کہ ذمیوں پر ظلم کرنے کا آغاز امیر معاویہؓ کے زمانے سے ہی ہو گیا تھا۔ ۴۶ حالانکہ یہ واقعہ امیر معاویہؓ کے حق میں جاتا ہے۔ اس واقعہ سے یہ تو ضرور ثابت کیا جا سکتا ہے کہ امیر معاویہ حلیم الطبع اور شرائط کی پاسداری کرنے والے خلیفہ تھے۔ یہ بہرحال ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ظالم تھے اگر ظالم ہوتے تو بیک جنبش قلم شرائط منسوخ کر دیتے اور جزیہ میں ایک قیراط اضافے کا شاہی فرمان جاری کر دیتے۔

دراصل اہل الذمہ بھی دو قسم کے تھے۔ ایک وہ اہل الذمہ تھے، جن کے علاقے فوجی طاقت کے زور پر فتح ہوئے۔ دوسرے وہ اہل الذمہ تھے جن کے علاقے صلح کے ذریعہ فتح ہوئے۔ جہاں تک فوجی طاقت کے زور پر فتح ہونے والے علاقوں کا تعلق ہے اس سلسلے میں فقہا کا پسندیدہ مسلک یہی رہا ہے کہ جس طرح جزیہ کی رقم میں کمی کی جا سکتی ہے، یہاں تک کہ اسے معاف بھی کیا جا سکتا ہے، وہیں جزیہ کی رقم میں اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ خود حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے عائد کردہ جزیہ کی رقم میں اہل شام اور اہل کوفہ کی آسودگی کو دیکھتے ہوئے اضافہ کیا تھا۔ ۴۷ اور ایک بار خود اپنے مقرر کردہ زیادہ سے زیادہ جزیہ یعنی ۴۸ درہم سالانہ کو بڑھا کر ۵۰ درہم سالانہ کر دیا تھا کیونکہ عراق کے اہل الذمہ اس کی استطاعت رکھتے تھے۔ ۴۸

دوسرے وہ علاقے جو صلح کے ذریعہ فتح ہوئے اور اہل الذمہ خاص شرائط کے تحت جزیہ دیتے ہوں وہاں کمی بیشی جائز نہیں کیونکہ شرائط صلح سے زائد لینے کو رسول اللہ ﷺ نے

حرام قرار دیا ہے۔۴۹ چنانچہ ایک بار ایک شخص حضرت عمرؓ بن خطاب کے پاس آیا اور اس نے کہا ''انی قد اسلمت فارفع الخراج عن ارضی '' یعنی (میں نے اسلام قبول کرلیا ہے لہٰذا آپ میری زمین سے خراج اٹھا دیجئے۔) تو حضرت عمرؓ نے جواب دیا ''ان ارضک اخذت عنوۃ'' ۵۰ یعنی (تمہاری زمین تو فوجی طاقت کے ذریعہ فتح ہوئی ہے۔) اسی طرح ایک اور شخص خلیفہ ثانی کے پاس آیا اور کہا ''ان ارض کذا و کذا تحتمل من الخراج اکثر مما علیھا'' یعنی (فلاں فلاں زمین متعینہ خراج سے زیادہ ادا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔) تو حضرت عمرؓ نے جواباً کہا ''لیس علی اولئک سبیل، انا صالحناھم'' ۵۱ یعنی (ان لوگوں پر اضافے کا کوئی جواز نہیں کیونکہ ہم نے ان لوگوں سے صلح کی ہے۔)

اس صورت حال کی روشنی میں اگر اس مطالبے کا جائزہ لیا جائے جو امیر معاویہؓ نے وردان سے کیا تھا کہ قبطیوں کا جزیہ بڑھا دو تو یہ مطالبہ درست تھا، کیونکہ امیر معاویہ کے خیال کے مطابق مصر فوجی قوت کے ذریعے فتح ہوا تھا، اس لئے حضرت معاویہؓ نے اضافہ کرنا جائز خیال کیا لیکن وردان کے خیال میں وہ بذریعہ صلح فتح ہوا تھا، لہٰذا انہوں نے اضافہ کرنا ناپسند کیا۔۵۲ اس اختلاف رائے کا سبب یہ تھا کہ مصر کی فتح میں دونوں باتیں شامل تھیں، اس کا ایک بڑا حصہ تو فوجی طاقت سے فتح ہوا تھا لیکن اسکندریہ کا شہر ایک معاہدے کے تحت، اسلامی فوجوں کے لئے خالی کیا گیا تھا۔۵۳

جزیہ کے معاملے میں بے قاعدگی دراصل حجاج بن یوسف کے دور میں نظر آتی ہے۔ حجاج نے جہاں جزیے میں اضافہ کیا، وہاں نومسلموں پر سے بھی جزیہ ساقط نہ کرنے کا قاعدہ جاری کیا۔ تاہم یہ قاعدہ پوری مملکت اسلامیہ کا نہیں تھا، ان علاقوں کا تھا جہاں حجاج کی عملداری تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ماضی قریب میں موالی حکومت کے لئے بہت بڑا خطرہ ثابت ہو چکے تھے۔ مختار ثقفی کی فوج شامل ہو کر انہوں نے براہ راست حکومت وقت سے ٹکر لی تھی، اور یہ کچھ بعید نہ تھا کہ کوئی اور طالع آزما پھر انہیں حکومت کے خلاف استعمال کر لیتا۔ درحقیقت مختلف اقوام کو جن کے خیالات اور تمدنی پس منظر ایک دوسرے سے مختلف ہوں، انہیں ایک ہی

قانون کا پابند کر کے رکھنا ایک نہایت ہی مشکل کام ہے اور اکثر بلا جبر شدید کے اس میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ ۵۴؎ لہٰذا اس سیاسی مسئلے کا حل حجاج نے یہ نکالا کہ انہیں اقتصادی طور پر دبا دیا جائے، ان پر ایسی معاشی مشکلات ڈالی جائیں کہ وہ سیاست چھوڑ کر پیٹ بھرنے کی فکر میں لگ جائیں۔ لہٰذا اس نے یہ عجیب فلسفہ پیش کیا کہ ''جزیہ دراصل اس ٹیکس کی حیثیت رکھتا ہے جو غلاموں پر عائد کیا جاتا ہے اور غلام کے اسلام قبول کر لینے سے اس پر عائد شدہ یہ ٹیکس (جزیہ) معاف نہیں ہو جاتا۔'' ۵۵؎

تاہم جزیہ کی اس تاویل کے باوجود شرعی نقطہ نظر سے یہ ایک غلط کام تھا جو حجاج اور اس کے بعض عمال نے کیا۔ حجاج کا یہ واحد فعل ہے جو ''موالی دشمنی'' پر مبنی نظر آتا ہے، تاہم موالی سے بدستور خراج لینے پر حجاج قابل گرفت ہرگز نہیں ہے۔ جرجی زیدان لکھتا ہے:

> ''(موالی پر) حجاج کے ستم ناقابل برداشت تھے، اس نے ان لوگوں کو خراج سے بری نہیں کیا تھا، اگرچہ وہ بے چارے اپنے کھیتوں اور باغوں کو چھوڑ کر اور گھر بار سے بھاگ کر شہروں میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، لیکن حجاج نے یہ حکم دیا کہ انہیں پھر ان کے دیہاتوں میں واپس کیا جائے اور ان سے خراج لیا جائے۔'' ۵۶؎

یہاں پھر جرجی زیدان نے سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ تاہم اس ضمن میں مزید کچھ لکھنے سے قبل ہمیں جزیہ کی طرح خراج کی تعریف بھی طے کر لینی چاہئے اور اس کی تاریخ کو نظر میں رکھنا چاہئے تاکہ غلطی کا احتمال نہ رہے۔

خراج ایک عربی لفظ ہے جو قرآن مجید میں ۵۷؎ بمعنی اجر وصلہ کے استعمال ہوا ہے، عربی زبان میں عموماً اس کے معنی کرایہ، محصول، آمدنی، پیداوار، اجرت یا معاوضے کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عرب زمین کی پیداوار، گھر کے کرایہ اور مملوک غلام سے حاصل شدہ آمدنی کو خراج کہتے تھے۔ یہ لفظ عام لگان یا محصول کے لئے بھی بولا جاتا تھا، تاہم جیسا کہ پہلے بھی

لکھا گیا پہلی صدی ہجری تک عموماً جزیہ اور خراج مترادف الفاظ تھے۔

حضرت عمرؓ کی فتوحات کے زمانے میں جب نئے مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کو لونڈی غلام بنا کر فوجیوں میں تقسیم کردینے کے بجائے اوران کی زمینوں کو غنیمت کے طور پر تقسیم کردینے یا بحق سرکار ضبط کرلینے کے بجائے ان مفتوحہ باشندوں کو ان کی مملوکہ اراضی پر بدستور قابض رہنے دیا گیا تو ان کی زمین پر محصول عائد کردیا گیا۔ جس کے تحت مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کو اپنی فصل اور پیداوار کا ایک مقررہ حصہ بطور خراج اسلامی خزانے میں داخل کرنا ہوتا تھا۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مفتوحہ علاقوں کی تین قسمیں تھیں، چنانچہ ان کے متعلق تین قسم کے احکام ہیں۔

۱۔ ایک تو وہ مفتوحہ اراضی جن کے مالک اسلام قبول کرلیں اور اس بنا پر وہ انہی کی ملکیت رہیں، ان سے عشر کے سوا کچھ وصول نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ وہ اراضی جو ایک معین خراج ادا کرتے رہنے کی شرط پر صلح کے ذریعہ فتح ہوئی ہوں۔ ان سے شرائط صلح کے مطابق معاملہ کیا جائے گا اور اس سے زیادہ ان پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔

۳۔ وہ مفتوحہ علاقے جو فوجی قوت کے بل بوتے پر فتح کیے گئے ہوں اور یہی وہ زمینیں ہیں جن کے بارے میں مسلمانوں کو اختلاف رہا ہے۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ ایسی زمینوں کو غنیمت شمار کرتے ہوئے ان پر غنیمت کے احکام کا اطلاق کیا جائے گا، یعنی وہ پانچ حصوں میں تقسیم کرکے اس طرح بانٹ دی جائیں گی کہ ۴/۵ حصے تو صرف اسے فتح کرنے والوں کو دیے جائیں گے اور بقیہ ۱/۵ حصہ ان میں تقسیم ہوگا، جس کا تعین اللہ تعالیٰ نے کردیا ہے۔

دوسری جماعت کا خیال ہے کہ ایسی زمینوں کا معاملہ امام کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے گا۔ اگر وہ ان کے غنیمت ہونے کا فیصلہ کرے تو ان کے پانچ حصے کرکے تقسیم کردے، جیسے رسول اللہ ﷺ نے خیبر میں کیا تھا لیکن اگر امام ان زمینوں کو فے قرار دے دیا تو وہ عامہ

المسلمین کے باقی رہنے تک ان کے لئے وقف کی حیثیت رکھیں گی (یعنی یہ اراضی اسلامی حکومت کے قبضے میں رہیں گی اور اشخاص کی ملکیت نہیں بنائی جائیں گی) بالکل اسی طرح جیسے سواد عراق کی اراضی کے متعلق حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا تھا۔ ۵۸؎

اب اگر دوسری قسم کے مفتوحہ علاقوں کے ذمی اسلام قبول کر لیتے تو اب ان پر سے جزیہ تو ساقط کر دیا جاتا مگر خراج بدستور لاگو رہتا۔ انہیں شرائط کی پابندی کرتے ہوئے اسلام قبول کر لینے کے باوجود متعینہ خراج ادا کرنا ہوگا، یہ ظلم اس لئے نہیں ہے کہ یہ انہی کے صلح نامے کی پابندی ہے۔

اسی طرح تیسری قسم کے مفتوحہ علاقوں کے ذمی اگر مسلمان ہو جائیں تو ان پر سے بھی جزیہ تو ساقط ہو جائے گا مگر انہیں بھی بدستور خراج ادا کرنا ہوگا کیونکہ ان خراجی اراضی کی حیثیت ''فے'' کی ہے، ''فے'' اسی طرح کا ''وقف'' ہے اور ''وقف'' کو ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس بات کو یوں سمجھا جائے کہ حضرت عمرؓ نے ذمیوں کو زمین مقرر خراج کے عوض بالکل اسی طرح دی تھی جیسے ایک آدمی اپنی زمین کسی دوسرے شخص کو معینہ کرائے پر دیتا ہے۔ اب اگر کرایہ دار مسلمان ہو جائے تو وہ مسلمان مالک مکان سے اس بات کا مطالبہ تو نہیں کر سکتا کہ چونکہ میں مسلمان ہو گیا ہوں، لہٰذا میرا کرایہ معاف کر دیا جائے۔

حضرت عمرؓ اور ان کے بعد تمام خلفاء کا یہی طریقہ رہا کہ خراج ادا کرنے والا ذمی اگر مسلمان ہو جاتا تو اس پر سے جزیہ ساقط کر دیا جاتا مگر خراج بدستور عائد رہتا۔ چنانچہ حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں ایک زمین دار نے اسلام قبول کر لیا تو حضرت علیؓ نے کہا ''اگر تم اپنے علاقے میں اپنی زمین پر ہی اقامت رکھو گے تو ہم تم سے جزیہ معاف کر دیں گے لیکن تمہاری زمین سے خراج لیتے رہیں گے۔ اور اگر تم اپنی زمین چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہو جاؤ گے تو ہم اس زمین کے زیادہ حقدار ہوں گے۔ ۵۹؎ (یعنی وہ اسلامی ریاست کی ملکیت رہے گی۔)

خلفائے راشدین کا یہی طریقہ تھا اور اسی طریقے پر حجاج کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی عمل کیا تو اگر حجاج نے خراج لیا تو غلط نہیں کیا، اس نے وہی اقدام کیا جو متفق

علیہ تھا۔ جرجی زیدان نے یہ لکھ کر "ذمیوں میں سے کوئی شخص مسلمان ہوتا تو اس کے ذمے سے خراج ساقط ہو جاتا"، ۶۰ بہت بڑی تاریخی غلطی کی ہے، بلکہ یہ غلطی اس نے ولہاؤزن کی متابعت میں کی ہے۔

مورخین، حجاج بن یوسف کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے یہ تو لکھتے ہیں کہ حجاج نے مسلمان ہو جانے والے ذمیوں پر بدستور خراج عائد کر رکھا، مگر یہ نہیں بتاتے کہ ان مسلمان ہو جانے والے ذمیوں کا تعلق کس قسم کے مفتوحہ علاقوں سے تھا۔ اگر ان کا تعلق ان مفتوحہ علاقوں سے تھا جو فوجی قوت کے ذریعے حاصل کیے گئے تو وہ علاقے مسلمانوں کے لئے "فے" ہو گئے، ان زمینوں کی خرید و فروخت کو پسندیدہ نہیں سمجھا گیا، کیونکہ یہ زمینیں درحقیقت مسلمانوں کی ملکیت تھیں۔ ۶۱ وہاں کا زمیندار اگر مسلمان ہو جائے گا تب بھی اسے خراج دینا ہوگا۔ یہ ایک فقہی فیصلہ ہے، اس فقہی فیصلے کے مطابق ان زمینداروں سے حجاج نے ان کے اسلام قبول کر لینے کے باوجود خراج وصول کیا تو کوئی غلط کام نہیں کیا، مگر جے۔ ولہاؤزن اور اس کی متابعت کرتے ہوئے بیکر اور بہت سے مسلمان مورخین بار بار اس غلطی کا اعادہ کر رہے ہیں، کہ حجاج نے بدستور خراج لے کر موالی دشمنی کا ثبوت دیا۔

اسی طرح عراق کے جو علاقے صلح کے ذریعے حاصل ہوئے مثلاً حیرہ، بانقیا اور الّیس وغیرہ ۶۲ وہاں کے معاملات صلح نامے کی شرائط کے مطابق طے کیے گئے، یعنی یہ کہ وہاں کی زمینیں، وہیں کے باشندوں کی ملکیت رہیں گی، ان زمینوں کے خرید و فروخت کے معاملات انہیں کے پاس رہیں گے، مگر صلحی زمینوں پر عائد کردہ خراج اس زمیندار کو دینا ہوگا خواہ وہ اسلام قبول کر لے یا نہ کرے۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز سے بعض اہل سواد (عراق) کے بارے میں یہ سفارش کی گئی کہ ان کی خراجی زمینوں کو عشری بنا دیا جائے تو انہوں نے یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا۔ ۶۳ خراجی زمین کے بارے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا استدلال یہ تھا کہ وہ "فے" ہے اور مسلمانوں کی اس فے کو بیچا یا ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ۶۴

یہی نہیں بلکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز دیگر خلفا کی طرح فوجی قوت کے ذریعے حاصل ہونے والی خراجی زمین کے مالک کے مسلمان ہوجانے کے بعد اس سے خراج کے ساتھ عشر بھی وصول کرتے تھے۔ اس ضمن میں ان کا استدلال تھا کہ:

"الخراج علی الارض، والعشر علی الحب." ۶۵

[یعنی خراج تو زمین کا ٹیکس ہے اور عشر، غلے اور پیداوار پر واجب ہوگا۔]

اس سلسلے میں علما کی دو آراء ہیں۔

۱۔ ایک گروہ کا، جس میں ابن عباس اور عکرمہ شامل ہیں، یہ خیال ہے کہ خراج اور عشر کو جمع نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ قوت کے ذریعے حاصل ہونے والی خراجی زمین کا مالک اگر مسلمان ہوجائے تو وہ خراج کے ساتھ عشر بھی ادا کرے گا۔ اس گروہ کے علما میں مالک بن انس، امام اوزاعی، قبیصہ، نُعیم بن حماد، عمر بن عبدالعزیز، ابن بکیر اور قاسم بن سلام وغیرہ شامل ہیں۔

اس ضمن میں موخر الذکر گروہ کے علما کا استدلال یہ ہے کہ عشر اور خراج دو جداگانہ مستقل ٹیکس ہیں اور ان دونوں آمدنیوں کے مصارف بھی الگ الگ ہیں۔ "خراج" کی مد سے فوجیوں کی تنخواہیں اور ان کے اہل و عیال کو وظائف دیے جاتے ہیں اور "عشر" صدقہ (زکوٰۃ) ہے، جس کا مصرف ان آٹھ مدوں میں ہوگا جو مقرر ہیں، لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا کہ دو مستقل حقوق میں سے ایک حق کا ادا کرنا، دوسرے حق سے معافی کا سبب بن جائے۔

ان حقائق کی روشنی میں جو صورتِ حال سامنے آرہی ہے وہ جے۔ ولہاؤزن کے بیان کردہ نظریے سے مختلف ہے۔

جولیس ولہاؤزن *(Julius Wellhausen)* نے اپنی جرمن کتاب (دولت عربیہ اور اس کا سقوط، مطبوعہ برلن، ۱۹۰۲ء) میں دولت عربیہ اور اس کے سقوط کا نظریہ غالباً سب سے پہلے پیش کیا، جس کے عمومی نکات نصف صدی تک برابر مسلم مانے گئے، بلکہ

اب تک مانے جاتے ہیں۔ تاہم ڈی۔ سی ڈینیٹ نے اپنی کتاب Conversion and the Poll Tax in Early Islam میں بعض اہم حقائق کی نشاندہی کرتے ہوئے، ولہاؤزن کے نظریے سے اختلاف کیا ہے۔

ج۔ ولہاؤزن کے نظریے کا لب لباب یہ ہے:

۱۔ مختلف ممالک فتح کرنے کے بعد فاتح عربوں نے مفتوحہ اقوام سے ایک معین رقم بہ سلسلۂ خراج اور ایک معین مقدار بہ سلسلہ پیداوار زرعی وصول کی۔ اس خراج کی تشخیص مقامی اور کلیسائی حکام نے کی جو فتح سے پیشتر بھی ان فرائض کی بجا آوری کرتے رہے تھے، عربوں کی تشخیص و وصول کے ذرائع یا تشخیص کنندوں کی عدل کے ساتھ نگرانی سے کوئی سروکار نہ تھا۔

۲۔ جو شخص دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا اسے محض محصول سر یعنی جزیہ ہی سے نہیں بلکہ ہر خراج سے مستثنیٰ کر دیا جاتا۔ جو زمینیں غیر مسلموں کے قبضے میں تھیں اگر ان کے مالک دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے یا وہ مسلمانوں کے ہاتھوں فروخت کر دی گئیں تو انہیں خراج سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ اس طرح سے گویا غیر مسلموں کے قبول اسلام کے لئے ایک زبردست اقتصادی محرک بروئے کار لایا گیا اور وسیع پیمانے پر قبول اسلام سے تین نتائج پیدا ہوئے۔

(الف) عرب جو محاصل وصول کرتے تھے، ان میں زبردست کمی آ گئی۔

(ب) خراج گزار جماعتوں پر مالی بار ناقابل برداشت ہو گیا۔ کیونکہ جو محاصل لوگ، داخل اسلام ہونے سے پہلے ادا کرتے تھے، وہ اب ان لوگوں کے کندھوں پر ڈال دیے گئے جو اپنے مذہب پر قائم رہے۔[۲۶]

(ج) بہت سے نو مسلم زمینیں اور گاؤں چھوڑ کر عرب شہروں میں پہنچ گئے۔ جہاں وہ عربوں کے "موالی" بن گئے۔ یہاں انہیں یہ شکایت پیدا ہوئی کہ ان کے عرب موالی ان سے مجلسی مساوات کا برتاؤ نہیں کرتے۔ خصوصاً حکومت کی طرف سے انہیں

وظائف نہیں ملتے چنانچہ وہ لوگ حکومت بنو امیہ کے لئے ایک مستقل خطرہ بن گئے۔

۳۔ عراق کے حاکم حجاج بن یوسف نے مالیے میں ہو جانے والی کمی کے پیش نظر نو مسلموں پر از سر نو خراج کا پورا بار ڈال دیا، اگرچہ قانوناً یہ جائز نہ تھا، اس طرح انہیں شہروں سے نکال کر پھر زمینوں پر بھیج دیا۔

۴۔ متقی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے فیصلہ فرمایا کہ قبول اسلام کے بعد ہر فرد محاصل سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے لیکن جن اراضی سے محصول وصول ہوتا تھا اسے معافی میں منتقل ہونے سے روکنے کے لئے عمر بن عبدالعزیز نے ۱۰۰ھ میں حکم دیا کہ نہ کوئی اراضی مسلمان کے ہاتھ فروخت ہو اور نہ کوئی اراضی کسی کے قبول اسلام سے معافی میں منتقل ہونے پائے اس کے بعد نو مسلم کے لئے دو صورتیں باقی رہ گئیں:

اولاً یہ کہ اراضی پر قابض رہے اور خراج کے برابر اس کا مالیہ ادا کرتا رہے۔
ثانیاً اراضی چھوڑ کر شہروں میں منتقل ہو جائے۔ (نو مسلم دوسرا طریقہ اختیار کرتے رہے۔)

۵۔ ۱۲۱ھ/ ۷۳۹ء میں خراسان کے حاکم نصر بن سیار نے حکم دیا کہ آئندہ تمام لوگ خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اراضی کا مالیہ ادا کریں، لیکن جزیہ صرف غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا تھا اور اس سے ان کی تحقیر مقصود تھی۔

ولہاؤزن نے پہلے یہ نظریہ پیش کر دیا پھر ان تمام شہادتوں کو قبول کر لیا جو اس کے نظریے کی تائید کرتی تھیں اور انہیں مؤرخین کی پیش کردہ وہ شہادتیں جو اس کے نظریے سے متناقض تھیں، رد کر دیں، بایں ہمہ ان شہادتوں کو رد کرنے کی کوئی معقول وجہ پیش نہیں کی۔ چونکہ اکثر مسلمان فقہا اور مؤرخین کے بیانات ولہاؤزن کو اپنے نظریے سے متناقض نظر آئے لہٰذا اس نے مثالیت پسند کہہ کر رد کر دیا۔

ولہاؤزن کے اس نظریے کا سرگرم حامی سی۔ ایچ۔ بیکر (C.H. Becker) تھا۔ اس کے بعد بہت سے مسلمان مؤرخین اور مستشرقین نے انہی خیالات کی متابعت کی حالانکہ

ولہاؤزن کے اپنے خیالات ایک دوسرے سے متناقض ہیں یعنی ایک طرف ولہاؤزن حجاج بن یوسف اور عمر بن عبدالعزیز کے اصلاح مالگزاری کے قانون کی توضیح میں یہ کہتا ہے کہ قبول اسلام سے عربوں کے مالیے کو نقصان پہنچا، دوسری طرف اس کا بیان یہ ہے کہ محصول ادا کرنے والی جماعتوں کے انفرادی محاصل ناقابل برداشت حد تک بڑھ گئے تھے اور سلطنت میں اسی سبب سے سیاسی بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔

گویا ولہاؤزن کے مطابق ہر مقام کا ٹیکس معین تھا اور کوئی مقامی شخص اگر مسلمان ہو جاتا تو اس پر سے تو سب محصولات معاف ہو جاتے مگر اس مقام کے باقی لوگ وہی معینہ ٹیکس ادا کرنے کے پابند ہوتے (گویا ہر غیر مسلم محصول گزار کا انفرادی بار اس کے ہمسائے کے قبول اسلام سے بڑھتا جاتا)۔ ۹۷ اگر صورت حال یہی تھی تو عربوں کو اس سے کیا نقصان پہنچا۔ پھر ولہاؤزن کی یہ بات کیسے مانی جا سکتی ہے کہ غیر مسلموں کے قبول اسلام سے اسلامی حکومت مفلس اور قلاش ہوتی چلی گئی؟

حاصل بحث یہ کہ ولہاؤزن کا بیان کردہ یہ نکتہ درست ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام قبول کر لینے کے لئے ایک زبردست اقتصادی محرک بروئے کار لایا گیا نیز یہ کہ قبول اسلام سے بیت المال کی آمدنی میں کمی ہوئی۔

درست بات جو سامنے آئی وہ یہ ہے کہ ذمیوں کے اسلام قبول کر لینے سے اسلامی حکومت کو ہونے والی آمدنی گھٹی نہیں بلکہ بڑھی کیونکہ جو لوگ پہلے صرف خراج دیتے تھے اب اسلام لانے کے بعد ان پر عشر بھی عائد ہو جائے گا۔ دوسری طرف قبول اسلام کی وجہ سے ان پر سے جزیہ کی معمولی رقم تو ضرور ساقط ہو جائے گی مگر ساتھ ہی زکوۃ عائد ہو جائے گی۔

پھر بہت سے مؤرخین مثلاً الفرڈ فان کریمر (*Alfred Von Kremer*) اور اس کی متابعت کرتے ہوئے ملر (*A. Muller*) اور فان فلوتن (*G. Von Vloten*) نے موالی پر ہونے والے سماجی اور معاشی ظلم کا تعلق ابن اشعث کی بغاوت سے جوڑا ہے۔ ۹۸

اس میں کوئی شک نہیں کہ متعدد وجوہات کی بنا پر جب عبدالرحمٰن ابن محمد بن اشعث ۶۹؎ نے حجاج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو موالی نے اس کا ساتھ دینے میں دیر نہیں کی۔

یہ بغاوت ۸۱ھ/ ۷۰۱ء میں ہوئی اور حجاج بن یوسف کے خلاف ہونے والی بغاوتوں میں یہ سب سے بڑا خروج تھا۔ حجاج نے عبدالرحمٰن کو ایک لشکر جرار کا والی بنا کر زابلستان کے بادشاہ رتبیل سے جنگ کرنے سیستان بھیجا تھا۔ اس فوج میں بیس ہزار سپاہی کوفہ کے اور بیس ہزار بصرہ کے تھے۔ ۷۰؎ یہاں عبدالرحمٰن ابن محمد ابن اشعث نے بہت سے شہر اور قلعے فتح کیے اور ایک سال کے لئے جنگ موخر کردی۔ حجاج کو یہ بات پسند نہ آئی، اس نے تحریری طور پر عبدالرحمٰن سے سخت باز پرس کی کہ اس نے دشمن کو پوری طرح روندے بغیر کیوں دم لیا۔ حجاج نے عبدالرحمٰن کو جنگ جاری رکھنے کا حکم دیا، اس کے فوراً بعد دوسرا خط بھی اسی نوعیت کا لکھا اور فوراً ہی تیسرا خط لکھا جس میں درج تھا کہ اگر تم نے ہمارے حکم کی اطاعت کی تو بہتر ورنہ تم خود کو معزول سمجھو اور تمہاری جگہ تمہارا بھائی اسحاق بن محمد امیر لشکر ہے۔ ۷۱؎

عبدالرحمٰن اور حجاج کے درمیان شخصی عداوت بہت پہلے سے چلی آرہی تھی ۷۲؎ چنانچہ اس ذاتی عناد اور بغض کی وجہ سے عبدالرحمٰن کے ہاتھ پر حجاج کی خلع حکومت اور اس کو عراق سے نکال دینے اور نکالنے والوں کی امداد کی بیعت کرلی۔ اس بیعت میں عبدالملک کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔ ۷۳؎

اس موقع پر عبدالرحمٰن نے رتبیل والی زابلستان سے مشروط مصالحت کرلی، شرط یہ تھی کہ ابن اشعث اور حجاج کی کشمکش میں اگر ابن اشعث کامیاب ہوا تو وہ رتبیل کا خراج معاف کردے گا اور اگر ابن اشعث کو شکست ہوئی تو رتبیل اسے پناہ دے گا۔ ۷۴؎ اس کے بعد اپنے مفتوحہ علاقوں پر اپنے عمال مقرر کرکے عبدالرحمٰن اپنی زبردست فوج لے کر حجاج کی سرکوبی کے لئے عراق کی طرف روانہ ہوا۔ فارس پہنچتے پہنچتے لشکر میں یہ خیال عام ہوگیا کہ اگر ہم نے حجاج کو امارت سے معزول کردیا تو گویا ہم نے عبدالملک کی بھی خلع خلافت کی۔ چنانچہ فارس میں ایک بار پھر عبدالرحمٰن کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ یہ بیعت ثانی عبدالملک اور اس کے

حکام کی معزولی، کتاب وسنت کی پاسداری اور اہل ضلالت کے خلاف جہاد پر کی جانے والی بیعت تھی۔۵ے

عبدالرحمن ابن محمد کی آمد کا سن کر حجاج بن یوسف اپنی فوج کے ساتھ بصرہ سے نکلا اور اہواز کے قریب تستر میں پڑاؤ کیا۔ ذی الحجہ ۸۱ھ/۷۰۱ء میں دونوں فوجوں کے درمیان جنگ ہوئی جس میں حجاج کو زبردست شکست ہوئی، کوفہ پر ابن اشعث کا قبضہ ہوگیا اور وہ بصرہ میں داخل ہوا۔ اہل بصرہ حجاج سے خوش نہیں تھے لہٰذا انہوں نے عبدالرحمن کی بیعت کرنے میں دیر نہیں کی۔ یہ بیعت حجاج سے جنگ اور عبدالملک کی خلافت سے خلع حاصل کرنے پر کی گئی۔

طبری نے اہل بصرہ کا عبدالرحمن سے جا ملنے کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ حجاج کے عاملوں نے جو مقبوضات پر متعین تھے، حجاج کو لکھا کہ مالگزاری بہت کم ہوگئی ہے اور ذمی مسلمان ہوکر شہروں میں جا بستے ہیں۔ اس پر حجاج نے بصرہ اور دوسرے مقامات پر حکم دے دیا کہ جس شخص کا اصل وطن دیہات میں ہے وہ دیہات میں واپس چلا جائے۔ یہ موالی جماعت کی شکل میں آہ وبکا کرتے ہوئے نکلے اور شہر کے باہر پڑاؤ ڈال کر ٹھہر گئے۔ یہ "یا محمداہ...... یا محمداہ" پکارتے جاتے تھے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں جائے۔ بصرہ کے قراء اور دوسرے نیک لوگ ان کی حالت زار کو دیکھ کر روتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد جب ابن اشعث نے حجاج کے خلاف خروج کیا تو اہل بصرہ نے خصوصاً قراء نے اس کا ساتھ دیا۔۶ے اسی طرح جب عبدالرحمن کوفہ میں داخل ہوا تو اہل کوفہ نے بھی اس کا استقبال کیا اور اس کی بیعت کرلی، کوفہ کے جو لوگ ابن اشعث سے مل گئے، ان میں موالی بھی تھے۔ حجاج بن یوسف کے خلاف موالی کا یہ پہلا بڑا ردعمل تھا۔ مختار ثقفی کے زیر سایہ حکومت سے ٹکر لینے کے کم وبیش پندرہ سال بعد موالی پھر سیاسی طور پر متحرک ہوئے۔ پندرہ سالہ خاموشی کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی تھی کہ مصعب ابن زبیر نے ہزاروں موالی کو بغاوت کے جرم میں قتل کرایا تھا، جس سے ان کی کمر ہمت ٹوٹ گئی۔ دوسری وجہ حجاج بن یوسف کی سخت حکمت عملی تھی جس نے انہیں سر اٹھانے کا موقع فراہم نہ کیا۔

تیسری وجہ عبدالملک بن مروان اور حجاج کے وہ انتظامی اقدامات تھے، جس کی وجہ سے ''عربیت'' کو خاصا فروغ ہوا مثلاً عربی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دے کر تمام دفاتر کو مقامی زبانوں سے عربی میں منتقل کرنا ے بے نیز عربی سکے کا اجراء اور مملکت میں چلنے والے ایرانی اور رومی سکوں کا خاتمہ، اس وقت تک خراج کے دیوان مقامی زبانوں میں ہوتے تھے مثلاً عراق اور ایران کا دیوان فارسی زبان میں، شامی دیوان یونانی زبان میں، مصری دیوان قبطی اور یونانی زبان میں نیز حساب کتاب رکھنے میں بھی سابق طریقوں کا اتباع کیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اکثر مقامی مہریں اور تاریخیں عام استعمال ہوتی تھیں۔ عبدالملک نے عربی علامات اور قواعد کو مروج کیا اور سابق نظام تقویم کو اسلامی قمری سال کے مطابق بنادیا۔ سرکاری زبان بننے سے قبل ان مفتوحہ علاقوں میں عربی کبھی کبھار ہی استعمال ہوتی تھی۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ذمیوں (اور موالی) کو جو ان محکموں میں کثرت کے ساتھ کاتب مقرر تھے، ہٹانا پڑا۔ تاہم جہشیاری، کندی اور بلاذری کا بیان ہے کہ موالی برابر ملازمت میں لیے جاتے رہے۔ ۸ے تاہم یہ امکان خارج از بحث نہیں ہوسکتا کہ عبدالملک اور حجاج کے ان اقدامات نے موالی میں عدم تحفظ کے احساس کو بڑھادیا ہو اور انہوں نے ایک بار پھر اپنی سابقہ شان و شوکت اور اقتدار کی بحالی کے لئے دمشق میں کے خلاف اٹھنے والی عراقی تحریک کا ساتھ دیا ہو۔

عبدالرحمٰن کا حجاج سے مہینوں جنگی سلسلہ رہا، ان جنگوں میں بیشتر عراقی فوجوں کو کامیابی حاصل ہوتی رہی۔ عبدالرحمٰن کی حجاج کے خلاف کامیابیاں دیکھتے ہوئے، وہ لوگ جو اب تک خاموش تھے، وہ بھی ابن اشعث سے آملے۔ چنانچہ تمام اہل کوفہ اور اہل بصرہ جس میں ان کے قرا بھی شامل تھے اور وہ فوجیں جو مختلف چوکیوں اور سرحدی علاقوں میں متعین تھیں، عبدالرحمٰن کے پاس یکجا ہوگئیں۔ وہ سب کے سب حجاج سے جنگ کرنے پر تلے ہوئے تھے اور اس مخالفت کی وجہ، حجاج کی ذات تھی، جس سے یہ تمام لوگ بغض و عداوت رکھتے تھے۔ صرف اس فوج کی تعداد جسے باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی، ایک لاکھ تھی اور اسی قدر موالی ان کے ہمراہ تھے۔ ۹ے عراق کا مولائے اعظم (سب سے بڑا اور معزز مولی) فیروز حصین تھا، جو مختلف

صوبوں اور شہروں کی حکومتوں پر فائز رہا تھا، وہ بھی عبدالرحمٰن کے ساتھ تھا۔ ۸۰ دلچسپ بات یہ رہی کہ عبدالرحمٰن کا باپ محمد ابن اشعث، مختار ثقفی کے خروج کے زمانے میں انہی موالی کے طبقے کے خلاف مصعب ابن زبیر سے فریاد کرتا نظر آتا تھا۔

بہر حال حجاج بن یوسف نے ابتدائی ناکامیوں کے بعد سنبھالا لیا اور دیر جماجم ۸۱ کے انتہائی فیصلہ کن معرکے ۸۳ھ/۷۰۲ء کے بعد صورت حال اس طرح پلٹی کہ عبدالرحمٰن کی فوجوں کو مسلسل شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ حجاج کا عراق پر قبضہ بحال ہوگیا اور ابن اشعث اپنے حامیوں کے ساتھ رتبیل کے پاس پناہ لینے پر مجبور ہوگیا، جہاں بالآخر اسے قتل کر دیا گیا یا اس نے خودکشی کر لی۔ اس کے بعد اہل عراق کی حجاج کے ہاتھوں شامت آگئی۔ بقول ابن خلدون "حجاج نے عبدالرحمٰن ابن اشعث کی مہم سے فارغ ہوکر اہل عراق کو پامال کیا۔" ۸۲

حجاج نے ہر اس عنصر کا، جو اموی حکومت کے خلاف تھا، زور توڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، ان کو سیاسی اور فوجی مناصب سے محروم کیا، موالی پر جزیہ عائد کیا، ان کی مرکزیت کو ختم کرنے کے لئے انہیں مملکت کے دور دراز علاقوں میں تتر بتر کر دیا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس نے اہل عراق کو بری طرح دبایا۔ اس میں عرب و موالی کی کوئی تخصیص نہ تھی، اس کے برخلاف شامیوں کو منظور نظر بنایا اور اہل عراق پر اعتماد کرنے کے بجائے شامی فوجوں سے قوت حاصل کرتا رہا اور ان کو اپنے سے نزدیک رکھنے کے لئے شہر واسط کی بنیاد ڈالی۔ ۸۳ یہ کام ۸۳ھ میں ابن اشعث کی بغاوت کو کچلنے کے فوراً بعد کیا گیا۔

سعید احمد اپنی کتاب مسلمانوں کا عروج و زوال میں لکھتے ہیں:

"اموی حکمرانوں میں قبائلی عصبیت کے علاوہ عربیت کا زعم بھی تھا۔ موالی بنوامیہ کے حکمرانوں کی نگاہوں میں حقیر تھے اور ان پر بعض اوقات ناروا مظالم کیے جاتے تھے، حجاج کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے موالی کی ایک کثیر جماعت کو جلاوطن کر کے اطراف و اکناف کے دیہاتوں میں محض اس لئے منتشر کر دیا تھا کہ یہ لوگ عربوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کے باعث فصیح و بلیغ عربی بولنے

پر قادر نہ ہوسکیں، اسی بے جا اور غیر اسلامی تشدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ عجمیوں نے حکومت کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کردیں اور یہیں سے شعوبیت کا آغاز ہوا۔'' ۸۴ے

اگر ہم سماجی رویوں کا یکطرفہ مطالعہ کریں گے تو اسی قسم کے بیانات سامنے آئیں گے۔ یہ بات تو درست مانی جاسکتی ہے کہ اموی حکمرانوں میں قبائلی عصبیت کے علاوہ عربیت کا زعم بھی تھا، لیکن مؤرخ کو یہاں موالی کے سماجی رویہ کا بھی جائزہ لینا چاہیے تھا۔ عموماً مورخین نے ایسا نہ کر کے تحقیق کا حق ادا نہیں کیا۔

پورے اموی دور میں ہم کو دو طرح کے سماجی رویے ملتے ہیں۔ ایک رویہ سماجی مساوات کا تھا اور دوسرا رویہ عصبیت و زعم کا۔ پہلے رویہ کا مظاہرہ کرنے والے عرب بھی تھے اور موالی بھی، اسی طرح دوسرے رویے کا مظاہرہ کرنے والے بھی عرب بھی تھے اور موالی بھی۔ وہ عرب و موالی جنہوں نے اسلام کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ قبول کیا تھا، سماجی مساوات اور عدل اجتماعی کے قائل تھے، دوسری طرف وہ عرب و موالی تھے جنہوں نے اسلام کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ قبول ہی نہیں کیا تھا، ان کا سماجی رویہ عصبیت پر مبنی تھا۔ یہ دونوں رویے ہم کو عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں بھی ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں۔ عموماً اس عہد میں سیاسی حلقوں، قبائلی اشراف کے حلقوں اور دیہاتی حلقوں میں موالی کو حقیر سمجھا جاتا تھا۔ یہ لوگ موالی کو ان کی کنیت سے نہیں پکارتے تھے، بلکہ انہیں ان کے ناموں اور عرفیت سے پکارتے تھے۔ باندیوں کے بطن سے پیدا ہونے والوں کو ''ہجین'' کہا جاتا تھا۔ ۸۵ے ان کے ساتھ ایک صف میں نہیں چلتے تھے اور انہیں اپنے کھانوں میں شریک نہیں کرتے تھے، اگر کسی موالی کو اپنے ساتھ اس کے علم وفضل یا عمر کی وجہ سے کھانے پر بٹھا بھی لیتے تو اسے دسترخوان پر ایک کونے میں جگہ دیتے تاکہ دیکھنے والے پر یہ واضح ہوجائے کہ یہ عربوں میں سے نہیں ہے۔ جنازوں پر بھی کسی موالی کو نماز پڑھانے کے لئے آگے نہ کیا جاتا۔ الا یہ کہ کوئی عرب لڑکا تک جنازہ پڑھانے کے لئے موجود نہ ہو۔ ۸۶ے

اسی طرح موالی، خصوصاً ایرانی موالی کے طبقۂ اشراف میں عربوں کو حقیر وحشی اور اجڈ سمجھا جاتا تھا۔ انہیں سخت تعجب تھا کہ عرب ان پر کس طرح غالب آ گئے۔ وہ برابر اپنی قدیم بزرگی اور پرانی عزت پر عربوں کے خلاف فخر کرتے رہتے تھے۔ عربوں کی بعض صفات مثلاً سخاوت، مہمان نوازی اور بہادری کو تضحیک کا نشانہ بناتے تھے۔ یہ رویہ عموماً ایران کے طبقہ اشراف کا تھا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ہم ایرانی ایک عظیم الشان تہذیب کے حامل ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ملکوں کا انتظام کس طرح چلایا جاتا ہے۔ جب ہماری حکومت تھی تو ہمیں کبھی بھی عربوں کی ضرورت نہ پڑی، لیکن جب عربوں کی حکومت قائم ہوئی تو وہ ہماری اعانت و تعاون کے بغیر اپنے ملکی معاملات نہیں چلا سکتے۔ چنانچہ عبدالملک بن مروان کے عہد میں جب عربی سکے ڈھالے گئے اور دفاتر کو فارسی، قبطی اور دیگر زبانوں سے عربی میں منتقل کیا گیا تو ان عجمیوں میں شدید مایوسی اور بے چینی پھیل گئی۔

اس موقع پر اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اہل عجم یا ایرانی موالی کا نسلی غرور، عربوں کی عربیت یا عصبیت کے ردعمل کے طور پر سامنے نہیں آیا تھا بلکہ ان میں یہ نسلی فخر و غرور بہت پہلے سے موجود تھا، خواہ عرب ہوں یا ترک یا دیلم، وہ سب کو حقیر و وحشی سمجھتے تھے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ ایرانیوں کا سماجی طور طریقہ قبائلی نہیں تھا۔ لہٰذا ان میں قبائلی عصبیت بھی نہیں تھی۔ ان میں جو عصبیت تھی وہ قومی اور ملکی تھی کیونکہ وہ عرصۂ دراز سے خانہ بدوشی کی قبائلی زندگی ترک کر کے مدنیت و حضارت کے عادی ہو چکے تھے۔ ایک حکومت اور ایک اکثریتی مذہب نے ان کو واقعتاً ایک قوم بنا دیا تھا۔

دوسرا سماجی رویہ جو مساوات پر مبنی تھا، ہمیں زیادہ تر دینی اور علمی حلقوں میں نظر آتا ہے، جہاں کسی جنس یا ذات کے لئے کوئی تعصب موجود نہیں تھا، جہاں پورے طور پر اسلامی مساوات کارفرما تھی۔ عالم آدمی کی عزت کی جاتی تھی خواہ وہ غلام ہو، موالی ہو یا صریح عرب۔ چنانچہ اگر ایک طرف امام زہری، مسروق بن الاجدع، قاضی شریح، سعید ابن مسیب اور قتادہ کو تابعین کے سادات میں شمار کیا جاتا تھا اور یہ سارے کے سارے عرب تھے، وہیں امام حسن

بصری، محمد ابن سیرین، سعید ابن جبیر، عطاء ابن یسار، ربیعۃ الرائی، ابن جریج بھی تابعین کے طبقہ اول میں شمار ہوتے تھے، حالانکہ یہ سب آزاد کردہ غلام تھے، پورا اسلامی معاشرہ ان کا احترام کرتا تھا۔ امام حسن بصری خلفائے بنوامیہ پر تنقیدیں کیا کرتے تھے۔ یزید بن مہلب کو برملا برا کہتے تھے۔ وہ اعلانیہ اس رائے کا اظہار کرتے تھے کہ یزید اور اس کے ساتھی اور بنو امیہ گمراہ ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میری آرزو تو یہ ہے کہ زمین نے یزید بن معاویہ اور یزید بن مہلب کو ایک ساتھ ہی نگل لیا ہوتا۔ انہی حسن بصری کا جب انتقال ہوا تو شہر کے تمام لوگ ان کے جنازے کے پیچھے چل دیئے حتیٰ کہ مسجد میں نماز عصر پڑھنے کے لئے کوئی بھی نہ رہا۔

اس دور میں دونوں رویوں کے مطالعے کے لئے چند واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں۔

مثلاً علی بن حسینؓ بن علیؓ (زین العابدین) نے اپنی ماں کا، جو ایک سندھی ام ولد تھیں، اور جن کا نام سلامہ یا غزالہ تھا، اپنے موالی زبید سے نکاح کردیا، اور اپنی ایک باندی (جاریہ) کو آزاد کر کے اسے اپنے حبالۂ عقد میں لے لیا تو عبدالملک بن مروان نے ایک طنزیہ خط حضرت علی ابن حسینؓ کو لکھا تھا کہ قریش کی آزاد عورتیں کیا ختم ہوگئی ہیں؟ جواباً علی ابن حسینؓ نے عبدالملک کو لکھا:

"......اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعے کم حیثیت چیز کو بلند مقام دیا ہے اور عیب دار چیز کو مکمل کیا ہے اور قابل ملامت چیز کو عزت بخشی ہے۔ لہٰذا کسی مسلمان کے لئے یہ کوئی شرم اور عار کی بات نہیں اور یہی رسول اللہ ﷺ ہیں جنہوں نے اپنی کنیز ۸۷ اور اپنے موالی کی بیوی ۸۸ سے شادی کی تھی۔" ۸۹

اس واقعے سے ان دونوں عرب رویوں کا پتہ چل جاتا ہے، جو اموی عہد میں موالی کے سلسلے میں چل رہے تھے۔ ایک رویہ وہ تھا جس کا نمائندہ عبدالملک بن مروان، خلیفہ وقت تھا اور دوسرا نمائندہ رویہ علی بن حسین کا تھا۔ سیاسی حلقوں اور قبائلی اشراف کے حلقوں میں موالی کو حقیر سمجھا جاتا تھا، اسی رویے کا مظاہرہ عبدالملک بن مروان نے کیا جبکہ علمی اور دینی حلقوں میں ان موالی کی وہی عزت تھی جو کسی عرب کی ہوتی تھی۔ یہی علی بن حسین تھے کہ کسے

سے آتے ہوئے عموماً اپنی سواری پر اسلم موئی عمر کو بٹھا لیتے اور ملامت کرنے والے جب ملامت کرتے کہ آپ قریش کو چھوڑ کر بنی عدی کے ایک غلام کو اپنے ہمراہ بٹھاتے ہیں تو وہ ملامت کی چنداں پرواہ نہ کرتے۔ ۹۰

اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ ہمارے تجزیہ کو درست ثابت کرتا ہے کہ بنی العنبر میں سے ایک اعرابی، سوّار القاضی کے پاس آیا اور کہا میرا باپ مر گیا ہے اور مجھے میرے ایک بھائی کے ساتھ چھوڑ گیا ہے۔ پھر اس نے دو خط کھینچے، پھر کہا اور ایک ہجین، پھر دوسری طرف ایک خط کھینچا اور کہا پھر مال کو کیسے تقسیم کیا جائے۔ تو سوّار القاضی نے اس سے پوچھا کیا تم تینوں کے علاوہ بھی کوئی وارث ہے؟ اس نے جواباً کہا، نہیں۔ سوّار القاضی نے کہا کہ پھر مال تم تینوں میں تقسیم ہوگا۔ اس نے کہا میرا خیال ہے کہ آپ میری بات نہیں سمجھے، اس نے مجھے میرے بھائی کو اور ایک ہجین کو چھوڑا ہے، تو یہ ہجین میرے اور میرے بھائی کے برابر حصہ کیسے حاصل کر سکتا ہے؟ قاضی نے کہا ''کیوں نہیں؟'' تو اعرابی کو غصہ آ گیا اور کہنے لگا ''خدا کی قسم! معلوم ہوتا ہے کہ صحرائے عرب (دہنا) میں تمہارے خالائیں بہت ہی کم ہیں۔'' سوّار نے اطمینان سے جواب دیا ''اللہ کے سامنے مجھے اس بات سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔'' ۹۱

اس واقعے میں بھی ہمیں دو متضاد رویے ایک ساتھ نظر آ رہے ہیں: ایک اعرابی، جو نخوت و تکبر کا مارا ہوا ہے اور جاہلی عصبیت جو اس میں موجود ہے، اس کی بنا پر اپنے ایک بھائی کو جس کی ماں آزاد عورت نہیں ہے، اپنے ہم پلہ سمجھتا ہی نہیں اور باوجود اس کے کہ شریعت میں وہ دونوں یکساں وارث ہیں، اسے اس میں تامل ہے۔ اس سے اس سماجی رویے کا پتہ چلتا ہے جو بعض عربوں نے موالی کے لئے قائم کر رکھا تھا مگر اسی واقعے سے اس دوسرے سماجی رویے کا بھی پتہ چلتا ہے، جو قاضی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے، ان کے نزدیک موالی کا وہی سماجی اور قانونی مرتبہ ہے جو حر یا آزاد کا ہو سکتا ہے۔ قاضی ''ہجین'' کو وہی معاشرتی مقام دینا چاہتا ہے جو قرآن عطا کرتا ہے۔

چنانچہ اسی اموی دور میں ایک طرف وہ لوگ تھے جو باندی زادوں کو ''ہجین'' کہتے

اور انہیں کمتر سمجھتے تھے تو اسی معاشرے میں یہ منظر بھی دیکھا جاسکتا تھا کہ طواف کعبہ کے دوران، خلقت ایک باندی زادے (علی ابن الحسین بن علی بن ابو طالب) پر ٹوٹی پڑ رہی ہے جبکہ خلیفۂ وقت کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہے اور اس کے پاس صرف اس کے سرکاری اہل کاروں کا رش ہے۔ چنانچہ اصمعی کا یہ بیان درست ہے کہ مدینے کے زیادہ تر لوگ کنیزوں کو پسند نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ ان کے یہاں علی ابن الحسین ۹۲، قاسم بن محمد ۹۳ اور سالم بن عبداللہ ۹۴ پیدا ہوئے اور انہوں نے اہل مدینہ سے فقہ، علم اور پرہیزگاری میں فوقیت حاصل کرلی تو لوگ باندیوں کی طرف مائل ہونے لگے۔

احمد امین المصری کہتے ہیں:

''......تاریخ و سیر کے مختلف بیانات و واقعات کی تشریح سے کبھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرب لوگ موالی کو بڑی حقارت سے دیکھتے تھے اور کبھی یہ نظر آتا ہے کہ وہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مطالعہ کرنے والے ابتدائی مرحلے میں یہ سمجھتے ہیں کہ ان بیانات اور واقعات میں تضاد ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ سیاسی حلقوں، قبائلی اشراف کے حلقوں اور دیہاتی حلقوں میں موالی کو حقیر سمجھا جاتا تھا لیکن دینی اور علمی حلقوں میں کسی جنس یا کسی خون کے لئے کوئی تعصب موجود نہیں تھا۔ وہاں صرف دین اور علم کے لئے تعصب ہوتا تھا۔ یہ دونوں چیزیں جہاں ملتی تھیں، ان کی پوری پوری قدر کی جاتی تھی۔'' ۹۵

اسلامی مملکت میں لونڈیوں، غلاموں کے علاوہ موالی کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا، کیونکہ ولید بن عبدالملک کے دور میں فتوحات کی کثرت نے ایک طرف مملکت کے حدود وسیع کیے، تو دوسری طرف ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں غیر عربوں کو اسلامی ریاست کا باشندہ بنا دیا۔ دراصل پہلی صدی ہجری، اسلام کی طاقت اور توسیع کی صدی تھی۔ جس طرح فتوحات کی ایک لہر حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اٹھی تھی، اسی طرح فتوحات کی دوسری لہر حضرت معاویہ کے دور میں اور تیسری عبدالملک اور ولید بن عبدالملک (۸۶ھ/

۷۰۵ء تا ۹۶ھ/ ۷۱۵ء) کے زمانے میں اٹھی۔

ان فتوحات کے نتیجے میں بے شمار لونڈی غلام اور بے حد و حساب مال غنیمت ہاتھ آیا۔ ان فتوحات کے نتیجے میں صرف یہی نہیں ہوا کہ مملکت کو وسعت ملی اور بیت المال معمور ہو گئے بلکہ معاشرہ ہزاروں لونڈیوں، غلاموں سے بھر گیا، جس نے ایک نئی تہذیب و ثقافت کا راستہ کھولا۔ ساتھ ہی بہت سے سماجی مسائل نے بھی جگہ بنانی شروع کر دی۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ صدی عرب و عجم کے مابین اتصال و امتزاج کی صدی بھی تھی اور کشمکش و تصادم کی صدی بھی۔

موالی، عبدالملک بن مروان اور ولید بن عبدالملک اور ان کے وفادار گورنر حجاج بن یوسف کے زمانے میں جس حکومتی ردعمل کی زد میں تھے اس سے انہیں نویں اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے دور خلافت میں نکلنا نصیب ہو سکا۔ پہلی صدی ہجری کا اختتامی سال اور دوسری صدی ہجری کا ابتدائی سال، حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دور خلافت ہے۔ ۹۶ خلیفہ کی حیثیت سے ان کا مقام قدرے منفرد ہے کیونکہ وہ اپنے اموی پیش رووں اور اپنے جانشینوں سے مختلف تھے۔ ان کی طبیعت میں خوف خدا اور تقویٰ غالب تھا حالانکہ خلیفہ بننے سے قبل ان کی زندگی دوسرے اموی شہزادوں کے مقابلے میں کچھ کم عشرت پسندانہ نہ تھی، تاہم حصول خلافت کے بعد انہوں نے یک لخت وہ تمام شاہانہ طور طریقے ختم کر دیے جو ان کے پیش رووں نے اختیار کر رکھے تھے اور وہ طرز حکومت اختیار کیا جو خلفائے راشدین کے طرز سے مشابہ تھا۔ آپ کے ابتدائی خطبے میں بھی وہی رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ انہوں نے کہا:

> ''درحقیقت اس امت میں کوئی اختلاف اپنے رب اور اپنے نبی ﷺ اور اپنے دین کی کتاب کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ دینار و درہم کے معاملے میں ہے، خدا کی قسم میں کسی کو نہ باطل طریقے سے دوں گا، نہ کسی کا جائز حق روکوں گا۔ لوگو! جو اللہ کی اطاعت کرے، اس کی اطاعت واجب ہے اور جو اللہ کی اطاعت نہ کرے اس کے لئے کوئی اطاعت نہیں۔ جب تک میں اللہ کا مطیع

رہوں میری اطاعت کرو اور جب میں اللہ کا نافرمان ہو جاؤں تو میری اطاعت
ہرگز تم پر لازم نہیں ہے۔" ۹۷

اس کے بعد اپنے مختصر دور اقتدار میں وہ اسی پالیسی پر سختی سے عمل پیرا رہے۔ انہوں نے حجاج کے مقرر کردہ ان تمام حاکموں کو ان کے عہدوں سے برطرف کر دیا جو ظالم و جابر تھے۔ ان کی جگہ حتیٰ المقدور دیانت اور متقی حکام مقرر کیے۔ ۹۸ اپنے حکام کو سخت تاکیدی احکام بھیجے کہ کسی مسلمان یا ذمی کو قانون کے خلاف کوڑے نہ لگائے جائیں اور ان کے ساتھ رواداری، عدل و انصاف کا معاملہ کیا جائے۔ ۹۹

عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عمال کو وضاحتاً لکھ بھیجا تھا کہ اہل الذمہ میں سے جو لوگ مسلمان ہو جائیں ان کا جزیہ معاف کر دیں۔ ۱۰۰ اس قسم کے احکامات و خطوط سے کم از کم یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز سے پہلے بعض اموی خلفاء یا ان کے بعض عمال نے مالی بے اعتدالیاں کی تھیں، جس کے سد باب کی حضرت عمر نے شدید ضرورت محسوس کی، ان مالی بدعنوانیوں کا نشانہ صرف موالی ہی نہیں بنے بلکہ ذمی اور عرب بھی بنے تھے، جیسا کہ ہم حجاج کے دور میں لکھ آئے ہیں کہ اگر ایک طرف موالی پر جزیہ عائد کیا گیا تو وہیں یمن کے عربوں پر بھی نئے ٹیکس لگائے گئے تھے چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اضافے کو بھی منسوخ کر دیا جو یمن کے ایک سابق حاکم حجاج کے بھائی محمد بن یوسف نے عشر میں کر دیا تھا۔ ۱۰۱

حیرہ کے یہودی، عیسائی اور مجوسی جن سے جزیہ کی رقم وصول ہوتی تھی، جب اسلام لائے تو عبدالحمید ابن عبدالرحمٰن نے ان سے جزیہ وصول کرنا چاہا اور عمر بن عبدالعزیز سے اس کی اجازت مانگی۔ ان کا جواب تھا "اللہ نے محمد کو داعی اسلام بنا کر بھیجا تھا، نہ کہ محصل خراج، ان مذاہب کے لوگوں میں جو اسلام لائیں ان کے مال میں صرف صدقہ ہے، جزیہ نہیں۔" ۱۰۲

حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں مصر کے محاصل کی مقدار ایک کروڑ بیس لاکھ تھی، لیکن مصر کے لوگ اس کثرت سے مسلمان ہوئے کہ چند سال کے اندر یعنی امیر معاویہؓ کے عہد خلافت تک آتے آتے یہ آمدنی صرف پچاس لاکھ رہ گئی اور عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں یہ

آمدنی اور کم ہوگئی یہاں تک کہ مصر کے عامل حیان بن شریح نے یہ تجویز پیش کی کہ جو لوگ مسلمان ہوں ان کو جزیہ ادا کرنے سے مستثنیٰ نہ کیا جائے، لیکن عمر ثانی نے اس تجویز کو سختی سے رد کر دیا اور لکھا کہ مسلمان ہونے والوں پر سے جزیہ کو موقوف کر دو، کیونکہ خدا نے محمد ﷺ کو ہادی بنا کر بھیجا تھا محصل خراج بنا کر نہیں۔ ۱۰۳

جزیہ کی وصولی کے بارے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز اس قدر محتاط تھے کہ اگر کوئی ذمی جزیہ کی سالانہ ادائگی سے ایک دن پہلے اپنے دین (مذہب) کو خیر باد کہتا، یا عین اس وقت جب اس کی ادا کردہ رقم یا اشیا ترازو میں تل رہی ہوں، اسلام قبول کر لیتا تو اس جزیہ کی رقم اس نو مسلم کو واپس کر دی جاتی تھی۔ ۱۰۴

انہوں نے جراح بن عبداللہ الحکمی کو جو ان کے عامل خراسان تھے، لکھا کہ جزیہ ادا کرنے والوں کو اسلام کی دعوت دیں۔ اگر وہ اسلام لے آئیں تو ان کا اسلام قبول کریں اور ان پر سے جزیہ موقوف کر دیں، اسلام لانے کے بعد ان کے وہی حقوق و فرائض ہوں گے جو دوسرے مسلمانوں کے ہیں۔ ۱۰۵ اس طرح صرف خراسان میں تقریباً چار ہزار لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ جراح نے سوچا کہ یہ لوگ جزیہ سے بچنے کے لئے اسلام لا رہے ہیں لہذا ان لوگوں کا ختنہ کروانے سے امتحان لے اور اس ضمن میں حضرت عمر بن عبدالعزیز سے اجازت مانگی۔ انہوں نے سختی سے منع کرتے ہوئے لکھا کہ "اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو داعی مبعوث کیا تھا نہ کہ خاتن۔" ۱۰۶

اسی جراح بن عبداللہ الحکمی کو ایک موالی کی شکایت پر حضرت عمر نے خراسان کی گورنری سے معزول کر دیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ جراح نے ایک وفد عمر بن عبدالعزیز کے پاس بھیجا۔ اس وفد میں ایک موالی بھی تھا۔ جس کا نام صالح بن طریق اور کنیت ابوالصیداء تھی۔ اس نے حضرت عمر سے جراح کی شکایت ان الفاظ میں کی:

"امیر المومنین! خیال کرنے کی بات ہے کہ بیس ہزار موالی بغیر تنخواہ اور روزینے کے جہاد کر رہے ہیں اور اسی قدر ذمی مسلمان ہو چکے ہیں مگر پھر بھی ان

سے اسی سابقہ مقدار کے مطابق مالگزاری لی جا رہی ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ہمارے عامل صاحب سخت متعصب اور ظالم ہیں۔ ہمارے ہی ملک میں برسر منبر کہتے ہیں کہ جب میں آیا تھا تب بہت رحمدل تھا مگر اب سخت گیر ہوں اور بخدا میری قوم کا ایک فرد تمہارے سو آدمیوں سے زیادہ میرے نزدیک وقیع ہے۔ اس کے ظلم و تکبر کا حال یہ ہے کہ اس کے کرتے کی آستین نصف کرتے تک پہنچتی ہے۔ یہ بھی ظلم میں حجاج سے کم نہیں، بلکہ اس کا جانشین ہے۔'' ۱۰۷

خراسان کے اس موالی کی شکایت پر ایک طرف تو حضرت عمر نے خراسان کے ان موالی کے وظائف مقرر کیے جنہوں نے کفار سے جنگ کی تھی اور انہیں دیگر مسلمان سپاہیوں کی طرح مالگزاری کے ادا کرنے سے بھی مستثنیٰ کر دیا تو دوسری طرف انہوں نے جراح کے خلاف تحقیقات شروع کر دیں اور جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ جراح واقعی ظالم ہے تو اسے خراسان کی گورنری سے معزول کر دیا اور اس کی جگہ عبدالرحمٰن ابن نعیم کو صیغۂ جنگ پر اور عبدالرحمٰن قشیری کو صیغۂ خراج کا افسر مقرر کیا۔ ۱۰۸

موالی کے سلسلے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز خلفائے راشدین کے طریقے پر تھے چنانچہ ہمیں ان کی زندگی میں بہت سے واقعات ایسے ملتے ہیں جو عہد خلافت راشدہ کا پرتو معلوم ہوتے ہیں، مثلاً سیوطی کی تاریخ الخلفاء میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ آپ کے پاس اسامہؓ بن زیدؓ (موالی رسول اللہؐ) کی بیٹی آئیں، گو آپ خلیفہ وقت تھے، مگر آپ نے تعظیماً اٹھ کر ان کا استقبال کیا، ان کو اپنی نشست پر بٹھایا اور خود ان کے سامنے بیٹھے اور جو کچھ انہوں نے طلب کیا آپ نے انہیں عطا کیا۔ ۱۰۹

اسی طرح جب رزیق موالی علی ان کی خدمت میں آیا اور شکایت کی کہ میں مدینے کا رہنے والا ہوں، قرآن اور فرائض مجھے یاد ہیں، لیکن بیت المال کے رجسٹر میں میرا نام درج نہیں، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مزاحم کو ہدایت کی کہ رزیق کا وظیفہ مقرر کیا جائے۔ بلکہ ولایت علی کی بنا پر اسے مقررہ سے زائد رقم وظیفے کے طور پر ملنے لگی۔ ۱۱۰

عمر بن عبدالعزیز اپنے موالی مزاحم [۱۱۱] کو بھی بہت مانتے تھے اور ان کے مشوروں پر عمل کرتے تھے۔ حضرت عمر کے ایک اور موالی سہل ان کے بچوں کے اتالیق تھے۔ عدی بن ارطاۃ جو شرعی امور میں حضرت عمر بن عبدالعزیز سے مشورہ کیا کرتے تھے، حضرت عمر نے انہیں حضرت حسن بصری سے (جن کے والد یسار، زید بن ثابت کے موالی تھے اور جن کی والدہ خیرہ ام المومنین حضرت ام سلمہ کی باندی تھیں) مشورہ طلب کرنے کے لئے لکھا:

''خدا کی قسم حسن بصری تمہارے لئے کافی ہیں۔ جب یہ خط پہنچے تو میرے لئے، اپنے لئے اور عام مسلمانوں کے لئے انہی سے استفسار کیا کرو، اللہ تعالیٰ حسن بصری پر رحمت فرمائے کہ وہ اسلام میں ایک بڑے درجے کے شخص ہیں اور ان کو میرا یہ خط پڑھ کر نہ سنانا۔'' [۱۱۲]

خود عمر بن عبدالعزیز براہ راست بھی جناب حسن بصری سے مشورے طلب کرتے رہتے تھے اور وہ انہیں عمدہ نصیحتیں کرتے تھے۔ ان کے عہد میں ہمیں وہی خلافت راشدہ والی مساوات اور رواداری نظر آتی ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے حضرت عبداللہ بن عباس کے غلام کو باریابی کا موقع دیا، درآں حالیکہ بنو امیہ کے بہت سے افراد اجازت کے منتظر دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہشام بن عبدالملک نے اس موقع پر تلخ ہو کر کہا ''عمر بن عبدالعزیز کو سب کچھ کر کے اب بھی تسلی نہیں ہوئی کہ ابن عباس کے ایک غلام کو موقع دیتے ہیں کہ ہماری گردنیں پھاند کے چلا جائے۔'' [۱۱۳]

آپ عمال کی تقرری کے وقت بھی عرب و موالی کا امتیاز نہیں رکھتے تھے بلکہ آپ کا معیار دیانت اور قابلیت پر تھا۔ چنانچہ جن تین حضرات کو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مصر میں فتویٰ دینے کا اختیار دیا تھا ان میں ایک جعفر ابن ربیعہ تھے، دوسرے یزید بن ابی حبیب اور تیسرے عبداللہ ابن ابی جعفر۔ ان میں سے اول الذکر عرب تھے جبکہ باقی دونوں اصحاب آزاد کردہ غلام (موالی) تھے۔ عربوں نے اس بات کی عمر بن عبدالعزیز سے شکایت کی کہ فقہا میں سے صرف ایک عرب ہے تو عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا ''اگر موالی علم کی چوٹیوں پر چڑھ

جاتے ہیں اور تم لوگ نہیں چڑھتے تو اس میں میری کیا خطا ہے۔"

آپ نے اسماعیل بن عبداللہ کو، جو کہ بنی مخزوم کے موالی تھے، افریقہ کا حاکم بنایا۔ ۱۱۴ میمون بن مہران موالی بنی نصر بن معاویہ کو الجزیرہ پر افسر خراج مقرر کیا۔ نیز وہاں کے منصب قضاء پر بھی متعین کیا تھا۔ ۱۱۵ ایاس بن معاویہ ۱۱۶ کو بصرے کا قاضی مقرر کیا۔ ابوالزناد ۱۱۷ کو عراق کا افسر خراج مقرر کیا تھا۔

اگر حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دور خلافت طویل ہوتا تو ان کے حکام وعمال میں موالی کی تعداد بھی زیادہ ہوتی۔ جس طرح حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے انتقال کے وقت سالم موالی ابوحذیفہ کے بارے میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو انہیں خلیفہ بناتے، اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز نے قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیقؓ، جو کہ ایک ام ولد، سودہ کے بیٹے تھے، ان کے بارے میں اسی خواہش کا اظہار خیال کیا کہ کاش قاسم خلافت کے لئے ہوتے۔ ۱۱۸

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے عطایا اور وظائف میں عرب اور آزاد کردہ غلاموں سب کو برابر کردیا تھا۔ جو لوگ تفوق اور امتیاز کے خوگر تھے انہیں اس مساویانہ تقسیم سے سخت کوفت ہوتی مگر عمر ثانی کے دور میں عرب وموالی وظائف، اعانت اور عطا میں مساوی رہے۔ اسماعیل بن سالم کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ہرات میں عمر بن عبدالعزیز کا خط اُس صدقے کے سلسلہ میں آیا جس کا انہوں نے حکم دیا تھا۔ اس میں لکھا تھا:

ان اجعلوها في العرب و الموالي اولى العتاقة. ۱۱۹

[عربوں میں اور موالی میں اسے مساوی تقسیم کردو۔]

خراسان کے ان موالی کے وظائف مقرر کیے جنہوں نے کفار سے جنگ کی تھی۔

الختصر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے موالی کو حکومتی ردعمل کے بعد آسانی اور سہولت دی۔



حوالہ جات:

۱ ابو محمد حجاج بن یوسف بن حکم بن ابی عقیل ثقفی، بنو امیہ کا ایک مشہور گورنر تھا۔ قبیلۂ بنو ثقیف کی شاخ "احلاف" سے تعلق رکھتا تھا۔ طائف میں ۴۱ھ/ ۶۶۱ء کے لگ بھگ پیدا ہوا، اس کے آباء و اجداد غریب تھے اور معمولی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا ذریعہ معاش سنگ برداری اور معماری تھا۔ اس کی ماں الفارعہ قبیلہ بنو ثقیف کی عورت، مغیرہ بن شعبہ کی مطلقہ بیوی تھی۔ بچپن میں حجاج کا عرف کلیب (چھوٹا کتا) تھا جس کا ذکر شعرا کے ہجویہ قصائد میں ملتا ہے۔ جوانی کے زمانے میں وہ طائف میں ایک مدرس تھا۔ اس کی اصل فوجی اور سیاسی زندگی اس وقت شروع ہوئی جب مصعب بن زبیر کے خلاف مہم میں اس نے بہادرانہ کارنامے انجام دیئے اور خلیفہ وقت عبدالملک بن مروان کی نظروں میں آ گیا۔ چنانچہ ۷۲ھ/ ۶۹۱ء میں مصعب بن زبیر کے خلاف فتح حاصل کرنے کے بعد عبدالملک نے اسے عبداللہ بن زبیر سے نبٹنے کے لئے شامی فوج کا قائد بنا کر کے روانہ کیا۔ سات ماہ کے محاصرے کے بعد حجاج نے عبداللہ ابن زبیر پر فتح حاصل کر لی، مکہ پر اس کا قبضہ ہو گیا اور ریاست کی وحدت بحال ہوگئی چنانچہ ۷۳ھ/ ۶۹۲ء کو دوسرا "عام الجماعۃ" کہا جاتا ہے۔ عبدالملک کے لئے یہ بڑی خدمت تھی جو حجاج نے انجام دی تھی، لہٰذا اس کے اعتراف کے طور پر وہ پہلے دو سال حجاز کا گورنر مقرر کیا گیا اس کے بعد عراق اور مشرقی اضلاع کی ولایت اسے مل گئی جہاں وہ بیس سال تک فرائض انجام دیتا رہا۔ حجاج کا انتقال شوال ۹۵ھ/ ۷۱۳ء میں ۵۴ برس کی عمر میں ہوا۔

۲ مسعودی، مروج الذہب و معادن الجواہر، جلد ۲، ص ۱۱۲۔ معمولی لفظی تغیر کے ساتھ، الکامل فی التاریخ، جلد ۴، ص ۵۸۶۔

۳ مسعودی کے بیان کے مطابق یہ مدت تین سال تھی۔ (مروج الذہب، جلد ۲، ص ۹۸)

۴ المعارف، ص ۱۰۲، ۱۰۶۔

۵ الکامل فی التاریخ، جلد ۴، ص ۴۳۸۔

۶ قرآنی آیت کا ترجمہ۔

۷ جاحظ، البیان و التبیین، جلد ۲، ص ۱۶۳، معمولی لفظی تغیر کے ساتھ یہ خطبہ مروج الذہب

جلد۲، ص ۱۰۳ - ۱۰۵؛ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۳ - ۲۰۳؛ الکامل فی التاریخ، جلد ۴، ص ۳۷۴ تا ۳۷۶ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

۸ الکامل فی التاریخ، جلد ۴، ص ۵۸۷، میں لکھا ہے، "ایک مرتبہ عبدالملک نے حجاج سے کہا ہر شخص اپنے عیوب سے واقف ہوتا ہے تم اپنے عیوب بلا کم و کاست بیان کرو، اس نے کہا، اے امیر المومنین میں جھگڑالو اور کینہ پرور ہوں۔"

۹ ابن اثیر، الکامل، جلد ۴، ص ۵۱۸، (معمولی لفظی تغیر کے ساتھ یہی بات مسعودی نے بھی مروج الذھب، جلد ۲، ص ۱۲۱ پر بیان کی ہے۔ سیوطی تاریخ الخلفا میں لکھتے ہیں۔ عبدالملک نے مرنے سے قبل ولید کو وصیت کی تھی کہ حجاج کو راضی رکھے۔ "...... اے ولید! خلافت کے معاملات میں خدا سے ڈر کر کام کرنا اور حجاج کا زیادہ خیال رکھنا اور اس کی ہمیشہ تعظیم کرنا کیونکہ اس نے تجھے خلافت تک پہنچا دیا ہے۔ اے ولید! وہ تیرا بازو اور تیری تلوار ہے، اس کے متعلق کسی کی شکایت نہ سننا، دیکھ تجھے اس کی زیادہ ضرورت ہے اور اسے تیری پروا بہت کم ہے۔" تاریخ الخلفاء، مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۳۰۹ھ، ص ۱۵۰)۔

۱۰ ایضاً۔

۱۱ لیوی، ص ۵۸۔

۱۲ المعارف، ص ۱۹۷۔

۱۳ ابن الندیم، الفھرست، ص ۱۵۰، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۶ء، (فارسی عبداللہ ابن مقفع کا نام روزبہ تھا، قبل از اسلام اس کی کنیت ابوعمرو تھی، اسلام لانے کے بعد اس نے اپنی کنیت ابومحمد رکھ لی تھی۔ اس کے باپ کا نام مبارک تھا۔ یہ دراصل فارس کے ایک شہر "جوز" کا باشندہ تھا۔ پہلے داؤد بن عمر بن ہبیرہ کا منشی اور کاتب تھا، پھر اس کو عیسیٰ بن علی نے کرمان کے عہدہ کتابت پر مامور کیا۔ انتہائی درجہ کا فصیح و بلیغ شخص تھا، وقائع نگار اور شاعر بھی تھا۔ منصور کے زمانے میں قتل ہوا۔ یہ ان لوگوں میں سے تھا جو فارسی سے عربی میں ترجمہ کرتے تھے۔ اس کو دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ (الفہرست، ص ۱۵۰)

۱۴ مروج الذھب، جلد ۲، ص ۱۰۶؛ البیان و التبیین، جلد ۱، ص ۷۲۔

۱۵ اہل عراق کی تلون المزاجی سے تو حضرت علیؑ بھی سخت بیزار تھے اور شامیوں کی اطاعت گزاری

کے معترف، جب بسر بن ابی ارطاۃ کو یمن پر غلبہ حاصل ہوگیا تو حضرت علیؓ نے اہل کوفہ کو مخاطب کرکے کہا "بسر بن ابی ارطاۃ یمن پر غالب آگیا ہے اور بخدا میں اس قوم (شامیوں) کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ تمہارے مقبوضہ علاقوں پر غالب آتی جارہی ہیں۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ حق پر ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ اپنے آقا کی اطاعت کرتے ہیں اور اس سے راست روی اختیار کرتے ہیں اور تم میری نافرمانی کرتے ہو، وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور تم ایک دوسرے کو بے یار و مددگار چھوڑ دیتے ہو، وہ اپنے شہروں کی اصلاح کرتے ہیں اور تم اپنے شہروں کو خراب کرتے ہو۔ (مروج الذہب، جلد۲،ص۱۱۲)۔

۱۶ سیف بن عمر الاسدی التمیمی ایک عرب مورخ تھا جو تاریخ نگاری کے دبستانِ عراق سے تعلق رکھتا تھا، ابن الندیم کی الفہرست کے مطابق سیف نے دو کتابیں لکھیں کتاب الفتوح الکبیر والرّدہ اور کتاب الجمال ومسیر عائشہ وعلی۔ یہ دونوں کتابیں نایاب ہیں تاہم طبری میں روایت ہو کر سیف کی بہت سی معلومات محفوظ ہوگئی ہیں۔ حروبِ ارتداد اور ابتدائی فتوحات (۱۱ھ۔۳۶ھ) کے حوالے سے سیف طبری کا اہم ماخذ ہے۔ ولہاؤزن نے سیف کی مورخانہ حیثیت کے متعلق خاصی حد تک مکمل بحث کی ہے، وہ سیف سے روایات لیتا ہے لیکن اس کے رجحانات کو بھی پیش نظر رکھتا ہے، اگرچہ سیف تفصیلات کی فراوانی سے متاثر کرتا ہے لیکن جب اس کا عرب مورخین اور عیسائی وقائع نگاروں کے مواد سے مقابلہ کیا جائے تو یہ عیاں ہوجاتا ہے کہ اس کی عراقی روایت حجازی روایت کی بہ نسبت کم معتبر ہے۔ کیتانی (Caetani) نے *Annali* میں سیف کی کتاب کے مختلف اقتباسات دے کر نقد اور تبصرہ کیا ہے۔

۱۷ لیوی، ص۵۸۔

۱۸ البدایہ والنہایہ، جلد۹،ص۲۔

۱۹ تاریخ طبری، جلد۶،ص۱۹۵؛ الکامل فی التاریخ، جلد۴،ص۳۹۵؛ ابن خلدون، تاریخ، جلد۳،ص۳۰؛ سیوطی، تاریخ الخلفا،ص۱۳۶۔

۲۰ تاریخ ارض القرآن،۳۶۳ تا ۳۶۵۔

۲۱ العقد الفرید، جلد۳،ص۳۱۲۔

۲۲ تاریخ ارض القرآن،ص۳۸۰۔

۲۳ یہ مذہبی اکابر تھے، جو قاریٔ قرآن تھے اور شہر کی مذہبی وفکری زندگی پر چھائے ہوئے تھے۔ ان میں بہت سے جاہ پسند تھے اور مذہبی پندار میں مبتلا، یہ حاکموں سے اسی وقت تعاون کرتے جب وہ ان کے ساتھ التفات خاص سے پیش آتے، ان کی مالی مدد کرتے، ان کے نقطہ نظر سے متفق ہوتے اور ان کی مذہبی برتری تسلیم کرتے۔ دوسری صورت میں یہ قرا ناراض ہوکر حاکموں کے خلاف شورش بپا کیا کرتے۔ ان قرا کے بارے میں حضرت حسن بصری (م ۱۱۰ھ) کہتے ہیں "انہوں نے قرآن کے بول تو یاد کر لیئے ہیں لیکن ان کے تقاضوں کو فراموش کردیا ہے۔ اس کے ذریعہ حاکموں سے تعلق پیدا کرتے ہیں اور اپنے ہم شہروں پر چھائے رہتے ہیں"۔ یہ قرا پہلی خانہ جنگی، دوسری خانہ جنگی اور خوارج کے ظہور، ہر جگہ سرگرم نظر آئے۔ خوارج میں بہت سے قرا بھی تھے۔

۲۴ العقد الفرید، جلد ۳، ص ۴۱۶۔

۲۵ حسن ابراہیم حسن، النظم الاسلامیہ، ص ۲۱۷؛ لیوی، ص ۵۸؛ نکلسن، ص ۲۴۸۔

۲۶ لسان العرب، (مادہ: جزیہ)

۲۷ ابن عبدالحکم، فتوح مصر، ص ۱۵۵، نیوہیون، ۱۹۲۲ء۔

۲۸ امام ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۷۰، بولاق، ۱۳۰۲ھ۔

۲۹ یعقوبی، تاریخ (مختلف مقامات)۔

۳۰ Daniel C. Dennett, *Converion and the Poll Tax in the Early Islam*, Cambridge, 1950, P. 27.

۳۱ Tritton: ***The Caliphs and their Non-Muslim Subject***, 1930.

۳۲ سنن ابو داؤد، جلد ۲، ص ۵۱۸۔

۳۳ تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۳۶۸، حضرت عمرؓ بن خطاب کے زمانے میں جب اسلامی فوجیں حمص (شام) سے ہٹ آئیں تو حضرت ابو عبیدہ نے وہاں کے یہودیوں اور عیسائیوں کو بلا کر ان کی رقم جزیہ یہ کہہ کر واپس کردی کہ چونکہ اب ہم تمہاری حفاظت نہیں کرسکتے، اس لئے جزیہ کی رقم بھی نہیں رکھ سکتے۔ (البلاذری، ص ۱۴۳)

۳۴ تاریخ طبری، جلد ۴، ص ۱۵۶۔

۳۵؎ امام مالک، موطا، ص۲۵۲۔

۳۶؎ کتاب الاموال، ص۲۵، ۳۱۔

۳۷؎ ایضاً، ص۳۶۔

۳۸؎ کتاب الاموال، ص۳۲، ۳۳؛ فتوح البلدان، ص۱۲۰۔

۳۹؎ فتوح البلدان، ص۱۲۰۔

۴۰؎ کتاب الاموال، ص۳۲؛ فتوح البلدان، ص۱۳۱۔

۴۱؎ ایضاً۔

۴۲؎ ایضاً، ص۳۷۔

۴۳؎ وردان، حضرت عمرو بن العاص کے موالی تھے، اور انہی کی طرف سے مصر کے معاملات کے نگران تھے، نہایت ہوشمند اور صاحب الرای والفکر تھے، مصر میں ان کا بسایا ہوا بازار جو "سوق وردان" کہلاتا ہے، ابن قتیبہ کے وقت تک موجود تھا۔ (المعارف، ۱۲۵)

۴۴؎ کتاب الاموال، ص۱۴۳۔

۴۵؎ فتوح البلدان، ص۷۸۔

۴۶؎ جرجی زیدان، تاریخ تمدن اسلام، جلد۲، ص۱۷۔

۴۷؎ کتاب الاموال، ص۴۳۔

۴۸؎ ایضاً۔

۴۹؎ ایضاً، ص۱۴۳۔

۵۰؎ ایضاً، ص۱۴۳۔

۵۱؎ ایضاً۔

۵۲؎ ایضاً۔

۵۳؎ فتح مصر کی تفصیل یوں ہے کہ حضرت عمرو بن العاص نے سب سے پہلے محرم ۱۹ھ/ دسمبر ۶۳۹ء میں مصر کی مشرقی سرحد پر واقع علاقہ فرما (Pelusium) فتح کرلیا۔ اس اثنا میں حضرت زبیر بن العوام کی سرکردگی میں پانچ ہزار تازہ دم فوج مدینے سے آ گئی۔ اس کے بعد عربوں کی متحدہ فوج نے پیش قدمی کرکے رجب ۱۹ھ/ جولائی ۶۴۰ء میں بازنطینی فوج کو عین الشمس کے

سامنے شکست دی۔ شہر تو فتح ہو گیا مگر قلعہ کا محاصرہ جاری رہا۔ حضرت زبیر نے سیڑھی کے ذریعہ قلعہ میں داخل ہو کر نعرہ تکبیر کے دوران قلعہ کے دروازے کھول دیئے۔ اسکندریہ کے حاکم مقوقس نے صلح کے لئے خط و کتابت شروع کر دی اور معاہدے کی شرائط کی توثیق کے لئے مصر سے ہرقل کے پاس چلا گیا۔ قیصر اس عہد نامے سے سخت ناراض ہوا مگر اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہرقل کا انتقال ہو گیا۔ اب اسلامی فوج نے اسکندریہ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ جب حالات بد سے بدتر ہونے لگے تو مجبوراً مقوقس کو دوبارہ مصر بھیجا گیا۔ اس نے حضرت عمرو بن العاص سے ایک معاہدہ طے کیا جس کی رو سے یہ قرار پایا کہ ایک مقررہ خراج کے بدلے شہر اسکندریہ ۱۶ ر شوال ۲۱ھ/ ۱۷ ر ستمبر ۶۴۲ء تک خالی کر دیا جائے گا اور مسلمان اہل شہر کی مال و جان کا ذمہ لیں گے۔ اس طرح یونانیوں نے شہر خالی کر دیا اور اسکندریہ پر عربوں کا قبضہ ہو گیا۔ مقریزی نے مصر کی فتح کے سلسلے میں ہونے والے اختلاف رائے پر اپنی کتاب الخطط میں پورا باب باندھا ہے۔ دیکھئے باب پنجم، "ذکر ماقیل فی مصر ھل فتحت بصلح او عنو"۔

۵۴ گستاؤلیبان، ص ۳۷۔

۵۵ کتاب الاموال، ص ۵۱۔ یہی وجہ ہے کہ بعض فقہا اور علما نے بنوامیہ کے خلاف بغاوت کو جائز قرار دیا تھا، یزید ابن حبیب کہتے ہیں "اعظم ما اتت ھذہ الامۃ. بعد نبیھا صلی اللہ علیہ وسلم ثلاث خصال: قتلھم عثمان. احراقھم الکعبہ. و اخذھم الجزیہ من المسلمین." (کتاب الاموال، ص ۵۱) یعنی (رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اس امت مسلمہ نے جو بدترین کام کیے وہ تین ہیں، ایک حضرت عثمانؓ کا قتل، دوسرے کعبہ کو آگ لگانا اور تیسرے مسلمانوں سے جزیہ لینا۔

۵۶ جرجی زیدان، تاریخ تمدن اسلام، جلد ۲، ص ۱۶، نیز لیوی، ص ۵۸۔

۵۷ المومنون: ۷۲۔

۵۸ کتاب الاموال، ص ۵۷-۵۸۔

۵۹ ایضاً، ص ۷۲۔

۶۰ جرجی زیدان، تاریخ تمدن اسلام، جلد ۲، ص ۱۶۔

۶۱ کتاب الاموال، ص ۱۳۱۔

۶۲ ایضاً، ص ۸۳، ۸۴۔

۶۳ ایضاً، ص ۹۴۔

۶۴ ایضاً، ص ۹۵۔

۶۵ ایضاً، ص ۹۰

۶۶ دونوں نکات (یعنی 'الف' اور 'ب') ایک دوسرے سے متناقض و متصادم ہیں، اس پر آگے بحث آرہی ہے۔

۶۷ ڈی۔سی۔ ڈینیٹ، ص ۲۸۔

۶۸ ولہاوزن۔

۶۹ عبدالرحمٰن کا دادا اشعث ابن قیس کندہ کا رئیس تھا اور رسول اللہ ﷺ کے پاس ۱۰ھ میں کندہ کے وفد کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے اپنے وفد کے ساتھ اسلام قبول کیا۔ بعد میں مرتد ہوگیا اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں حروب ارتداد کے دوران گرفتار ہوا۔ اس نے بعد میں اسلام قبول کرلیا، عام الوفود میں حضرت ابوبکر صدیق کی بہن ام فروہ سے اشعث کا نکاح ہوا، مگر رخصتی نہیں ہوئی تھی، اشعث کی گرفتاری اور دوبارہ قبول اسلام کے بعد ام فروہ ان کے نکاح میں آئیں۔ اشعث ابن قیس، خلافت عمرؓ کے دوران عراق گیا اور جنگ قادسیہ، مدائن، جلولاء اور نہاوند میں حصہ لیا۔ ۴۲ھ یا ۴۰ھ میں کوفہ میں انتقال کیا۔ (الاستیعاب، جلد ۱، ص ۱۳۳-۱۳۴)

۷۰ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۳۲۷۔

۷۱ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۳۳۶؛ ابن خلدون، جلد ۳، ص ۴۷۔

۷۲ حجاج بن یوسف اور عبدالرحمٰن کے درمیان سخت عداوت تھی، اس کا ایک سبب یہ ہوسکتا تھا کہ حجاج نے ۷۶ھ میں عبدالرحمٰن کو شبیب بن یزید خارجی سے نپٹنے کے لئے چھ ہزار کی فوج دے کر بھیجا تھا، مگر بعد میں اسے امارت لشکر سے معزول کر کے عثمان بن قطن کو مقرر کیا۔ (طبری، جلد ۶، ص ۲۵۲۔) حجاج کہا کرتا تھا کہ "جب میں عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کو دیکھتا ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ اسے قتل کر دوں۔" اسی طرح عبدالرحمٰن کا یہ قول بھی طبری میں مذکور ہے کہ "جب تک میں اور حجاج زندہ ہیں، میں برابر اس کی تباہی کی کوشش میں لگا رہوں گا۔"

(طبری، جلد ۶، ص ۳۲۷، نیز ابن خلدون، جلد ۳، ص ۴۷۔)

۳؎ طبری، جلد ۶، ص ۳۳۶؛ تاریخ ابن خلدون، جلد ۳، ص ۴۷۔

۴؎ طبری، جلد ۶، ص ۳۳۷؛ تاریخ ابن خلدون، جلد ۳، ص ۴۸۔

۵؎ طبری، جلد ۶، ص ۳۳۸؛ تاریخ ابن خلدون، جلد ۳، ص ۴۸۔

۶؎ طبری، جلد ۶، ص ۳۸۱۔

۷۷؎ سلطنت کے محکموں میں عربی کی ترویج درجہ بدرجہ ہوئی۔ ۷۸ھ/ ۶۹۷ء میں حجاج بن یوسف نے عراق کے دواوین میں عربی رائج کی۔ پھر ۸۱ھ/ ۷۰۰ء میں عبدالملک نے شام کے دواوین میں عربی رائج کی۔ مصر کے دیوان ۸۷ھ/ ۷۰۵ء میں عربی میں منتقل ہوئے اور سب سے آخر میں خراسان کے دیوان ۱۲۴ھ/ ۷۴۳ء میں ہشام بن عبدالملک کے عہد میں عربی زبان میں منتقل کیے گئے۔ (جہشیاری، ص ۳۸ - ۴۰، نیز ص ۵۱، ۶۱، ۶۷؛ فتوح البلدان، ص ۱۹۶، ۲۹۸)

۸؎ جہشیاری۔

۹؎ طبری، جلد ۶، ص ۳۲۷؛ الکامل فی التاریخ، جلد ۴، ص ۳۶۹۔

۸۰؎ المعارف، ص ۱۴۷ (فیروز، آل حُضَین کے موالی میں سے تھا۔ حجاج کے خلاف عبدالرحمٰن کے خروج میں اس کے ساتھ تھا۔ حجاج نے یہ اعلان کرادیا تھا کہ جو شخص فیروز کا سر لائے گا اسے دس ہزار درہم انعام دیا جائے گا۔ جواباً فیروز نے یہ منادی کرادی کہ جو آدمی میرے پاس حجاج کا سر لائے گا، اُسے ایک لاکھ درہم انعام دوں گا۔ جب حجاج کے مقابلے میں عبدالرحمٰن کو شکست ہوگئی تو فیروز بھاگ کر خراسان چلا گیا۔ وہاں کے گورنر یزید بن مہلب نے گرفتار کر کے اسے حجاج کے پاس بھجوادیا۔ حجاج نے اس سے اس کے مال و متاع کے بارے میں پوچھا۔ فیروز نے جواباً کہا کہ اس شرط پر بتا سکتا ہوں کہ تم مجھے امان دو۔ حجاج نے انکار کردیا تو فیروز نے منادی کرادی کہ "لوگو! تم میں سے جس کے پاس فیروز کا مال ہے، وہ اب اسی کی ملکیت ہے جسے وہ خرچ کرنے کا حقدار ہے۔" اس پر حجاج نے اذیتیں دے کر فیروز کو قتل کرادیا۔ (طبری، جلد ۶، ص ۳۸۱، نیز المبرد کی الکامل میں فیروز کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔)

۸۱؎ دیر جماجم فرات کے مغرب میں کوفہ کی سطح مرتفع پر عین التمر اور قلوبہ کے قریب، کوفہ سے تقریباً سات فرسنگ پر واقع تھا۔ یہ دیر، اصل میں قبیلہ ایاد کے عراق سے نقل مکانی کر جانے سے قبل

ان کی ملکیت میں تھا۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۹، ص ۵۳۶)

۸۲ تاریخ ابن خلدون، جلد ۳، ص ۵۳۔

۸۳ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۳۸۳؛ الکامل فی التاریخ، جلد ۴، ص ۴۹۵ - ۴۹۶۔

۸۴ سعید احمد، مسلمانوں کا عروج و زوال، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۴۳ء۔

۸۵ لسان العرب میں ہے کہ "هجنة" ایسی بات کو کہتے ہیں جو عیب لگاتی ہو۔ عربوں کے نزدیک تھجین اونٹوں میں تو ممدوح امر ہے مگر انسانوں میں مذموم ہے۔ جہاں تک اونٹوں کا تعلق ہے، تھجین کے معنی یہ ہیں کہ ماں اور باپ دونوں اصیل ہوں، جبکہ انسانوں میں تھجین کے معنی یہ ہیں کہ باپ عربی النسل ہو اور ماں لونڈی ہو۔ اسی سے "رجل هجين" کا محاورہ لیا گیا ہے اور اگر معاملہ برعکس ہو، یعنی ماں اصیل ہو اور باپ غلام تو "رجل مقرف و فلنقس" کہتے ہیں۔ ایک رجز گو شاعر کہتا ہے:

العبد و الهجين و الفلنقس ثلاثة فايهم تلتمس

[غلام، لونڈی کا بیٹا اور غلام کا بیٹا، ان میں سے تم کسے چاہتے ہو۔]

(بلوغ الادب، جلد ۲، ص ۱۰۔) اسی طرح مُوَلَّدات ان لونڈی زادیوں کو کہتے تھے جن کے باپ عربی اور مائیں عجمی ہوں۔

۸۶ العقد الفرید، جلد ۳، ص ۴۱۳۔

۸۷ مراد ہیں صفیہؓ بنت حُیَیّ بن اخطب۔

۸۸ مراد ہیں زینبؓ بنت جحش۔

۸۹ العقد الفرید، جلد ۲، ص ۱۲۸۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۲۱۴، میں یوں ہے "......تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ کے اندر اچھا نمونہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے صفیہؓ بنت حُیَیّ کو آزاد کیا اور ان سے نکاح کر لیا اور زید بن حارثہ کو آزاد کیا اور ان سے اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش کا نکاح کر دیا۔")

۹۰ الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۲۱۲۔

۹۱ العقد الفرید، جلد ۳، ص ۴۱۷۔

۹۲ علی بن حسین بن علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم کی کنیت ابوالحسین اور لقب زین

العابدین تھا۔ ان کی والدہ ام ولد تھیں جن کا نام غزالہ، سلامہ یا سلافہ تھا۔ ان سے حسین بن علی کے بعد ان کے موالی زبید نے نکاح کیا، جن سے ان کے یہاں عبداللہ بن زبید پیدا ہوئے۔ وہ علی بن حسین کے اخیافی بھائی تھے۔ یہ ابن سعد، ابن قتیبہ اور ابن کثیر کی روایت ہے۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۲۱۱۔ المعارف، ص ۹۳۔ البدایۃ و النہایۃ، جلد ۹، ص ۱۰۴) تاہم شیعی روایات کے مطابق ان کی والدہ شہر بانو بنت یزدگرد شاہ ایران تھیں۔ واقعہ کربلا میں موجود تھے اور ابن سعد کے مطابق ان کی عمر ۲۳ برس تھی۔ شمر نے ان کو قتل کروا دینا چاہا مگر عمرو بن سعد کوفیوں کے آڑے آیا اور علی بن حسین بچ گئے۔ بعد میں یزید نے انہیں دیگر افراد خانہ کے ساتھ بحفاظت مدینہ بھجوا دیا۔ جب اہل مدینہ نے یزید کے خلاف بغاوت کی تو علی بن حسین نے اس بغاوت میں کوئی حصہ نہیں لیا اور مدینہ چھوڑ کر وادیٔ عقیق چلے گئے۔ جنگِ حرہ میں فتح یابی کے بعد جب مسلم بن عقبہ مدینہ میں داخل ہوا تو اس نے زین العابدین کی تعظیم و تکریم کی۔ اسی زمانے میں مختار بن ابی عبید ثقفی نے حصول اقتدار کے لئے خون حسین کے انتقام کی دعوت دی اور ہزاروں آدمی اس کے ساتھ ہو گئے مگر زین العابدین ان ہنگاموں سے کنارہ کش رہے۔ علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں ان کا بڑا مرتبہ تھا۔ مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اور وہیں ۹۴ھ/۷۱۲ء میں وفات پائی۔ اس سال کو فقہاء کے کثرت سے انتقال کی وجہ سے "سنۃ الفقہاء" کہا جاتا تھا۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۲۱۱-۲۲۲۔ تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۷۴۔ المعارف، ۹۳، ۹۵۔ البدایۃ والنہایۃ، جلد ۹، ص ۱۰۸)

۹۳ خلیفہ اول ابوبکر صدیقؓ کے پوتے قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیقؓ، باندی کے بطن سے تھے، ان کی والدہ کا نام سودہ تھا۔ مدینہ کے ممتاز فقیہ اور مرد فاضل تھے۔ اپنے والد کے قتل ہونے کے بعد اپنی پھوپھی ام المومنین حضرت عائشہؓ کی گود میں یتیمی کی حالت میں پرورش پائی اور انہی سے فقہ و حدیث کا علم حاصل کیا۔ ان کے علاوہ عبداللہ ابن عباس، معاویہ، فاطمہ بنت قیس، ابن عمر اور صحابہ کرام کی ایک جماعت سے علم حدیث حاصل کیا۔ آپ سے آپ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن، زہری، ابن المنکدر، ابن عون، ربیعۃ الرائی، افلح بن حمید، حنظلہ بن ابوسفیان، ایوب اور دوسرے بہت سے لوگ روایت کرتے ہیں۔ امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز کہتے تھے کہ اگر میرا اختیار ہوتا تو میں اپنے بعد "بنو تیم کے اعمش" یعنی قاسم بن محمد کو خلیفۃ المسلمین نامزد کرتا۔

ان کے سنہ وفات میں اختلاف ہے۔ ۱۰۶ھ، ۱۰۷ھ یا ۱۰۸ھ میں انتقال کیا، جبکہ وہ ۷۰ یا ۷۲ سال کے تھے۔ اخیر عمر میں ان کی بینائی ختم ہوچکی تھی۔ ان کے بیٹے عبدالرحمٰن بن قاسم قریش کے فاضل ترین شخص تھے، ان کی بیٹی ام فروہ، کی شادی محمد (الباقر) بن علی بن حسین بن علی سے ہوئی، جن سے جعفر (الصادق) پیدا ہوئے۔ (المعارف، ص ۷۶۔ الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۱۸۷۔ تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۹۶۔ صفۃ الصفوۃ، جلد ۲، ص ۴۹۔)

۹۴ سالم بن عبداللہ بن عمر فاروقؓ کی کنیت ابوعمرو تھی، ان کی والدہ ایک ام ولد تھیں۔ عبداللہ بن عمر اپنی اولاد میں سالم کو از حد محبوب رکھتے تھے۔ مدینہ کے نامور فقیہ ہوئے۔ آپ کا قول قابل حجت ہے۔ اپنے والد حضرت عبداللہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، رافع بن خدیج، سفینہ اور سعید بن مسیّب سے سماع حدیث کیا اور آپ سے عمرو بن دینار، زہری، عبید اللہ ابن عمر، صالح ابن کیسان، موسیٰ بن عقبہ، حنظلہ بن ابی سفیان اور دوسرے بہت سے لوگوں نے کسب فیض کیا۔ آپ کا رنگ سیاہ اور جسم عجمیوں کی طرح مضبوط تھا۔ علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں صحابہ کرام سے مشابہ تھے۔ ۱۰۶ھ میں وفات پائی۔ اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ (المعارف، ص ۸۰؛ الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۱۹۵؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۸۸)

۹۵ احمد امین المصری، ضحی الاسلام، جلد ۱ ص ۲۸۔

۹۶ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت صفر ۹۹ھ سے شروع ہوئی، ان کا انتقال رجب ۱۰۱ھ میں ہوا، اس اعتبار سے ان کی مدت خلافت تقریباً دو سال پانچ ماہ بنتی ہے۔

۹۷ البدایہ و النہایہ۔

۹۸ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے مقرر کردہ عمال کی تفصیل کے لئے دیکھئے، الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۳۴۱۔

۹۹ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۵۶۰۔

۱۰۰ طبری، جلد ۶، ص ۵۵۹؛ الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۳۴۵؛ تاریخ ابن خلدون، جلد ۳، ص ۷۶۔

۱۰۱ فتوح البلدان، ص ۸۳؛ تاریخ ابن خلدون، جلد ۳، ص ۷۶۔

۱۰۲ کتاب الخراج، ص ۷۵۔

۱۰۳؎ الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۳۸۴؛ مقریزی، باب ۲۸، ص ۳۲۷۔

۱۰۴؎ ایضاً، ص ۳۵۶۔ ۱۰۵؎ ایضاً، ص ۳۸۶۔

۱۰۶؎ ایضاً؛ نیز تاریخ ابن خلدون، جلد ۳، ص ۷۶؛ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۵۵۹۔

۱۰۷؎ تاریخ طبری، جلد ۶، ص ۵۵۹۔

۱۰۸؎ ایضاً، ص ۵۶۰؛ تاریخ ابن خلدون، جلد ۳، ص ۷۵۔

۱۰۹؎ سیوطی، تاریخ الخلفا، ص ۱۶۳۔

۱۱۰؎ عبدالسلام ندوی، سیرۃ عمر بن عبدالعزیز، ص ۱۰۹۔

۱۱۱؎ مزاحم کے بارے میں میمون ابن مہران کا قول قابل ذکر ہے، کہتے ہیں کہ "میں نے ایک گھر میں تین آدمیوں سے بہتر نہیں دیکھا، ایک عمر بن عبدالعزیز، دوسرے ان کے بیٹے عبدالملک اور تیسرے ان کے موالی مزاحم۔"

۱۱۲؎ ندوی، عبدالسلام، سیرت عمر بن عبدالعزیز، ص ۱۵۵۔

۱۱۳؎ ایضاً، ص ۱۱۰۔

۱۱۴؎ الکامل فی التاریخ، جلد ۵، ص ۵۵۔

۱۱۵؎ المعارف، ص ۱۹۸؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۹۸ (امام میمون بن مہران کی کنیت ابو ایوب تھی۔ عراق کے مشہور شہر رقہ کے رہنے والے تھے۔ کوفہ کی ایک عورت نے آزاد کیا تھا، وہیں پل کر جوان ہوئے۔ بعد میں الجزیرہ کو اپنا وطن بنا لیا۔ حضرت عائشہؓ، ابو ہریرہؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ اور دیگر صحابہ کی ایک جماعت سے روایت کرتے ہیں۔ ان سے ابو بشر خصیف، جعفر بن برقان، حجاج بن ارطاۃ، سالم بن ابی المہاجر، امام اوزاعی، ابو ملیح رقی، معقل بن عبیداللہ اور دوسرے بہت سے لوگوں نے علم حدیث حاصل کیا۔ امام احمد ابن حنبل انہیں عکرمہ موالی ابن عباس سے زیادہ ثقہ مانتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز ان کی افضلیت اور ثقاہت کے معترف تھے۔ ایک بار میمون ان کی مجلس سے اٹھ کر جانے لگے تو عمر بن عبدالعزیز نے کہا "جب یہ اور ان جیسے دوسرے علماء دنیا سے اٹھ جائیں گے تو بے کار لوگ باقی رہ جائیں گے۔" اسّی سال کی عمر میں ۱۱۷ھ میں انتقال کیا۔)

۱۱۶؎ ایاس بن معاویہ کا نسبی تعلق قبیلہ مضر کی شاخ مزینہ سے تھا، کنیت ابو واثلہ تھی۔ ان کی والدہ ام

ولد تھیں اور ان کا قیام وادئ سبع میں تھا جو بصرہ۔ مکہ شاہراہ پر ایک گاؤں تھا۔ یہیں انہوں نے ۱۲۲ھ میں انتقال کیا۔ (المعارف، ص ۲۰۵۔)

۱۱۷ فقیہ مدینہ امام ابوزناد مدنی کی کنیت ابوعبدالرحمٰن اور نام عبداللہ ابن ذکوان تھا۔ رملہ بنت شیبہ بن ربیعہ کے موالی تھے۔ یہ رملہ حضرت عثمان بن عفان کی ایک زوجہ تھیں۔ مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے۔ حضرت انس بن مالک، اسعد ابن سہل بن حنیف، عبداللہ بن جعفر اور سعید بن مسیب سے حدیث کا سماع کیا۔ شعروشاعری میں عبدالرحمٰن اعرج سے بہت شعر نقل کرتے تھے۔ ان سے امام مالک، شعیب بن ابی حمزہ، لیث بن سعد اور دوسرے بہت سے لوگوں نے علم حاصل کیا۔ مدینہ کے نامور فقیہ تھے۔ ۱۳۰ھ یا ۱۳۱ھ میں انتقال کیا۔

۱۱۸ الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۱۸۷؛ صفۃ الصفوۃ، جلد ۲، ص ۳۹۔

۱۱۹ کتاب الاموال، ص ۲۲۱؛ الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۳۳۶، ۳۷۵۔



باب ہفتم

ترویج علوم میں موالی کا حصہ
(پہلی صدی ہجری)

(الف) اسلام سے قبل عربوں کی علمی حالت:

باب دوم میں وسطی عربوں کی جو تمدنی، معاشی و سیاسی حیثیت متعین کی جا چکی ہے، وہی ان کی علمی حالت بھی تھی۔ وہ علمی اعتبار سے نرے جاہل نہیں تھے، مگر اپنے شمالی اور جنوبی عرب پڑوسیوں کے مقابلے میں ان کی علمی ترقی کمتر درجے کی تھی۔ عمومی طور پر دیکھا جائے تو دنیا کی سب سے قدیم تاجر اور عالم قوم عرب ہی تھے خواہ وہ جزیرہ نمائے عرب کے اندر ہوں یا باہر۔ تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل مسیح میں ہمیں حمورابی ۱ کا نام ملتا ہے، جو دنیا کا سب سے پہلا مقنن تھا۔ ''دولت حمورابی'' کا تحریری دستور آج بھی تحریری شکل میں موجود ہے بلکہ آج جتنے بھی دساتیر اور مجامع قوانین ہیں، ان میں قدیم ترین مجموعہ حمورابی ہی کا مرتب کردہ ہے۔ حمورابی عرب عاربہ کے ایک سامی خاندان کا بادشاہ تھا اور غالباً حضرت ابراہیمؑ کا ہم عصر تھا۔

عاد اور ثمود جن کی عظمت، قوت اور عقل و ہنرمندی کا ذکر قرآن بھی کرتا ہے:

التی لم یخلق مثلھا فی البلاد (الفجر)

[جن کے برابر کوئی شخص شہروں میں پیدا نہیں کیا گیا۔]

یہ عاد اور ثمود علوم وفنون کی دنیا میں اساتذۂ فن کی حیثیت رکھتے تھے، اندرون عرب اور بیرون عرب ان کی حکمتوں کا چرچا تھا۔ یہ بڑا غلط عام خیال ہے کہ علوم کی دنیا میں یونان کا کوئی ثانی نہیں اور وہی معلم اول تھے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یونانیوں نے بہت کچھ فنیقیوں سے ۲ سیکھا تھا۔ انہی سے یونانیوں نے تہذیب کی ابجد پڑھی، انہی سے فن تحریر سیکھا، اوزان و پیمائش کے طریقوں اور علم الحساب سے آگاہی حاصل کی، انہی کا بسایا ہوا شہر قرطاجنہ (Carthage) ڈھائی سو سال قبل مسیح میں علوم وفنون کا بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔

یہ تو جزیرہ نمائے عرب سے باہر عربوں کی بات ہے، اندرونِ عرب بھی ان کی علمی ترقیاں قابل ذکر تھیں، عاد ثانیہ ۳ یا عاد عرب کا ایک مشہور مفکر حکیم لقمان ۴ تھا، جس کا تذکرہ سورۂ لقمان میں موجود ہے۔ حکیم لقمان کا صحیفہ حکمت "مجلّہ لقمان" خود عرب میں موجود تھا اور لوگ اسے پڑھتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ صحیفہ دیکھا تھا۔ ۵ کھدائیوں میں کئی کتبے ملے ہیں جن سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ عاد اولیٰ ہوں یا عاد ثانیہ، لکھنے پڑھنے سے واقف تھے۔ ۶ عاد کے بعد شہرت اور سیاسی جانشینی ثمود ۷ کو حاصل ہوئی۔ یہ بھی لکھنا پڑھنا جانتے تھے، جس کی دلیل وہ کتبے ہیں جن پر آرامی اور ثمودی خط میں لکھا گیا ہے۔

شمال سے جنوب میں آجائیے، تب بھی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کی رونق نظر آتی ہے۔ جوف یمن میں آباد اہل معین ۸ کی عمارات اور مقبروں کے کتبے ملے ہیں۔ سبا کی ملکہ اور حضرت سلیمان کے درمیان خط وکتابت کی شہادت قرآن سے ملتی ہے۔ ۹ یمن کے سبا اور معین علم وفن اور تہذیب وتمدن میں (ایتھنز اور روما کے بسائے جانے سے قبل) کافی ترقی کر چکے تھے۔ وہاں بے شمار کتبے ملے ہیں، جو پڑھے جا چکے ہیں اور جو پڑھے نہیں جا سکے۔ ان سے بھی اہم انکشافات کی توقع کی جا سکتی ہے۔

بنو حمیر نے یمن میں اپنے اخبار وحوادث کو بکثرت مدون کیا تھا بلکہ انہیں پتھروں پر نقش کر چھوڑا تھا، چنانچہ ان کے یہ آثار وقتاً فوقتاً دریافت ہوتے رہتے ہیں۔ جنوبی عرب کے لوگ جس خط میں لکھتے تھے، اسے "خط مسند" کہتے ہیں۔ ۱۰ انجینئرنگ، زراعت اور تعمیرات

میں ان کے کارنامے قابل ذکر ہیں، سد مآرب اور قصر غمدان ۱۱ ان کے شاہکار تھے۔ ان کی اکثریت آباد شہروں کی رہنے والی تھی۔ انہوں نے مشہور محل بنائے اور بلند قلعے تعمیر کیے۔ ان کے یہاں باقاعدہ ایک سیاسی نظام کا پتا چلتا ہے۔ اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ انہیں ان علوم سے واقفیت رہی ہوگی جو نظم ونسق قائم رکھنے کے لئے بہت ضروری ہوتے ہیں اور جن پر سیاسی نظام، نظم معیشت اور تدبیر منزل وغیرہ کا دارومدار ہوتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ یمن کے عربوں کا تمدن اتنا ہی عمدہ تھا جتنا اپنے وقت کے اعتبار سے کوئی ترقی یافتہ تمدن ہوسکتا ہے۔

اسلام سے قبل کے زمانوں میں عرب کے شمال میں حیرہ اور غسانہ کی عرب حکومتیں بڑی متمدن سمجھی جاتی تھیں۔ حیرہ کے عرب ایران کی عظیم مدنیت کے پڑوس میں رہتے تھے۔ ان کی اپنی زبان نبطی تھی، چنانچہ ان کے شعروادب کا ذخیرہ اسی زبان میں موجود تھا، تاہم یہ فارسی اور عربی سے بھی واقف تھے، بلکہ بعض تو ان زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ ۱۲ عربی شاعری کے لئے حیرہ نہایت مشہور ہے۔ حیرہ کے ان عربوں میں یونانی علوم وفنون بھی بڑی حد تک سرایت کرچکے تھے۔ ۱۳ زمانۂ جاہلیت میں قریش کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم اہل حیرہ ہی نے دی تھی۔ ۱۴

اسی طرح غسانہ کا علمی مرتبہ بھی لائق توجہ تھا بلکہ تہذیب وتمدن اور علمی سرگرمیوں میں وہ اہل حیرہ پر فوقیت رکھتے تھے کیونکہ ان لوگوں کو یونانی ثقافت اور رومی تہذیب سے بھی قرب حاصل تھا۔

شمالی اور جنوبی عرب کی اس تمدنی، فنی اور علمی ترقی کے برخلاف وسطی عرب اور حجاز میں عموماً علم کی یہ رونق نظر نہیں آتی۔ وسطی عرب کی اکثریت بادیہ نشین عربوں پر مشتمل تھی اور صحراؤں میں عموماً مدون علوم، فلسفہ وحکمت پروان نہیں چڑھا کرتے البتہ وسطی عرب کے حضری عرب نسبتاً پڑھے لکھے تھے۔ عہد جاہلیت کے جو خطبے، اشعار اور ضرب الامثال وغیرہ محفوظ ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کے عربوں میں فصاحت وبلاغت، حسن مذاق اور دقت نظر کا معیار یقیناً بلند تھا۔

زیر نظر عہد میں حصول علم کا سب سے زیادہ مروج طریقہ تو یہ تھا کہ بچوں کو زبان

سکھانے اور ان کو فصیح و بلیغ بنانے کے لئے بدوی قبائل میں بھیج دیا جاتا تھا، جہاں وہ دیگر جسمانی ریاضتوں کے علاوہ عربی زبان پر عبور حاصل کیا کرتے تھے۔ تاہم اس کے باوجود مکہ اور مدینہ میں مدرسوں کا پتا چلتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ مدرسے انتہائی ابتدائی نوعیت کے تھے، تاہم ان میں لڑکوں کے علاوہ لڑکیاں بھی پڑھنے جاتی تھیں۔ ۱۵

مدینہ (یثرب) میں بھی توریت کی تعلیم کے لئے ایک "بَیْتُ الْمِدْرَاس" ۱۶ کا وجود ملتا ہے۔ اس کے علاوہ یہودیوں کے دوسرے شہروں مثلاً خیبر، فدک اور تیماء وغیرہ میں یہودی لٹریچر پایا جاتا تھا۔ سورہ بقرہ کی بعض آیات ۱۷ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علما اور سربرآوردہ اشخاص لکھنا پڑھنا خوب جانتے تھے۔ عرب میں جہاں کہیں عیسائیوں کے گرجے تھے، ان میں دینی کتابیں موجود ہوتی تھیں۔ یہودی اور نصرانی شعراء کے دیوان بھی موجود تھے۔ تاہم یہ بات طے ہے کہ یمن کے یہودی مدارس، حجاز کے یہودی مدارس سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ یمن، حضارت اور تمدن میں حجاز سے بلاشبہ بہت آگے تھا، ان کے یہاں توراۃ کی شرحیں اور تاریخی قصے کہانیوں وغیرہ کی کتابیں زیادہ متداول تھیں جو حجاز کے یہودیوں کے پاس نہیں تھیں۔ ۱۸

مسیحی تعلیمات سے عرب خوب واقف تھے چنانچہ عربوں میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے جن کا رجحان رہبانیت کی طرف تھا۔ حنظلہ طائی، قس بن ساعدۃ الایادی اور امیہ بن ابی صلت (جس نے بہت سی کتابیں پڑھی تھیں) اس کی واضح مثالیں ہیں۔ ۱۹ عیسائی اور راہب، عربوں کے میلوں میں آتے، لوگوں کو نصیحت کرتے، بشارتیں دیتے، حشر نشر، حساب کتاب، جنت و دوزخ کے تذکرے کرتے۔ قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن میں ان کے اقوال کو نقل کر کے ان کے مذاہب کا ابطال کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعلیمات ان کے درمیان اچھی طرح پھیل چکی تھیں۔ ورقہ بن نوفل بھی توریت اور انجیل کی تعلیمات سے واقف تھے۔

جزیرہ نمائے عرب میں جو بازار اور میلے لگا کرتے تھے ۲۰ وہ اس علمی حرکت کو ابھارنے میں خصوصیت سے مددگار تھے۔ ان بازاروں میں صرف تجارت ہی نہیں ہوتی تھی

بلکہ بقول ڈاکٹر حمید اللہ انہیں ایک "بین العرب ادبیاتی کانگریس" کہا جا سکتا ہے۔ ۲۱ حالانکہ حق تو یہ ہے کہ یہ ادبیاتی کانگریس صرف "بین العرب" نہیں تھی بلکہ ان میں سے بعض میلوں میں عرب سے باہر کے تجار بھی شرکت کیا کرتے تھے۔ ۲۲ مثلاً چین، سندھ اور ایران وغیرہ کے تجار و سوداگر۔

عرب شعرا، ان میلوں میں اپنا کلام سناتے، خطبا اور حکما اپنی تقاریر میں دانش و حکمت کی باتیں بیان کرتے۔ بعض شعرا کے قصائد جو ادبِ عالی کے تقاضوں کو پورا کرتے، انہیں لکھ کر خانہ کعبہ کی دیواروں پر آویزاں کر دیا جاتا۔ ایسے "سبع معلقات" ۲۳ مشہور ہیں۔ ان میلوں میں حکام اپنے فیصلے سناتے، شیوخ معاہدے کی دفعات طے کرتے۔ یوں جزیرہ نمائے عرب میں لگنے والے یہ مختلف بازار اور حج کعبہ کی رسم، عربی زبان کو ایک معیاری اور ٹکسالی زبان بنانے میں خاموش لیکن انتہائی موثر کردار ادا کر رہے تھے۔

وسطی عرب میں بہت زیادہ لکھنے پڑھنے کا رواج نہیں تھا۔ مکہ میں لکھنے کا رواج حرب بن امیہ (ابوسفیان کے باپ) کے زمانے سے ہوا بلکہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ حرب بن امیہ وہ پہلا شخص تھا، جس نے عربی تحریر استعمال کی۔ ۲۴ ابن عبد ربہ اور بلاذری کا کہنا ہے کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں سارے قریش میں صرف سترہ افراد لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ۲۵ لیکن یہ کوئی حتمی بیان نہیں ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد سترہ سے کہیں زیادہ تھی، کیونکہ بلاذری سترہ نام گنوانے کے بعد اسی سلسلے میں آگے چل کر شرحبیل بن حسنہ کا نام بھی لکھتا ہے جو حلفائے قریش میں سے تھے اور لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ۲۶ نیز وہ کاتب رسولؐ کے طور پر حنظلہ ابن الربیع بن رباح الاسدی کا نام بھی، جن کا تعلق بنو تمیم سے تھا، لکھتا ہے، یوں بلاذری کی فہرست خود اسی کے حوالے سے طویل ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ قریش کی کم از کم پانچ خواتین کا نام بھی تحریر کرتا ہے جو اسلام کے ابتدائی زمانے سے تعلق رکھتی تھیں اور لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو بلاذری کی یہ فہرست سترہ سے بڑھ کر چوبیس تک ہو جاتی ہے۔ تاہم یہ فہرست بھی حتمی نہیں ہے کیونکہ اس فہرست میں عبدالمطلب، منصور بن عکرمہ، عامر

بن فہیرہ، زبیر بن العوام اور ارقم بن ابی الارقم مخزومی وغیرہ کے نام نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ الفہرست میں ابن الندیم نے نشاندہی کی ہے کہ خلیفہ مامون کے خزانہ کتب میں ایک مخطوطہ تھا، جس میں ذرا بھدے خط کی کچھ عبارت تھی اور وہ عبدالمطلب کا خط تھا۔ ۲۷

اسی طرح منصور بن عکرمہ بن عامر بن ہاشم بن عبد مناف بن عبدالدار بن قصی کا نام بلاذری کی فہرست میں نہیں ہے، حالانکہ منصور نے نبوی میں وہ معاہدہ لکھا تھا، جس کے بعد قریش نے بنو ہاشم اور بنو مطلب ۲۸ کا سماجی مقاطعہ کیا جو کہ تین برس تک جاری رہا تھا۔ قریش، منصور بن عکرمہ کی قابلیت کے معترف تھے، حیرت ہے بلاذری سے یہ نام کیسے رہ گیا۔

اسی طرح سفر ہجرت کے دوران سراقہ بن جعشم کو جو فرمان لکھ کر دیا گیا تھا، اس کے لکھنے والے عامر بن فہیرہ ۲۹ تھے جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے موالی تھے اور چونکہ موالی اپنے آقا کے قبیلے ہی میں محسوب ہوتا تھا، لہٰذا انہیں بھی قبیلہ قریش ہی کا فرد سمجھا جائے گا۔ اسی طرح ابن عبدالبر نے کاتبان رسول اللہؐ کے تذکرے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام بھی لکھا ہے۔ ۳۰ نیز ابن سعد کے بیانات کی روشنی میں کاتبان وحی کی جو فہرست مرتب ہوتی ہے۔ ۳۱ اس میں بھی چند نام ایسے ہیں جو بلاذری کی فہرست میں شامل نہیں مثلاً زبیر بن العوام اور ارقم بن ابی الارقم وغیرہ۔ المختصر بلاذری کا یہ بیان کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں مکہ کے سترہ افراد پڑھنا جانتے تھے حتمی اور قطعی نہیں بلکہ تشنہ اور محض ظنی ہے۔

مکہ ہی کی طرح مدینہ (یثرب) اور طائف میں کچھ نہ کچھ علمی سرگرمی موجود تھی، غیلان بن سلمٰی ثقفی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہفتے میں ایک دن علمی مجلس منعقد کرتا تھا، جس میں شعر و شاعری ہوتی تھی اور پھر اُن پر نقد اور تبصرہ کیا جاتا تھا۔

جہاں تک مدون علوم کا تعلق تھا، عربوں کے پاس چند کتابیں تھیں، نصرانی علما کے پاس توراۃ کا نسخہ موجود ہوتا تھا۔ ''صحیفہ لقمان'' بھی موجود تھا، جس کے بعض اوراق رسول اللہ ﷺ نے بھی دیکھے تھے۔ امیہ بن ابی صلت کے پاس بھی حکمت و دانائی کی باتوں پر مبنی ایک کتاب موجود تھی۔ ۳۲ اسی طرح قدیم عرب کا ممتاز طبیب جس نے رسول اللہ ﷺ کا زمانہ

پایا تھا، یعنی حارث بن کلدہ ثقفی بھی صاحب کتاب تھا۔ ابن ابی اُصَیبعہ ۳۳ نے حفظ صحت پر اس کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے، جس کا نام کتاب المحاورۃ فی الطب بینہ و بین کسریٰ انوشروان تھا۔ ۳۴ اس کے بیٹے نضر بن حارث نے اسی سے طب سیکھی تھی۔ اسی نضر نے ایران کے رزم و بزم پر ایک (افسانوی) تاریخ بھی مدون کی تھی۔ ۳۵

بایں ہمہ عہد جاہلیت میں مخصوص علوم تھے جن میں لغت و شعر، خطابت و انساب اور امثال و اخبار و قصص قابل ذکر ہیں۔ علومِ طبعیہ میں طب اور معالجہ حیوانات، نجوم، قیافہ شناسی، کہانت اور ہوا کے رخ اور بارش کے اوقات کے علم سے عربوں کو خاص دلچسپی تھی اور شعر و شاعری کا بھی بڑا چرچا تھا لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ سب کچھ ان کے شمالی اور جنوبی عرب پڑوسیوں کے مقابلے میں بہت کم اور ایران اور روم کے مقابلے میں نسبتاً اور بھی کم تھا۔

(ب) اسلام لانے سے قبل ایرانیوں کی علمی حالت:

جیسا کہ ہم نے ابتداء میں طے کر لیا تھا کہ "موالی" کے اصطلاحی معنوں کو ہم "ایرانیوں" تک محدود کریں گے، کم از کم "موالی" میں عرب موالی شامل نہیں کیے جائیں گے کیونکہ اس طرح مسئلہ مزید الجھاؤ کا شکار ہوگا۔ اس باب میں جب کہ عرب اور موالی کا علمی موازنہ درکار ہے، لہٰذا موالی میں ایرانیوں کے علاوہ دیگر عجمی بھی شامل ہو سکتے ہیں لیکن چونکہ یونانیوں کے علوم رومیوں کی طرف منتقل ہو کر تقریباً مردہ ہو چکے تھے یا ایران کی طرف منتقل ہو چکے تھے، اس لیے اگر ایرانیوں کی علمی حالت کا جائزہ پیش کیا جائے تو گویا اس میں رومیوں تک پہنچنے والے یونانی علوم کا احاطہ بھی ہو جائے گا۔

ایرانیوں کا تاریخی دور ہخامنشیوں سے شروع ہوتا ہے۔ ہخامنشی دور (۵۵۰ ق م تا ۳۳۰ ق م) کے کتبے جو داریوش اعظم (۵۲۱ ق م - ۴۸۵ ق م) اور اس کے جانشینوں کے حکم سے کوہ بے ستون اور پرسی پالس (Persi polis) (تخت جمشید) میں کندہ کیے گئے، قدیم فارسی

کا نمونہ ہیں۔ یہ ہخامنشی دور کا تحریری سرمایہ تھا، جن میں آہوراز مزدا (خالق کائنات) کی مدح و ثنا کی گئی ہے، اپنی فتوحات کو اس کی مہربانی کا نتیجہ بتایا گیا ہے اور آئندہ کے لئے اسی سے مدد مانگی ہے۔ ان کتبوں میں برائیوں سے بچنے اور سیدھے راستے پر چلنے کی تلقین کی گئی ہے۔ بعض کتبوں میں ان مفتوحہ ممالک کا ذکر آیا ہے جہاں حکومت ایران کے قوانین نافذ ہوئے یا جہاں سے حکومت ایران کو خراج وصول ہوتے رہے۔ بعض کتبوں میں شاہی تعمیرات کی کیفیت، سامان تعمیر کی مختلف ممالک سے درآمد اور کاریگروں کے حق الخدمت کا ذکر ہے۔[۳۶]

اشکانیوں کے دور (۲۵۰ ق م تا ۲۲۵ ق م) میں ہخامنشی دور کی فارسی قدیم کی جگہ زبان پہلوی، پورے ملک میں رائج ہوئی۔ اس طویل عہد میں زردشت کی کتاب اوستا کے علاوہ اور کسی کتاب کی نشاندہی نہیں ہوتی۔ اصل اوستا تو ہخامنشی عہد کے آخر میں سکندر کے حملے (۳۳۰ ق م) میں ضائع ہوگئی۔ اشکانی دور میں موبدوں نے زبانی یادداشتوں کی مدد سے اوستا از سر نو مرتب کی جو پانچ جلدوں (۱) یسنا (۲) ویسپرد (۳) وندیداد (۴) یشت اور (۵) خردہ اوستا میں ہے۔[۳۷]

ساسانیوں سے ایران کی تاریخ کا تیسرا دور (۲۲۶ء تا ۶۵۳ء) شروع ہوتا ہے جو کئی اعتبار سے شاندار ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی بھی ہے، ساسانیوں نے اشکانیوں کے ملوک الطوائف کو ختم کر کے ایک مستحکم حکومت قائم کی اور اشکانی تہذیب کے رہے سہے یونانی اثرات کو مٹا کر قدیم ایرانی روایات کو دوبارہ زندہ کیا۔ ساسانیوں نے مادی اعتبار سے ترقیاں کیں، تعمیرات اور علوم وفنون کے حوالے سے یہ دور بہت اہم ہے۔

ساسانی دور میں کئی مذہبی کتابیں لکھی گئیں۔ دو خاص مشہور ہیں ۱۔ دین کرت (یعنی اعمالِ دین)۔ یہ زرتشتی عقائد، احکام اور اوامر، آداب و رسوم اور زرتشت سے متعلق قصوں پر مشتمل ہے۔ ۲۔ بندھشن (یعنی آفرینش) اس میں آفرینش کائنات، اہرمن کی روگردانی اور وصف مخلوقات کا بیان ہے۔[۳۸]

ایرانیوں کے پیغمبر "مانی" سے سات کتابیں منسوب ہیں جو ایک نئے رسم الخط

میں ہیں جس کا بانی خود مانی تھا۔ یہ خط سریانی اور فارسی کے بین بین تھا۔ ان کتابوں میں سے اب کوئی بھی موجود نہیں البتہ ان کے اقتباسات مسلم مؤرخین کی کتابوں اور پہلوی تصانیف میں مل جاتے ہیں۔ ۳۹

ان کی دیگر مذہبی کتابوں میں ''خسرو کاوتان وریتک'' (اشراف کی تعلیمات سے متعلق) اور کلیلہ ودمنہ بھی اہم ہیں، آخر الذکر کتاب میں جانوروں کی زبان سے سیاسیات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اصل کتاب سنسکرت میں تھی، جس کا حکیم برزویہ نے سنسکرت سے پہلوی میں ترجمہ کیا۔

غیر دینی کتابوں میں ''کارنامک ارتخشتر پاپکان'' اور ''یاتکار زریران'' جسے شاھنامہ گشتاسپ بھی کہتے ہیں، خاص طور پر اہم ہیں۔ ساسانی عہد میں پہلوی کی ترانوے کتابوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن میں سیاسی، دینی و اخلاقی موضوعات پر اور گیارہ غیر دینی موضوعات پر لکھی گئیں۔ نوشیروان (۵۳۱ء ۔ ۵۷۹ء) کے زمانے میں متعدد کتابیں یونانی اور سنسکرت سے پہلوی میں ترجمہ ہوئیں جو ایرانیوں کی دانش میں اضافہ کرنے کا موجب بنیں۔ ۴۰

اسلامی دور سے قبل ہخامنشیوں، اور اشکانیوں کی شہنشاہی کے زمانے میں مدارس اور تربیتی ادارے زیادہ تر دولت مندوں اور اونچے طبقے کے لوگوں تک محدود رہتے تھے، ان درسگاہوں اور تربیت گاہوں میں عموماً آئین، لکھنا پڑھنا، حساب، وزن اور مقداریں، تاریخ، ادب، اسپ سواری شکار، چوگان (پولو) اور مختلف اسلحے کا استعمال شامل تھا۔ اعلیٰ تعلیم مثلاً دبیری، طب اور نجوم کے لئے مخصوص نصاب رائج تھے۔ ساسانیوں کی سلطنت کے زمانے میں خوزستان میں جندی شاپور کی درسگاہ صدیوں تک دنیا کے اہم مراکز میں شمار ہوتی رہی۔ یہ یونیورسٹی تیسری صدی ہجری کے آخر تک قائم تھی۔ خصوصاً جب نسطوری فرقے کے لوگ جندی شاپور آ کر آباد ہوئے تو یہاں علمی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔

نسطوری ایک مسیحی فرقہ تھا، جسے ۴۲۸ء میں قسطنطنیہ کے بطریق نسطوریوس نے قائم کیا۔ بعد میں انہیں زندیق قرار دے کر ایران کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔ ایران میں اس

وقت ساسانیوں کی حکومت تھی۔ انہوں نے نسطوریوں کا استقبال کیا۔ انہی نسطوری علماء کی وجہ سے ایران کا شہر جندی شاپور علوم کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

جندی شاپور، ایران کے موجودہ شہر اہواز کے قریب واقع تھا۔ اس کی تاریخ بہت پرانی ہے، جو زمانہ قبل از تاریخ تک پہنچتی ہے، اس وقت اس کو "جنتا شاپیرتا" (Genta Shapirta) یعنی "حسین باغ" کہا جاتا تھا۔ اہم تیسری صدی عیسوی کے اواخر میں دوسرے ساسانی بادشاہ، شاپور اول نے بازنطینی شہنشاہ والریان (Valerian) کو شکست دینے اور انطاکیہ (Antioch) کو فتح کر لینے کے بعد دوبارہ اس شہر کی بنیاد رکھی۔ ایرانی بادشاہ کی خواہش تھی کہ جندی شاپور کو علمی مرکز کی حیثیت سے انطاکیہ سے بالاتر بنا دے، اسی لئے اس کا نام "ایہاز اَدنوی شاہ پور" (Ehaz Adnevi Shahpur) رکھا جس کا مطلب ہے "شاہ پور، انطاکیہ سے بہتر ہے" بعد میں یہ شہر "جندی شاپور" کے نام سے مشہور ہوا۔ شاپور دوئم نے یہاں ایک یونیورسٹی کی بنیاد رکھی، جس میں ایک بیمارستان (Hospital) بھی قائم کیا گیا، جلد ہی یہ شہر علوم وفنون کا مرکز بن گیا۔

جب جسٹینین (Justinian) نے ۵۲۹ء میں ایتھنز میں فلسفے کے مکاتب بند کر دیئے تو یونانی اہل علم کی ایک بہت بڑی تعداد نے ایتھنز کو خیر باد کہہ کر جندی شاپور کا ہی رخ کیا۔ ۴۴ یہ مشہور ساسانی بادشاہ کسریٰ نوشیروان (Chosroes) کا زمانہ (۵۳۱ء۔ ۵۷۹ء) تھا۔ اسی نے افلاطون کے فلسفۂ جدید کے حاملین کو پناہ دی تھی، جس نے جندی شاپور کو اپنے زمانے کا اہم علمی مرکز بنا دیا تھا۔

اسلام اور علمی تحریک:

بعثت نبوی کے بعد علوم وفنون کی جو سرگرمی نظر آئی اس سے نہ صرف عرب بلکہ معلوم دنیا بھی پہلے پہل آشنا ہوئی۔ اسلام خود جہالت کی ضد ہے، یہ ایک ایسا دین ہے جس میں حصول علم کو عبادت کا درجہ دیا گیا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے لئے جو شناخت سب

سے زیادہ پسند کی وہ ''معلم'' کی شناخت تھی۔ قرآن میں لفظ ''علم'' مختلف مشتق صورتوں میں ۷۷۸ مرتبہ آیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا قطعاً مشکل نہیں کہ اسلام میں علم کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، جس بنیاد پر انسان کو فرشتوں پر تفوق عطا کیا گیا، وہ ''علم الاشیاء'' ہی تھا۔ پہلی وحی بھی ''اقراء'' سے ہی شروع ہوتی ہے۔ اسی مناسبت سے اسلامی تعلیمات کا وہ مجموعہ جو ارشادات الٰہی پر مبنی ہے اسے ''قرآن'' یعنی پڑھا جانے والا قرار دیا گیا۔ قرآن میں بار بار انسان کو تفکر و تدبر کی دعوت دی گئی ہے۔ آیات الٰہی جو کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں، قرآن میں ان کے مشاہدے پر زور دیا گیا ہے، چنانچہ بحر و بر اور ارض و سماوات کے حقائق کے مطالعے اور تحقیق کی بار بار تاکید آئی ہے۔ قرآن کے بعد احادیث میں بھی حصول علم کی بہت تاکید آئی ہے۔ اس ضمن میں سینکڑوں احادیث مروی ہیں، ۳۳ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، تاہم ان تعلیمات نے یہ بات صراحتاً بیان کر دی کہ اسلام میں حصول علم اور تعلیم و تعلم سے بڑا کوئی وظیفہ نہیں۔ علم کی طلب کو عین عبادت بتانا، علما کو انبیا کا وارث قرار دینا اور علم کو دین کا ستون بتا کر مسلمان مرد و عورت، آزاد و غلام سب کو حصول علم کی طرف راغب کرنا، صرف راغب کرنا ہی نہیں بلکہ اسے ہر فرد پر فرض قرار دینا، صرف اور صرف اسلام کی اولیت اور خصوصیت ہے۔

قرآن و حدیث کی ان تعلیمات نے دنیا کی سب سے بڑی علمی تحریک کو جنم دیا جس نے مسلمانوں کو صدیوں، دنیائے علوم و فنون کا بے تاج بادشاہ بنائے رکھا۔ جہاں تک پہلی صدی ہجری کا تعلق ہے تو اس صدی میں مسلمانوں کے دو ہی شوق نمایاں نظر آتے ہیں، جہاد اور حصول علم۔ ایک لمبی فہرست ان مسلمانوں کی ہے جو صاحب سیف بھی تھے اور صاحب قلم بھی۔ یہ درست ہے کہ ابتدائی طور پر مسلمان علوم قرآن وحدیث سے ہی وابستہ رہے، لیکن نصف صدی بھی نہیں گزری تھی کہ اسی قرآن وحدیث کے علم نے علوم طبیعی کے دروازے مسلمانوں پر کھول دیے۔

اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کا رویہ انتہائی عملی رہا، آپؐ نے صرف وعظ و تلقین سے ہی کام نہیں لیا بلکہ عملی اقدامات کیے، مثلاً رسول اللہ ﷺ جب مدینہ آئے تو زید بن ثابت انصاری کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا تا کہ یہودیوں سے لکھت پڑھت میں آسانی رہے۔ ۳۴

جنگ بدر کے موقع پر ان اسیرانِ جنگ کا فدیہ، جو زرِ فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے، یہ مقرر کیا کہ وہ مدینہ کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ ۲۵؎ اس طرح مدینے میں کئی مدرسے کھل گئے، ہر مدرسہ کا استاد جنگ بدر کا قیدی تھا، جس کے پاس مدینے کے دس بچوں کا حلقۂ درس ہوتا۔

اس کے علاوہ کچھ نجی مدرسے بھی کھل گئے تھے، مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں میں بھی حصول علم کی تحریک جنم لے چکی تھی، لہٰذا بعض خواتین کی فرمائش پر رسول اللہ ﷺ نے ہفتے میں ایک دن خواتین کی تعلیم کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ زیر نظر عہد کی سب سے بڑی درسگاہ مسجد نبوی تھی، جہاں کے معلم خود رسول اللہ ﷺ تھے۔ اصحاب صفہ، مستقل طلبہ کی صورت میں وہیں قیام پذیر رہتے۔ ان کا واحد شوق حصول علم تھا۔ صفہ میں جو تعلیم ہوتی تھی وہ اسلام کی ابتدائی تعلیم تھی۔ ان کا اہم موضوع قرآن تھا، اس کے علاوہ وہ کتابت بھی سیکھتے تھے۔ نازل شدہ آیات قرآن اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث حفظ کرتے اور فقہی مسائل سے آگاہی بھی حاصل کرتے۔

مسجد نبوی عہد رسالت کا واحد مدرسہ نہ تھا بلکہ بلاذری اس دور میں نو مساجد کا پتا دیتا ہے، جو صرف مساجد ہی نہ تھیں بلکہ مدرسے بھی تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے بعض اوقات تعلیمی وفود بھی روانہ کیے۔ اس طرز کا پہلا علمی وفد آپؐ نے اس وقت بھیجا تھا جب ابھی آپؐ نے ہجرت نہیں کی تھی اور مکہ ہی میں تھے۔ بیعت عقبہ اولیٰ کے بارہ افراد جب مدینہ واپس ہو گئے تو انہوں نے وہاں سے ایک خط رسول اللہ ﷺ کو بھجوایا کہ ہمارے پاس ایک ایسے شخص کو بھیجیں جو یہاں قرآن پڑھائے اور دین کی تعلیم دے۔ اس مقصد کے لئے رسول اللہ ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو معلم بنا کر بھیجا، جن کی کوششوں سے انصار کے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ ۲۶؎ اہل مدینہ آپ کے کام کی مناسبت کی وجہ سے آپ کو اَلْمُقْرِئ (پڑھانے والا، استاد) کہا کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ نے بیعت عقبہ میں مسلمان ہونے والے اہل مدینہ کو اس وقت تک نازل شدہ قرآن کا ایک تحریری نسخہ بھی دیا تھا جسے انصار اپنے محلے کی مسجد میں باآواز بلند

پڑھا کرتے تھے۔ ۴۷

ہجرت کے بعد ۴ھ میں ایسے دو تعلیمی وفود کا پتا چلتا ہے، جنہیں رسول اللہ ﷺ نے بعض قبائل کی خواہش پر روانہ کیا۔ اس سال کی ابتدا میں رسول اللہ ﷺ نے ایک چھ رکنی تعلیمی وفد مرثد بن ابی مرثد غنوی کی سرکردگی میں بنو عضل و قارہ کی درخواست پر ان کی طرف روانہ کیا۔ ۴۸ لیکن مقام رجیع پر ان کے ساتھ سخت دھوکا کیا گیا اور چار کو وہیں اور دو کو مکہ لے جا کر شہید کر دیا گیا۔ ۴۹

اسی سال ماہ صفر میں ایک خاصا بڑا تعلیمی وفد منذر بن عمرو انصاری کی سرکردگی میں اہل نجد کو قرآن کی تعلیمات دینے کے لئے بھیجا۔ ایک روایت کے مطابق اس میں چالیس اور ایک دوسری روایت کے مطابق اس وفد میں ستر افراد شامل تھے، اسی وفد میں عامر بن فہیرہ، موالی ابو بکر صدیقؓ بھی شامل تھے۔ ۵۰ لیکن بئر معونہ کے مقام پر اس وفد کے تمام شرکا کو دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔ ۵۱ صرف ایک صحابی بچ سکے۔

یہ مسلمانوں کے دو انتہائی بڑے نقصانات تھے، کیونکہ یہ سب صحابہؓ اس وقت تک کے نازل شدہ قرآن کے بیشتر حصے کے حافظ تھے۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے تعلیمی وفود روانہ کرنے کا سلسلہ فوراً بند کر دیا تاہم اسلام کی شوکت کے زمانے میں (یعنی فتح مکہ کے بعد) اس بات کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ مختلف قبائل اپنے وفود مدینہ بھیجیں، رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کریں اور دین اسلام کی بنیادی تعلیمات حاصل کریں۔ چنانچہ ۹ھ میں عرب کے طول و عرض سے وفود مدینہ حاضر ہوئے۔ وفود اس کثرت سے آئے کہ یہ سال ''عام الوفود'' کہلانے لگا۔ ان وفود کو سرکاری مہمان کی حیثیت دی جاتی، ان کے قیام و طعام کا بندوبست کیا جاتا، قرآن کی تعلیم دی جاتی، اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آگاہ کیا جاتا، اور اس دوران وہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا بھی مشاہدہ کرتے۔ صرف آنے والے بدوی قبائل ہی نہیں سیکھتے تھے بلکہ قیاس ہے کہ اہل مدینہ بھی ان سے خصوصاً زبان کا علم حاصل کرتے ہوں گے۔ ۵۲

نومسلموں اور مفتوحہ علاقوں کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کا رسول اللہ ﷺ نے

ہمیشہ خیال رکھا اور عملی اقدامات کیے، چنانچہ فتح مکہ کے بعد آپ نے اہل مکہ کو حلال وحرام کی تعلیم دینے اور قرآن کی تعلیم عام کرنے کے لئے حضرت معاذ بن جبل ۵۳ کو مکہ میں چھوڑا تھا جو سب سے زیادہ حلال وحرام کا علم رکھتے تھے۔ جب یمن میں ہر جگہ اسلام پھیل گیا تو انہی معاذ کو مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ یمن بھیجا گیا تاکہ وہاں کے لوگوں کو دین کی تعلیم دیں۔۵۴ اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ان کے مقدمات فیصل کریں۔ وہ یمن کے علاوہ الجند میں رسول اللہ ﷺ کے مبلغ رہے۔

رسول اللہ ﷺ کی اس حکمت عملی کو بعد میں خلفائے راشدین نے جاری رکھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد سے عظیم تر فتوحات کا آغاز ہوا اور یہ سلسلہ عہد عثمانؓ تک مسلسل جاری رہا۔ ان فتوحات کے نتیجے میں عراق، ایران، خراسان، بجستان، شام اور المغرب کے وسیع علاقے مملکت اسلامیہ میں شامل ہوئے اور بہت سے غیر عرب اسلام لاکر عربوں کے ساتھ حلف وولاء میں داخل ہوئے، یوں موالی کی ایک کثیر تعداد مملکت اسلامیہ کی رعایا بنی جن کو قرآنی تعلیمات سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔ حضرت عمرؓ نے بحیثیت خلیفہ اس کا خصوصی انتظام کیا۔ مفتوحہ علاقوں اور نئے آباد ہونے والے شہروں میں رسول اللہ ﷺ کے ان اصحاب کو بھیجا جو عالم قرآن تھے تاکہ وہاں کے لوگوں کو اسلام کی تعلیمات دیں، چنانچہ یزید بن ابوسفیانؓ کی درخواست پر آپ نے معاذ ابن جبلؓ، عبادہ بن صامت انصاریؓ ۵۵ اور ابودرداء انصاریؓ ۵۶ کو شام کے صوبوں حمص، دمشق اور فلسطین بھیجا۔ ان تینوں اصحاب رسولؐ کی حیثیت قاضی اور معلم کی تھی۔ ۵۷ اور یہی شام کے دینی مدرسہ کے مؤسس وبانی تھے۔

عراق کی فتوحات کے بعد جب کوفہ اور بصرہ کے نئے شہر آباد کیے گئے تو اسی مقصد کے تحت حضرت عمرؓ نے وہاں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ۵۸ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ۵۹ کو روانہ کیا، حضرت عمرؓ نے جب حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کو کوفہ بھجوایا تو اہل کوفہ کو لکھا ''قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں! میں نے ابن مسعود کے سلسلے میں تم کو اپنے اوپر ترجیح دی ہے لہٰذا تم لوگ ان سے علم حاصل کرو۔'' ۶۰ حضرت قرظہ بن کعبؓ بھی ان لوگوں میں

شامل تھے، جنھیں قرآن کی تعلیم کے لئے عراق روانہ کیا گیا تھا۔ ۶۱ جن لوگوں کو اہل بصرہ کی تعلیم کے لئے بصرہ روانہ کیا گیا ان میں ایک حضرت عمران بن حصینؓ ۶۲ تھے، جو صحابہ کے طبقہ اول سے تعلق رکھتے تھے۔ ۶۳

حضرت عمرؓ جب کسی کو کسی علاقہ کا گورنر یا عامل بنا کر بھیجتے تھے تو ان کے فرائض منصبی میں یہ شامل ہوتا کہ وہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں۔ ۶۴ بحیثیت خلیفہ وہ خود بھی اس فرض سے غافل نہ رہتے تھے۔ چنانچہ بعض اوقات اہل العالیہ (یعنی بالائی مدینے) کے حارہ (محلّہ کے لوگوں) کو بلاتے اور انہیں خود اسلامی عقائد و عبادات کی تعلیم دیتے۔ اس طرح کہ کوئی اہم مسئلہ رہ نہ جاتا۔ ۶۵

حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں اسلامی حکومت نے مسلمانوں اور نومسلموں کی تعلیم کا جو بندوبست کیا وہ زیادہ تر تفسیر، حدیث، فقہ اور سیرت پر مشتمل تھا تاہم شاعری، انساب اور ایام العرب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ چنانچہ عقیل بن ابی طالب، جو کہ ماہر نساب تھے، مسجد نبوی میں انساب اور ایام العرب کا درس دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ جاہلیت کی عربی شاعری کے مطالعہ کی حوصلہ افزائی کرتے تھے تاکہ قرآن فہمی میں آسانی ہو۔ اس دور میں بھی مدرسے الگ نہیں تھے۔ تعلیم عموماً مسجدوں میں ہی دی جاتی تھی۔ حضرات عمرؓ و عثمانؓ کے دور خلافت میں موذنوں، ائمہ مساجد اور معلمین کے باقاعدہ ماہانہ وظائف جاری کیے گئے۔ یہاں تک کہ قرآن سیکھنے والے بعض طلبہ کے لئے بھی وظائف مقرر کیے گئے، تاکہ وہ ذوق و شوق سے قرآن کی طرف متوجہ ہوں۔ ۶۶

خلافت راشدہ کے بعد جب اموی خلافت کا دور آیا تب بھی علوم وفنون کی سرپرستی اور ترویج کا یہی عالم تھا، بلکہ خلافت راشدہ کی حد تک علوم کا محور قرآن تھا اور علما کی زیادہ تر دلچسپی علوم القرآن تک رہی، جبکہ اموی عہد میں علوم کا دائرہ وسیع ہوا اور علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ علوم عقلیہ کی طرف بھی خصوصی توجہ دی گئی اور تراجم کا کام بھی شروع ہوا۔ علم طب، کیمیا، تاریخ، صرف ونحو، شعر و لغت کی طرف بھی توجہ دی گئی۔

اس نکتے کو ذہن میں رکھنا چاہئے کہ پہلی صدی ہجری کے حالات علوم وفنون کی ترقی کے لئے کوئی بہت مثالی نہیں تھے۔ اسی صدی میں نوزائیدہ اسلامی ریاست کو ارتداد کی تحریکوں سے نبٹنا پڑا، فتوحات کا ایک طویل سلسلہ چلا اور مسلمان کم از کم تین مرتبہ بڑی خانہ جنگیوں میں مبتلا ہوئے۔ ان حادثات و واقعات کے باوجود اس صدی میں علمی حرکت نظر آتی ہے۔ جس میں خلفائے راشدین و بنوامیہ کا بھی معتدبہ حصہ تھا۔

ولید بن عبدالملک کے دور میں فتوحات کی تیسری لہر آئی جس کی وجہ سے مملکت اسلامیہ وسعت کے اعتبار سے اپنی انتہائی حد کو پہنچ گئی۔ لہٰذا مفتوحہ ممالک میں قرآنی علوم سے نومسلموں کو کماحقہ آگاہ کرنے کے لئے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بھی علما اور فقہا کو مختلف علاقوں کی طرف روانہ کیا اور اب چونکہ موالی بھی کثرت سے علوم کی دنیا میں نظر آرہے تھے، لہٰذا مفتی، واعظ اور معلمین کے تقرر میں حضرت عمر نے بھی عرب و موالی میں کبھی کوئی تخصیص نہیں کی۔ چنانچہ نافع ۶۷ے مولیٰ عبداللہ ابن عمر جو کہ مدینہ کے فقیہ تھے، ان کو مصر بھیجا کہ وہاں کے لوگوں کو علم الحدیث کی تعلیم دیں، اس حیثیت سے نافع نے کافی عرصے مصر میں قیام کیا۔

اسی طرح اہل بصرہ کے لئے انہوں نے حضرت حسن بصری کو (جو کہ موالی تھے) کافی قرار دیا۔ لوگوں کی رشد و ہدایت کے لئے تمام ممالک اسلامیہ میں واعظ و مفتی مقرر کیے چنانچہ حلاج ابوکثیر اموی کو، جو ان کے باپ کے موالی تھے، اسکندریہ کا واعظ مقرر کیا۔

پہلی صدی ہجری کے مسلمان خلفا، خواہ ان کا تعلق خلافت راشدہ سے ہو یا خلافت امویہ سے، سب کے سب عرب تھے اور علوم وفنون کے دلدادہ تھے۔ پہلے اموی خلیفہ حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دن بھر خلافت کے کاموں میں مشغول رہنے کے بعد رات کو عبید بن شریہ سے قصص عرب سنتے تھے اور ان کی تقریباً تہائی رات عرب فرمانرواؤں اور ان کے سیاسی و فوجی حالات سے متعلق واقعات سننے میں بسر ہو جاتی تھی۔ ان کے پسندیدہ موضوعات عربوں اور غیر عربوں کے قدیم تعلقات، ان کے بادشاہوں، ان کی سلطنتوں، جنگوں اور نظم مملکت کے حالات تھے۔ ۶۸ اس سلسلے میں حضرت معاویہؓ نے عبید بن

شریہ جرہمی کو صنعاء (یمن) سے بلوایا تھا اور انہی کی خواہش پر اس نے تاریخ پر اپنی کتاب کتاب الملوک و اخبار الماضیین لکھی۔ اس کی ایک اور کتاب کتاب الامثال تھی۔ ۶۹ے حضرت معاویہؓ ہی کی خواہش پر ایک عیسائی عالم ابن آثال نے طب کی کچھ کتابیں عربی میں ترجمہ کیں۔ ۷۰ے

خالد ابن یزید بن معاویہ ایک فاضل آدمی تھا اور علوم سے اہتمام اور تعلق خاطر رکھتا تھا۔ اس کے دل میں کیمیا کے خیال نے کروٹ لی تو ان یونانی فلاسفہ کے ایک گروہ کو بلا بھیجا جو مصر میں اقامت پذیر تھا اور عربی میں فصیح اللسان مانا جاتا تھا، انہیں کیمیا کے موضوع پر مشتمل کتب کو یونانی اور قبطی زبان سے عربی کے قالب میں ڈھالنے پر مامور کیا۔ ۷۱ے اس نے ایک دارالترجمہ قائم کیا تھا، جس میں ایک پادری اہرن نامی نگرانی پر مامور تھا۔ ابن الندیم ان تراجم کو عہد اسلامی کے اولین تراجم مانتا ہے۔ اس اعتبار سے خالد وہ پہلا شخص ہے جس کے لئے طب، نجوم اور کیمیا کے موضوعات سے متعلق کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ وہ خود بھی مصنف تھا۔ ابن الندیم نے الفہرست میں اس کی چار کتابوں کے نام دیے ہیں، یعنی

۱۔ کتاب الحرارات

۲۔ کتاب الصحیفة الکبیر

۳۔ کتاب الصحیفة الصغیر

۴۔ کتاب وصیته الیٰ ابنه فی الصنعة ۷۲ے

مروان بن حکم کی خواہش پر ماسرجویہ یہودی نے اہرن کی قراباذین کو عربی میں منتقل کیا۔ ۷۳ے

عبدالملک بن مروان کے عہد میں عربی زبان کا رواج بڑھا مگر یہ علمی سے زیادہ انتظامی اقدام تھا، اس نے بیشتر دیوان عربی زبان میں منتقل کیے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خدمات علم حدیث کے سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے جب دیکھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ علما کا گروہ روز بروز گھٹتا جا رہا ہے اور اس کے

ساتھ علوم شرعیہ کے مٹ جانے کا بھی اندیشہ ہے تو انہوں نے مکہ مدینہ سمیت دیگر صوبوں کے گورنروں کو یہ حکم بھیجا کہ احادیث نبویہ کی تلاش کر کے انہیں محفوظ کر لیا جائے۔ چنانچہ احادیث کے مجموعے مرتب ہوئے۔ حضرت عمر ثانی نے سعد بن ابراہیم ۴؎ سے، جو مدینہ کے قاضی اور بہت بڑے محدث تھے، کثیر احادیث لکھوائیں اور یہ نوشتے تمام ممالک محروسہ میں بھیجے۔ اسی طرح ابوبکر محمد بن عمرو بن حزم انصاری کو بھی جو اس زمانے کے عظیم محدث امام زہری کے استاد اور مدینہ کے قاضی تھے، خاص طور پر احادیث کو جمع کرنے کا حکم بھیجا۔ یہ دونوں حضرات عرب تھے۔ ۵؎

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فنِ مغازی کی طرف بھی خاصی توجہ دی اور حکم دیا کہ غزوات نبوی کا خاص حلقۂ درس قائم کیا جائے۔ عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری (م ۱۳۱ھ) کو، جو اس فن میں خاص کمال رکھتے تھے، حکم دیا کہ جامع دمشق میں بیٹھ کر لوگوں کو مغازی کا درس دیں۔ یہ بھی عرب تھے۔

اسی زمانے میں امام زہری ۶؎ نے حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی ہدایت کے مطابق سیرۃ و مغازی پر کتاب لکھی۔ ۷؎

عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں حاملین علم زیادہ تر عرب تھے، اموی عہد میں ہمیں موالی بھی علوم و فنون کی ترویج میں قابل ذکر حصہ لیتے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں مؤرخین کی مختلف آرا ہیں۔

۱۔ ابن خلدون کا خیال ہے کہ علم کی تعلیم دینا ایک صنعت ہے اور صنعتیں شہروں میں پروان چڑھتی ہیں۔ ۸؎ لہٰذا علم سے موالی کا تعلق زیادہ گہرا ہوا کہ ان کا پس منظر شہری تھا جبکہ عرب جو اُن مفتوحہ علاقوں میں بسے اہل البادیہ تھے اور صنعتوں سے دور تھے۔ ابن خلدون کہتا ہے:

"علم و فن سے عربوں کو کوئی علاقہ نہ تھا کیونکہ علوم و فنون ایسے ملکات کا نام ہے جو تعلیم کے محتاج ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ بھی "صنعت" ہی کے حکم میں ہوتے ہیں اور عرب جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں صنعت سے بہت دور تھے، اسی وجہ

ے علوم وفنون ہمیشہ شہری رہے ہیں اور عرب، علوم وفنون کے بازاروں سے ہمیشہ دور رہے۔ شہری اس زمانے میں عجمی ہی تھے یا آزاد شدہ غلام جو دراصل عجمی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حاملین، علم اسلام میں بھی زیادہ تر عجمی ہی تھے، یا وہ لوگ رہے جن کی تربیت عجم میں ہوئی تھی اور جن کی زبان خالص عرب نہیں رہی تھی۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم کی حفاظت اور تدوین کے لئے سب سے پہلے عجمی ہی اٹھے۔"۷۹

یہ ایک جانبدارانہ اور یکطرفہ تجزیہ ہے کیونکہ سارے ہی عرب اہل البادیہ نہیں تھے، جیسا کہ اسی باب کے ابتدائی صفحات میں بیان کیا گیا کہ عرب جو شہروں میں آباد تھے، ان کے علوم وفنون کی ترقیاں کسی طور بھی دیگر ہم عصر متمدن تہذیبوں سے کم نہیں تھیں، البتہ وسطی عرب کے رہنے والوں کا اس ترقی میں کافی کم اور اہل البادیہ کا اس ترقی میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ اب سارے عربوں کو اہل البادیہ پر قیاس کرنا قرین انصاف نہیں ہے۔ عربوں میں لکھنے پڑھنے کی صلاحیت کو قدر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ معاشرے میں ایسے افراد کی بڑی عزت ہوتی تھی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اہل مدینہ ان افراد کو "کامل" کے لقب سے پکارتے تھے جن کو تیراکی، تیراندازی اور لکھنا پڑھنا آتا تھا۔ پھر جب اسلام آیا اور اس نے علم کو فوق الکل اہمیت دی تب تو مسلمان خواہ حضری ہوں یا بدوی، اس کو حقارت کی نظر سے دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ احمد امین المصری کا یہ کہنا درست ہے کہ "ابن خلدون نے اپنے اس نظریے (اوپر بیان کیے گئے نظریے) میں کسی قدر غلو سے کام لیا ہے اور عربوں سے ان کا وہ حصہ بھی چھین لیا جو علمی مشارکت میں ان کو حاصل تھا۔"۸۰

صرف ابن خلدون نے نہیں بلکہ کئی مؤرخین نے ایسا کیا ہے کہ عربوں سے ان کا جائز حق بھی چھین لیا ہے۔ ہوسکتا ہے اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ اموی عہد کی تاریخ، عباسی عہد میں لکھی گئی جبکہ سیاست ومعاشرت پر موالی چھائے ہوئے تھے اور عباسی حکومت زیادہ تر ایک عجمی یا خراسانی حکومت تھی۔ اس ماحول میں عربوں یا امویوں کی جانبدارانہ تصویر کشی عین ممکن

تھی چنانچہ اس قسم کے بعض واقعات جو عقد الفرید وغیرہ میں ملتے ہیں، تعصب پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً عقد الفرید میں ہے کہ:

''ابن ابی لیلیٰ نے کہا کہ مجھ سے عیسیٰ بن موسیٰ نے پوچھا اور یہ بڑا دیندار اور متعصب تھا، کہ بصرہ کا فقیہ کون ہے؟ میں نے کہا حسن ابن ابی الحسن۔ عیسیٰ نے پوچھا کہ پھر کون ہے؟ میں نے کہا محمد ابن سیرین۔ پوچھا کہ یہ دونوں کون ہیں؟ میں نے کہا دونوں موالی ہیں۔ پھر پوچھا کہ اچھا مکہ مکرمہ کا فقیہ کون ہے؟ میں نے کہا عطاء بن ابی رباح، مجاہد، سعید ابن جبیر اور سلیمان ابن یسار۔ کہنے لگا یہ سب کون ہیں؟ میں نے کہا کہ یہ سب موالی ہیں۔ کہنے لگا کہ اچھا مدینہ منورہ کے فقہا کون ہیں؟ میں نے کہا کہ زید ابن اسلم، محمد بن المنکدر اور نافع بن ابی نجیح، کہنے لگا کہ یہ کون ہیں؟ میں نے کہا کہ یہ سب بھی موالی ہیں۔ میرے یہ کہنے پر عیسیٰ بن موسیٰ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ پھر کہنے لگا اچھا اہل قبا میں سب سے بڑا فقیہ کون ہے؟ میں نے کہا کہ ربیعۃ الرائی اور ابن ابی الزناد، کہنے لگا کہ یہ دونوں کون ہیں؟ میں نے کہا کہ یہ دونوں بھی موالی ہیں تو اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ پھر کہنے لگا کہ اچھا یمن کا فقیہ کون ہے؟ میں نے کہا طاؤس ابن طاؤس اور ابن منبہ۔ کہنے لگا یہ تینوں کون ہیں؟ میں نے کہا یہ سب موالی ہیں، تو عیسیٰ کی گردن کی رگیں پھول گئیں اور وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر کہنے لگا اچھا خراسان کا فقیہ کون ہے؟ میں نے کہا کہ عطا بن عبداللہ خراسانی۔ کہنے لگا یہ عطا کون بزرگ ہیں؟ میں نے کہا یہ بھی موالی ہیں، تو اس کے چہرے کی سرخی اور تیز بلکہ سیاہ ہوگئی، حتیٰ کہ مجھے اس کے چہرے سے ڈر لگنے لگا پھر کہنے لگا اچھا شام کا فقیہ کون ہے؟ میں نے کہا مکحول۔ بولا کہ یہ مکحول کون ہے؟ میں نے کہا یہ بھی ایک غلام ہے، اس کے بعد تو اس کا سانس چڑھ گیا اور اوپر ہی آنے لگا۔ اس کے بعد بولا کہ اچھا کوفہ کا فقیہ کون ہے؟ بخدا اب اگر مجھے اپنی جان کا خطرہ نہ

ہوتا تو میں حکم بن عتبہ اور حماد بن ابی سلیمان کا نام لیتا، لیکن میں نے دیکھا کہ اب وہ بدی پر آمادہ تھا، تو میں نے کہا کہ ابراہیم نخعی اور شعبی۔ کہنے لگا یہ دونوں کون ہیں؟ میں نے کہا کہ دونوں عرب ہیں، تو عیسیٰ بن موسیٰ نے بلند آواز سے اللہ اکبر کہا اور اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔" [۸۱]

یہ روایت جتنی مشہور ہے، اتنی ہی غلط بھی ہے۔ عیسیٰ بن موسیٰ، پہلے عباسی خلیفہ السفاح (۱۳۲ھ۔۱۳۷ھ) کا بھتیجا اور ابوجعفر المنصور کے بعد ولی عہد سلطنت تھا۔ منصور (۳۷ھ۔۱۵۸ھ) کی طرف سے وہ کوفہ کا والی تھا (۱۳۷ھ۔۱۴۷ھ)۔ آخری سال میں اسے ولی عہدی اور کوفہ کی ولایت سے معزول کر دیا گیا، ظاہر ہے کہ العقد الفرید کی مندرجہ بالا روایت کا تعلق ۱۳۷ھ۔۱۴۷ھ سے ہوگا۔ اب جن فقہا کے نام گنوائے گئے ہیں کہ اس زمانے میں اپنے اپنے شہروں کے امام فقہ تھے، ان کے سنین وفات یہ تھے:

۱۔ حضرت حسن بصری، متوفی ۱۱۰ھ

۲۔ حضرت محمد ابن سیرین، متوفی ۱۱۰ھ

۳۔ حضرت عطاء بن ابی رباح، متوفی ۱۱۴ھ

۴۔ حضرت مجاہد، متوفی ۱۰۲ھ

۵۔ حضرت سعید بن جبیر، متوفی ۹۴ھ

۶۔ حضرت سلیمان ابن یسار، متوفی ۱۰۷ھ

۷۔ حضرت زید بن اسلم، متوفی ۱۳۶ھ

۸۔ حضرت محمد بن منکدر، متوفی ۱۳۰ھ

۹۔ حضرت نافع، متوفی ۱۱۷ھ

۱۰۔ حضرت ربیعہ الرائی، متوفی ۱۳۶ھ

۱۱۔ حضرت طاؤس، متوفی ۱۰۶ھ

۱۲۔ حضرت ابن معبہ، متوفی ۱۱۰ھ

۱۳۔ حضرت عطاء خراسانی، متوفی ۱۳۵ھ

۱۴۔ حضرت مکحول دمشقی، متوفی ۱۱۲ھ

۱۵۔ حضرت حماد بن ابی سلمان، متوفی ۱۲۰ھ

۱۶۔ حضرت ابراہیم نخعی، متوفی ۹۵ھ

۱۷۔ حضرت عامر شعبی، متوفی ۱۰۳ھ

اس تفصیل سے العقد الفرید کی اس روایت کی بے اصلی ثابت ہوتی ہے۔

اسی کے قریب قریب وہ بیان ہے جو یاقوت کی معجم میں مادہ ''خراسان'' میں بیان ہوا ہے کہ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کہتے ہیں کہ جب ''عبادلہ اربعہ'' یعنی عبداللہ ابن عمر، عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن زبیر اور عبداللہ ابن عمرو بن العاص کا انتقال ہوگیا تو فقہ تمام شہروں میں موالی کے قبضے میں آ گئی۔ چنانچہ اہل مکہ کے فقیہ عطا بن ابی رباح تھے، اہل یمن کے فقیہ طاؤس تھے اور اہل یمامہ کے فقیہ یحییٰ ابن کثیر تھے اور اہل بصرہ کے فقیہ حسن بصری تھے اور اہل کوفہ کے فقیہ نخعی تھے اور اہل شام کے فقیہ مکحول تھے اور اہل خراسان کے فقیہ عطا خراسانی تھے، سوائے مدینہ منورہ کے کہ خدا نے اس کو ایک قریشی فقیہ کے ساتھ ممتاز فرمایا تھا۔ چنانچہ اہل مدینہ کے فقیہ جن کے مقابلے پر کوئی بھی نہیں آ سکتا تھا، سعید ابن المسیب تھے۔[۸۲] اس روایت میں نخعی کو مولیٰ کہا گیا ہے حالانکہ ابراہیم نخعی عرب تھے۔

یہ واقعات خلافت بنوعباس کے ابتدائی دور کے ہیں، گو کہ یہ دور ہمارے موضوع کی حد میں نہیں آتا، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کے واقعات مبنی بر تعصب ہوتے ہیں۔ بتانے والے نے ہر شہر میں سے اپنی پسند کے نام گنوا دیے جبکہ انہی موالی علما کے ہم عصر عرب علما و فقہا بھی ان شہروں میں موجود تھے، جن کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔ اس قسم کے متعصبانہ بیانات سے کسی دور کی علمی یا سماجی تاریخ متعین نہیں کی جا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں حاملین علم زیادہ تر عرب تھے، موالی کی شرکت بہت کم نظر آتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ عہد زیر نظر کا علم، جو علم القرآن تھا، عربی زبان میں تھا

جو موالی کے لئے ایک اجنبی زبان تھی، یہ درست ہے کہ انہوں نے اس زبان کو سکھا اور اختیار کیا مگر ظاہر ہے کہ اس میں کافی وقت لگ گیا۔ یہ دور اسلام میں موالی کی پہلی نسل کا دور تھا۔ موالی کی دوسری نسل سے انہیں علمی تفوق حاصل ہوا۔ تذکرہ آگے آئے گا۔

چنانچہ عہد رسالت میں جو جامعین قرآن تھے، مثلاً حضرت ابیؓ بن کعب، حضرت معاذؓ بن جبل، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت عبداللہؓ ابن مسعود، حضرت عبداللہؓ ابن عمرو بن العاص، حضرت عثمانؓ بن عفان، حضرت علیؓ بن ابی طالب، حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت حذیفہؓ بن یمان، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت عبداللہ بن سائبؓ، حضرت سالمؓ موالی ابو حذیفہ، حضرت ابوایوب انصاریؓ، حضرت عبادہؓ بن صامت، حضرت ابو درداءؓ وغیرہ یہ سب عرب تھے، سوائے سالم کے جو کہ اصطخر کے باشندے تھے اور ایرانی تھے۔ اگر سلمان فارسیؓ کو بھی اس میں شامل کرلیں تو موالی کی تعداد دو ہو جاتی ہے۔

ان کے علاوہ حضرت عقبہؓ بن عامر، ام المومنین ام سلمہؓ، ام المومنین حفصہ بنت عمرؓ، ام المومنین عائشہ بنت ابو بکرؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ بن الخطاب، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت مجمعؓ بن جاریہ، حضرت قیسؓ بن ابی صعصہ حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان، حضرت قیسؓ بن السکن اور حضرت ام ورقہؓ بنت عبداللہ بن حارث وغیرہ نے عہد رسالت میں جمع قرآن مجید یا کتابت قرآن کی سعادت حاصل کی، یہ سب عرب تھے۔

بئر معونہ کے واقعہ میں جو چالیس یا ستر صحابہ شہید ہوئے وہ سب اس وقت تک کے نازل شدہ قرآن کے بڑے حصے کے حفاظ تھے اور وہ سب عرب تھے۔ سوائے عامر بن فہیرہ کے، جو کہ حضرت ابوبکرؓ کے موالی تھے۔ یا حکم بن کیسان کے، جو بنو مخزوم کے موالی تھے۔

خلافت راشدہ کے زمانے میں جتنے معلمین مفتوحہ اور نو آباد شہروں میں بھیجے گئے، وہ سب عرب تھے۔ جن کی تفصیل اسی باب میں گزر چکی ہے۔

اسی طرح پہلی صدی ہجری میں مختلف موضوعات پر جو علم مدون ہو کر سامنے آیا وہ

بیشتر عربوں کا تھا۔ مثلاً علم الانساب کے سلسلے میں پہلی مدون کتاب ایک عرب ہی نے لکھی۔ یہ زیاد ابن ابیہ تھا۔ ابن الندیم کے مطابق زیاد نے کتاب المثالب (مثالب کے معنی معائب و نقائص کے ہیں) عربوں کی ہجو میں لکھی تھی۔ اس کتاب میں زیاد نے عربوں کے انساب پر طعن کیا تھا، کیونکہ عرب کے لوگ اس کے نسب پر طعن کرتے تھے۔ ۸۳؎

سیرۃ و مغازی کے سلسلے میں جو علم مدون ہو کر پہلی صدی ہجری میں سامنے آیا وہ زیادہ تر عربوں کا تھا۔ ایک وہب بن منبہ ۸۴؎ کو چھوڑ کر جنہوں نے مغازی پر ایک کتاب تصنیف کی تھی سیرۃ و مغازی پر بیشتر کتب اس صدی میں، عربوں نے لکھیں مثلاً ان میں ایک عروہ بن زبیرؓ (۲۳ھ - ۹۴ھ) ہیں جو مدینہ منورہ کے فقہا اور محدثین میں کافی شہرت رکھتے تھے، انہوں نے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر ایک کتاب تصنیف کی تھی، نیز فقہ پر بھی ان کی تحریریں تھیں جو ضائع ہو گئیں۔ ۸۵؎ انہی کے ہمعصر حضرت عثمانؓ بن عفان کے بیٹے ابان (۲۲ھ تا ۱۰۵ھ) تھے، انہوں نے بھی ایک کتاب سیرۃ الرسول ﷺ پر لکھی تھی، جسے ان کے ایک شاگرد عبدالرحمٰن ابن مغیرہ (متوفی پیشتر از ۱۲۵ھ) نے قلم بند کیا تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے امام المغازی، ابن اسحاق سے پہلے سترہ سیرت نگاروں کا تذکرہ کیا ہے وہ سب کے سب عرب تھے۔

اسی طرح جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا، ابن شہاب زہری (۵۱ھ تا ۱۲۴ھ) نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے کہنے پر ایک کتاب مغازی پر جمع کی تھی، تاہم اس کے علاوہ بھی ان کی متعدد تصانیف تھیں، اسی طرح موسیٰ بن عقبہ (م ۱۴۱ھ) نے بھی مغازی پر ایک کتاب لکھی۔ یہ سب حضرات عرب تھے۔

خصوصاً مدینہ میں علم عربوں کے پاس رہا، موالی کی شرکت کم نظر آتی ہے۔ طبقہ صحابہؓ ہو یا تابعین یا تبع تابعین، بیشتر بڑے بڑے علما عرب تھے۔ مدینہ کے مدرسے کے اہم ترین اساتذہ مثلاً حضرات عمرؓ، علیؓ، زید بن ثابت، عائشہ صدیقہ اور عبداللہ ابن عمرؓ وغیرہ تھے۔ ان اصحاب کے بکثرت شاگرد ہوئے، جن میں صغار صحابہؓ اور تابعین بھی شامل تھے۔ ان صحابہ کرام کے فیضان صحبت سے بہت سے علمائے تابعین فیضیاب ہوئے جن میں مشہور ترین سعید ابن

مسیب ۸۶، عروہ بن زبیر، ابن شہاب زہری تھے اور یہ سب عرب تھے۔

ایک اور واقعہ سے بھی مدینہ پر عرب فقہا کی بالادستی کا پتا چلتا ہے وہ یہ کہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز مدینہ کے والی ہو کر آئے تو دس فقہائے مدینہ پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ بنائی۔ ان میں یہ لوگ شامل تھے، عروہ بن زبیرؓ، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہؓ، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارثؓ، ابوبکر بن سلیمان بن ابی حثمہؓ، سلیمان ابن یسارؓ، قاسم بن محمدؓ، سالم بن عبداللہؓ، عبداللہ بن عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عامر بن ربیعہ اور خارجہ بن زید بن ثابتؓ، اس میں سلیمان ۸۷ ابن یسار کے علاوہ کہ موالی تھے، سب عرب تھے البتہ قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ اور سالم بن عبداللہؓ کی مائیں ام ولد تھیں۔

المختصر اس ضمن میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ اسلام کے دور اول یا دور صحابہؓ میں علم کے جامع زیادہ تر عرب تھے۔ صحابہؓ کے بعد جب تابعین کا دور آیا تو ہمیں حاملین علم میں عربوں کے شانہ بشانہ موالی بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم زید بن ثابتؓ ۸۸ کے شاگردوں کی تفصیل میں جائیں تو ایک طرف عبداللہ ابن عباسؓ ۸۹، ابوعبدالرحمٰن السلمیؒ ۹۰، خارجہ ابن زیدؓ ۹۱، انس بن مالکؓ ۹۲، مروان بن حکم ۹۳، عبداللہ ابن عمرؓ ۹۴ اور عروہ بن زبیرؓ نظر آتے ہیں، جو سب عرب تھے تو دوسری طرف طاؤس ابن کیسان ۹۵ اور عطاء ابن یسار ۹۶ کے نام بھی نظر آتے ہیں، جو کہ موالی تھے۔

پھر عبداللہ ابن عباسؓ کے شاگردوں کی فہرست پر ایک نظر ڈالیں تو ایک طرف عروہ بن زبیر، ابوالشعثاء ۹۷، ابورجاء عطاردی ۹۸، قاسم بن محمد بن ابی بکر، امام شعبی ۹۹، علی بن حسین اور ابن ابی ملیکہ ۱۰۰ جیسے فقہا کے نام نظر آتے ہیں اور یہ سب کے سب عرب تھے، تو وہیں دوسری طرف عکرمہ ۱۰۱، مجاہد ابن جبیر ۱۰۲، طاؤس ابن کیسان، عطاء بن ابی رباح ۱۰۳، سعید ابن جبیر ۱۰۴، ابوالعالیہ ۱۰۵، عطاء بن یسار ۱۰۶، محمد ابن سیرین ۱۰۷ اور حسن بصری ۱۰۸ کے نام نظر آتے ہیں اور یہ سب کے سب آزاد کردہ غلام (موالی) تھے۔

مملکت کے دیگر اہم شہروں کا بھی یہی حال تھا۔ علوم دینیہ کے علاوہ دیگر علوم میں

بھی عربوں کا قابل ذکر حصہ زیر نظر صدی میں نظر آتا ہے، جسے ابن خلدون سمیت کئی مؤرخین نے نظر انداز کر دیا ہے۔ مثلاً ''علم نحو کے بانی ابوالاسود دؤلی ۱۰۹ بھی ایک عرب تھے، جنہوں نے علم نحو سے متعلق ایک رسالہ لکھا تھا۔ یہ بصری تھے، تابعی تھے اور پہلے شخص تھے جنہوں نے علم نحو کی بنیاد ڈالی اور ان کے بعد ان کے بیٹے نے اس علم کو آگے بڑھایا۔ اس بات کو صریحاً نظر انداز کرتے ہوئے ابن خلدون کہتے ہیں:

> ''علم نحو کا بانی سیبویہ تھا۔ اس کے بعد الزجاج (م ۳۱۱ھ) کا مقام تھا۔ ان دونوں کے بعد علم نحو میں سب سے بلند مرتبہ الفارسی کا تھا۔ یہ تینوں نحوی نسلاً عجمی تھے۔'' ۱۱۰

جب اسلام بلاد عربیہ سے نکل کر دیار عجم میں پھیلا تو جہاں عجمیوں کو قرآن مجید کی تلاوت اور اس کی فہم و ادراک میں وقت پیش آئی وہاں عربی زبان بھی عرب و عجم کے اختلاط سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک اعرابی آیا اور اس نے کہا ''کون ہے جو مجھے قرآن پڑھائے۔'' ایک شخص نے اسے سورۃ التوبہ پڑھائی اور اس کی تیسری آیت کے اس جملے ''ان اللہ بریء من المشرکین و رسولہ'' [اللہ مشرکین سے بیزار ہے اور اس کا رسول بھی۔] میں لفظ ''رسولہ'' کو لام پر پیش کے بجائے زیر دے کر ''رسولِہ'' پڑھ ڈالا، جس کے معنی یہ ہوگئے کہ اللہ بیزار ہے مشرکین سے اور اپنے رسول سے۔ یہ سن کر اعرابی نے کہا ''کیا اللہ اپنے رسول سے بیزار ہوگیا۔ اگر اللہ اپنے رسول سے بیزار ہوگیا تو میں بھی اس سے بیزار ہوگیا۔'' جب حضرت عمرؓ کو اس واقعے کا پتہ چلا تو آپ نے اعرابی کو بلا کر ماجرا پوچھا، اس نے واقعہ بیان کر دیا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے یہ عام حکم دے دیا کہ بجز علم لغت کے کوئی اور قرآن مجید نہ پڑھایا کرے۔ ساتھ ہی انہوں نے ابوالاسود دؤلی کو علم العربیہ کے کچھ قواعد و ضوابط بنانے کا حکم دیا۔ ابوسعید حسن بن عبداللہ السیرافی نے اخبار النحویین میں ابوعبیدہ معمر بن مثنیٰ کا یہ قول ذکر کیا ہے ''لوگ ابوالاسود کے پاس عربی سیکھنے آیا کرتے تھے، سب سے پہلے جس نے عربی قواعد وضع کیے، وہ ابوالاسود دؤلی ہیں۔''

تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موالی نے جلد ہی فاتحین کی زبان سیکھ کر اسلامی علوم حاصل کر لیے اور دوسری صدی ہجری میں زیادہ تر علوم انہی موالی کے پاس تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ زیادہ تر بدعتی فرقے بھی موالی ہی سے پھوٹے۔

علوم وفنون کی طرف موالی کے اس رجحان کے چند اسباب تھے۔

۱۔ پہلا سبب تو یہ تھا کہ ان موالی کا، خواہ وہ ایرانی موالی ہوں یا شامی اور مصری موالی، ان کا اپنا ایک قابل ذکر علمی پس منظر تھا۔ ان کے پاس اپنے علوم اور ان علوم پر مبنی کچھ نہ کچھ مدون کتابیں موجود تھیں۔ اسلامی حکومت کا صوبہ بننے سے قبل ان کے شہر عصری علوم وفنون کے اہم مراکز تھے، مثلاً اسکندریہ[۱۱۱]، انطاکیہ[۱۱۲] اور نصیبین[۱۱۳] کے شہر تیسری صدی عیسوی کے اہم علمی مراکز تھے۔ عراق بھی قدیم تہذیبوں کا مرکز رہا تھا۔ اس متمدن ملک کے پاس قابل ذکر علمی خزائن موجود تھے، چنانچہ یہ بالکل فطری بات تھی کہ فتوحات کے ہنگاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے پچھلے علمی مشاغل کو دوبارہ زندہ کرتے۔ سریانی جو یونانی علوم کے ماہر تھے، پہلے ہی سرزمین عراق میں پھیلے ہوئے تھے، جن کے مدارس بھی تھے، جہاں یونانی علوم کی درس وتدریس ہوتی تھی۔ پھر عراق ایک زرخیز ملک تھا، جہاں خوشحالی اور فارغ البالی تھی چنانچہ وہاں کے باشندے علمی مشاغل کی طرف توجہ دے سکتے تھے۔

جہاں تک ایران کا تعلق ہے اس کا تفصیلی حال پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اسی طرح اہل ہند کے یہاں مدون مضامین اور مجلد کتابیں موجود تھیں، جنہیں کسی ایک عالم کا کارنامہ نہ بھی کہا جا سکے مگر پھر بھی وہ اُن میں وراثتاً چلی آئی تھیں۔ یہی حال یونان وروم کا تھا، جو فلسفہ، منطق اور دیگر علوم طبیعیہ کے حامل تھے۔ تیسری صدی عیسوی سے قبل تک یونانی ہی علمی زبان مانی جاتی تھی، رفتہ رفتہ ''سریانی'' زبان نے یونانی کی جگہ علمی زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔ مصر کا شہر اسکندریہ یونانی علوم کا بہت بڑا مرکز رہ چکا تھا۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو عجمیوں کا اپنا ایک علمی پس منظر تھا۔ اہم سیاسی تبدیلیوں اور عسکری اقدامات کی وجہ سے ان کی علمی سرگرمیوں میں تعطل ضرور آیا مگر جب وہ

ایک نئی مملکت کے شہری بنے اور ایک نیا دین اختیار کیا، وہ دین جو علم وفن کا سرپرست تھا، تو حالات کے پرسکون ہوتے ہی وہ علوم وفنون کی سرگرمیوں میں دوبارہ مصروف ہو گئے۔ چونکہ اب ان کی علمی ترجیحات بدل گئی تھیں۔ اس لئے پہلے اگر ان کے لئے فلسفہ اور طب اہم تھے تو اب قرآن اور حدیث اہم ہو گئے۔ یہ نئے علوم ایک اجنبی زبان (عربی) میں تھے جو ان کے فاتحین کی زبان تھی اور یہاں ان کے استاد، ان کے ہم وطن نہیں بلکہ عرب تھے، تاہم ان عجمیوں میں سے جنہوں نے اسلام کو بہ طیب خاطر قبول کیا تھا، ان تمام تبدیلیوں کو بھی قبول کرلیا اور عربوں کے ساتھ ساتھ حصول علم میں مصروف ہو گئے۔ اصل میں جب کوفہ اور بصرہ کے نئے شہر آباد کیے گئے تو بدوی عربوں کی بڑی تعداد نے جنگی خدمات انجام دینے کے لئے ان شہروں کی طرف رخ کیا۔ ان بدوی عربوں کو علوم سے کوئی قابل ذکر علاقہ نہیں تھا، لہٰذا ان شہروں میں آباد ہونے کے بعد بھی وہ اپنے انداز کی سابقہ بدویانہ زندگی گزارتے رہے، جبکہ مقامی موالی، جن کا ایک علمی پس منظر تھا، اسلامی علوم کی تحصیل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اکثر عرب جو اُن شہروں میں آ بسے تھے، غیر مہذب تھے، یہ نہ تو رسول اللہ ﷺ کے فیض یافتہ تھے اور نہ اسلام ہی ان کی قلب ماہیت کر سکا تھا، یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے موالی کو حقارت سے دیکھا اور اپنے سے کمتر سمجھا۔

۲۔ دوسرا سبب مثالی سازگار ماحول اور حالات تھے۔ ظاہر ہے اگر علمی پس منظر ہوتا مگر حالات و ماحول سازگار نہ ہوتے تب بھی مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکتے۔ ان موالی نے جو نیا مذہب قبول کیا اس میں علم کو قابل ذکر اہمیت حاصل تھی۔ عالم کی عزت وتوقیر بعض حالات میں عابد اور شہید سے بھی زیادہ تھی۔ پھر وہ غیر عرب جو جنگوں میں گرفتار ہوئے اور عربوں میں تقسیم ہوئے، ان کے عرب آقاؤں نے انہیں حصول علم میں مدد دی، بلکہ بعض اوقات سختی بھی کی جیسا کہ ہم عکرمہ کے حالات دیکھتے ہیں۔ یہ خود بربر تھے، عبداللہ ابن عباسؓ کے موالی تھے اور حصول علم سے جی چراتے تھے۔ اکثر حلقہ درس سے غائب رہتے، اس لئے عبداللہ ابن عباس، قرآن و حدیث کی تعلیم دینے کے لئے ان کے پیروں میں زنجیر ڈال دیتے تھے۔[۱۱۳] لہٰذا یہی عکرمہ تھے

کہ جب علم حاصل کرلیا تو "حبر امت" کہلائے اور ایک خلقت نے ان سے اکتساب علم کیا۔

رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ نے اپنے غلاموں کی تعلیم و تربیت پر اپنی اولاد کی طرح توجہ دی، اس خصوصی توجہ نے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں موالی کو مرتبہ علمیت پر فائز کیا۔ اس کی ایک روشن مثال نافع موالی عبداللہ ابن عمر کی ہے، انہوں نے اپنے آقا کے علاوہ دیگر اصحاب رسول سے قرآن و حدیث کا بیشتر علم حاصل کرلیا تھا۔ چنانچہ محدثین، شافعی عن مالک عن نافع عن ابن عمر کی سند کو "سلسلۃ الذہب" (سونے کی لڑی) شمار کرتے تھے۔

امام نافع موالی عبداللہ ابن عمر کو عبداللہ ابن جعفر، ان کی علمیت کی وجہ سے حاصل کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے ابن عمر کو ایک بھاری رقم دینے پر آمادہ تھے (تیس ہزار درہم) لیکن ابن عمر نے "علم" کی خرید و فروخت کو نامناسب سمجھتے ہوئے حضرت نافع کو آزاد کردیا۔ ۵؎

عموماً جب غلام اپنے آقا سے اکتساب علم کرلیتا تو اس کو شرف و عزت دینے کے لئے آزاد کردیا جاتا۔ اسی عکرمہ کو عبداللہ ابن عباس کے انتقال پر ان کے بیٹے علی نے خالد ابن یزید ابن معاویہ کے ہاتھ چار ہزار دینار میں فروخت کرنے کا عہد کرلیا، اس پر عکرمہ علی کے پاس آئے اور کہا "آپ نے اچھا کام کیا کہ اپنے والد کے علم کو محض چار ہزار دینار کے عوض بیچ ڈالا۔" یہ سن کر علی نے خالد سے اس بیع کو توڑ کر عکرمہ کو آزاد کردیا۔ ۶؎

آزادی کے بعد ان کے شرف و وقار میں مزید اضافہ کرنے کے لئے بعض صحابہؓ و تابعین ان کی رکاب تھام کر چلتے اور انہیں اپنی مسند خاص پر جگہ دیتے۔ ابوالعالیہ موالی بنو تمیم کا بیان ہے کہ عبداللہ ابن عباس مجھے اپنے ساتھ تخت پر بٹھاتے تھے، جبکہ معززین قریش نیچے بیٹھے ہوتے تھے۔ پھر فرماتے "علم شرفا کی شرافت کو اس طرح بڑھاتا ہے اور ایک غلام کو تخت پر بٹھاتا ہے۔" ۷؎

اسی طرح مجاہد ابن جبیر موالی بنو مخزوم کہتے ہیں کہ میں سوار ہوتا تو اکثر حضرت عبداللہ ابن عمر میری رکاب تھامتے۔ ۸؎

بعض مؤرخین، جن میں حسن ابراہیم حسن بھی شامل ہیں، ان کا خیال ہے کہ موالی

علم کی تحصیل کی طرف اس لئے زیادہ منہمک ہوگئے، کیونکہ بنو امیہ کی عربی حکومت میں انہیں کوئی سیاسی مقام نہیں دیا گیا۔

دراصل سیاسی و عسکری معاملات میں حد درجہ اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے، جس زمانے میں ایران، عراق اور شام و مصر کی فتوحات جاری تھیں، اعتماد کی فضا قائم نہیں ہوئی تھی، رفتہ رفتہ اموی عہد میں جب اعتماد بحال ہونے لگا تو سیاسی عہدوں پر موالی بھی نظر آنے لگے، Case Study کے طور پر اموی عہد میں حجابت اور کتابت عہدوں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

حجابت:

حجابت کا عہدہ انتہائی ضرورت کے تحت حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں متعارف ہوا اور اس عہدے پر ہمیشہ موالی ہی فائز کئے جاتے تھے۔ بعض حالات میں ان حاجبوں نے انتہائی مؤثر اور اہم سیاسی کردار ادا کیا۔ امیر معاویہؓ کے حاجب ان کے مولیٰ صفوان تھے۔ ابن خلدون کے مطابق سعد مولیٰ معاویہ تھے۔ ۱۱۹ یزید بن معاویہ کے حاجب خالد تھے جو انہی کے مولیٰ تھے۔ معاویہ بن یزید کے حاجب کا نام صفوان تھا جو معاویہ ثانی کا مولیٰ تھا۔ مروان بن حکم کا حاجب ابو سہیل اسود تھا جو مروان کا مولیٰ تھا۔ (بعض کے بقول مروان کا حاجب ابو منہال تھا جو مروان کا مولیٰ تھا۔) خلیفہ عبدالملک بن مروان کا حاجب یوسف تھا جو عبدالملک کا مولیٰ تھا۔ (ابو الزعیزعہ نے بھی حجابت کا کام کیا۔) ولید بن عبدالملک کا حاجب یزید تھا جو ولید کا مولیٰ تھا۔ سلیمان بن عبدالملک کا حاجب ابو عبیدہ سلیمان کا مولیٰ تھا۔ بعض کے کہنے کے مطابق مسلم حاجب تھا، تاہم وہ بھی سلیمان کا مولیٰ تھا۔ عمر بن عبدالعزیز کے حاجب مزاحم تھے جو ان کے آزاد کردہ غلام تھے اور ان کے مشیر خاص بھی تھے۔ یزید بن عبدالملک کا حاجب سعید تھا، جو ولید کا مولیٰ تھا۔ ہشام بن عبدالملک کا حاجب غالب تھا جو ہشام کا مولیٰ تھا۔ مروان ثانی کا حاجب صقلاب، مروان ثانی کا مولیٰ تھا۔

اموی عہد میں حجابت کوئی معمولی عہدہ نہیں تھا، حاجب محض دربان نہیں ہوتا تھا بلکہ

سیاسی سوجھ بوجھ، حالات حاضرہ پر گہری نظر رکھنے والا، خلیفۂ وقت کا خاص آدمی ہوتا تھا، جو ملنے جلنے والوں پر نہ صرف نظر رکھتا تھا بلکہ بعض حالات میں خلیفہ تک رسائی اسی کی صوابدید پر منحصر ہوتی تھی۔

عہدہ حجابت

	اموی خلفاء	حاجب	رشتۂ ولاء
۱۔	معاویہ بن ابوسفیان	صفوان/ سعد	موالی معاویہ
۲۔	یزید بن معاویہ	خالد	موالی یزید
۳۔	معاویہ بن یزید	صفوان	موالی معاویہ ثانی
۴۔	مروان بن حکم	ابو سہیل اسود/ ابومنہال	موالی مروان
۵۔	عبدالملک بن مروان	یوسف	موالی عبدالملک
۶۔	ولید بن عبدالملک	یزید	موالی ولید
۷۔	سلیمان بن عبدالملک	ابوعبیدہ	موالی سلیمان
۸۔	عمر بن عبدالعزیز	مزاحم	موالی عمر بن عبدالعزیز
۹۔	یزید بن عبدالملک	سعید	موالی ولید
۱۰۔	ہشام بن عبدالملک	غالب	موالی ہشام
۱۱۔	مروان ثانی	صقلاب	موالی مروان ثانی

کتابت:

کتابت اموی عہد میں دوسرا بڑا انتظامی عہدہ تھا۔ کاتب کو اسٹیٹ سیکریٹری (State Secretary) کہا جاسکتا ہے اور اسی اعتبار سے اس کی اہمیت کا اندازہ بھی کیا جاسکتا

ہے۔ اموی خلفاء کے بعض کاتب موالی تھے، مثلاً امیر معاویہؓ کے پانچ کتاب میں سے تین موالی تھے جن میں سرجون بن منصور رومی، عبدالرحمٰن ابن دراج اور سلیمان بن سعید شامل تھے۔ اول الذکر دیوان الخراج کے کاتب تھے اور وہ اس منصب پر مروان بن حکم کے دور تک فائز رہے۔ ۱۲۰

یزید بن معاویہ کے تین کتاب میں سے ایک موالی تھے جو کہ سرجون بن منصور تھے۔ مروان بن حکم کے چار کاتبوں میں سے دو موالی تھے، ایک تو ابن سرجون نصرانی اور دوسرے ابوالزعیزعہ، آخر الذکر جو کہ مولیٰ مروان بن حکم تھے، عبدالملک کے دور میں بھی دفتر مراسلات کی کتابت کی ذمہ داری نبھاتے رہے۔ اس کے علاوہ عبدالملک کے دو اور کاتب بھی موالی تھے، جن میں عمرو بن الحارث مولیٰ بنی عامر بن لؤیؔ تھے۔ جب عمرو کا انتقال ہوا تو ان کے مولیٰ جناح نے ان کی جگہ لی ۱۲۱ اور اپنی ذمہ داری ولید بن عبدالملک کے دور خلافت میں بھی نبھاتے رہے۔ ولید کے کتاب میں دیوان الخاتم کے کاتب شعیب الصابی بھی ولید کے مولیٰ تھے۔ نفیع بن ذئیب ولید کے کاتب مستغلات تھے۔ یہ بھی ولید کے مولیٰ تھے۔ ۱۲۲

سلیمان بن عبدالملک کے چار کاتبوں میں سے دو موالی تھے۔ یہ ابن بطریق نصرانی اور نعیم بن سلامہ تھے۔ عمر بن عبدالعزیز کے چار میں سے دو کتاب موالی تھے۔ ایک لیث بن ابی رقیہ مولیٰ ام الحکم بنت ابی سفیان اور دوسرے اسماعیل بن ابی حکیم مولیٰ زبیر بن العوام تھے۔ ۱۲۳ ہشام بن عبدالملک کا ایک کاتب سالم تھا، جو سعید بن عبدالملک کا مولیٰ تھا۔

اموی عہد میں بعض گورنروں کے کاتب بھی موالی ہوتے تھے مثلاً حجاج بن یوسف کا کاتب عبید بن موہب تھا، جو حجاج کا مولیٰ تھا۔ زیاد ابن ابیہ، والی عراق کے کاتب الرسائل عبداللہ بن ابی بکرہ مولیٰ رسول اللہؐ تھے، جو زیاد کے ماں جائے بھائی بھی تھے، نیز زیاد کے ایک اور کاتب ان کے مولیٰ مرداس بھی تھے۔ ۱۲۴ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مختلف شعبوں کے مختلف کتاب ہوا کرتے تھے، مثلاً دفتر مال وخزانہ کے کاتب، محکمہ فرامین شاہی کے کاتب اور محکمہ مراسلات کے کاتب وغیرہ۔

دراصل اموی دور میں جبکہ سلطنت کے امور چلانے کے لئے کچھ نئے محکمے کھولنے پڑے جہاں لکھت پڑھت کی ضرورت تھی، وہاں زیادہ تر غیر عرب ہی ملازم رکھے جاتے تھے۔ یہ مسلمان بھی ہوتے تھے اور غیر مسلم بھی، کیونکہ حضرت عمرؓ کے دور سے لے کر عبدالملک بن مروان کے دور تک دیوان مقامی زبانوں ہی میں تھے۔ عراق کا دیوان فارسی زبان میں، مصر کا قبطی زبان میں اور شام کا رومی زبان میں تھا، اور ان دوائین کے کتاب تقریباً سب کے سب ذمی یا موالی ہی تھے، تا آنکہ عبدالملک بن مروان کے عہد میں بیش تر دیوان عربی زبان میں منتقل کردیئے گئے۔ دواوین کے تراجم کا یہ کام ہشام بن عبدالملک کے دور تک چلتا رہا۔

اموی خلفا کے بعض انتہائی با اعتماد مشیر، موالی ہوا کرتے تھے۔ امیر معاویہؓ یزید بن معاویہ اور مروان بن حکم سرجون بن منصور سے اکثر مشاورت کرتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز رجا بن حیوۃ اور مزاحم پر غیر معمولی اعتماد کرتے تھے اور ہر اہم معاملہ میں خصوصاً اول الذکر سے مشورہ ضرور کرتے تھے۔ یہ دونوں حضرات جو عمر بن عبدالعزیز کے کاتب بھی تھے، موالی بھی تھے۔ عمر بن عبدالعزیز براہ راست بعض اوقات حضرت حسن بصری سے بھی مشورے طلب کرتے تھے۔

بعض قابل موالی انتہائی اہم عسکری عہدوں تک بھی پہنچے، ولید بن عبدالملک کے زمانے میں اندلس کی فتوحات کا قائد طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر کا موالی تھا اور موسیٰ بن نصیر نے اسے طنجہ پر عامل مقرر کیا تھا۔ ۱۲۵ خود موسیٰ بھی موالی تھا تاہم عرب تھا۔ طارق کی تقریباً پوری فوج، جس نے اندلس کو فتح کیا، بربر موالی پر مشتمل تھی۔ خلفا نے اپنی ایک خاص اعتماد کی فوج بھی بنائی تھی۔ یہ طریقہ بھی ابن خلدون کے مطابق امیر معاویہؓ نے شروع کیا تھا۔ اس دستہ جانثاران پر خلفا عموماً اپنے موالی ہی سردار مقرر کرتے تھے۔ چنانچہ امیر معاویہؓ کی فوج جانثاران کے دستہ پر ان کا آزاد کردہ غلام مختار یا بعض روایات کے مطابق ابوالمحاری مالک (حمیر کا آزاد کردہ غلام) تھا۔ ۱۲۶

امیران عساکر کی فہرست میں موالی اس لئے کم نظر آتے ہیں کہ ان کا عسکری ماضی اتنا شاندار نہیں تھا، ان کے مقابلے میں عرب زیادہ جنگجو، بہادر اور جری تھے، لہٰذا وہ زیادہ بہتر

امیر لشکر ثابت ہوسکتے تھے۔ ایران وروما کے فوجی زوال پذیر سلطنتوں کے فوجی تھے جبکہ عربوں کو ایک نئے دین کی طاقت نے مزید قوت بخش دی تھی، وہ ایک ایسی ابھرتی ہوئی قوت تھی جن کا مقابلہ کسی بکھرتی ہوئی تہذیب کے بس کی بات نہیں تھی۔

عہدۂ کتابت

نمبر	خلفا	کتاب	عرب یا موالی
۱۔	امیر معاویہؓ	عبید بن اوس الغسانی	عرب
		سرجون بن منصور رومی	موالی (محکمہ مال کے کاتب)
		عبدالرحمٰن ابن دراج	موالی امیر معاویہؓ
		سلیمان ابن سعید	موالی امیر معاویہؓ
		عبداللہ ابن نصر بن حجاج	عرب
۲۔	یزید بن معاویہؓ	عبید بن اوس الغسانی	عرب
		زمل بن عمرو العذری	عرب
		سرجون بن منصور	موالی
۳۔	مروان بن حکم	عبید بن اوس الغسانی	عرب
		ابن سرجون نصرانی	موالی
		ابوثابت سلمان بن سعد	عرب
		ابوالزعیزعہ	موالی
۴۔	عبدالملک بن مروان	قبیصہ بن ذوئب	عرب
		ابوالزعیزعہ	موالی (دفتر مراسلات کے کاتب)

		عمرو بن الحارث	موالی
		ابن سرجون	موالی
۵۔	ولید بن عبدالملک	عبداللہ ابن ہلال ثقفی	عرب
		صالح بن عبدالرحمٰن	موالی
		قعقاع بن خلید العبسی	عرب
		ابو ثابت سلمان ابن سعد	عرب (کاتب دفتر مال وخزانہ)
		شعیب العمانی	عرب (کاتب فرامین شاہی)
		جناح	موالی (دفتر مراسلات)
		نفیع بن ذوئب	موالی (کاتب محکمہ بنائی)
۶۔	سلیمان بن عبدالملک	عبدالعزیز بن حارث	عرب
		سلیمان ابن نعیم	عرب
		ابن البطریق نصرانی	موالی
		نُعیم ابن سلامہ	موالی (محکمہ فرامین شاہی کے کاتب)
۷۔	عمر بن عبدالعزیز	لیث بن ابی رقیہ	موالی
		رجا بن حیوۃ	موالی
		اسماعیل بن ابی حکیم	موالی زبیر بن العوام (محکمہ مال وخزانہ)
۸۔	ہشام بن عبدالملک	سالم	موالی سعید بن عبدالملک

گویا چوبیس کتاب میں سے چودہ موالی تھے اور دس عرب۔

ان حقائق کی روشنی میں جناب حسن ابراہیم حسن کا یہ بیان، ''اموی عہد میں فوجی خدمات کے عوض عربوں کی طرح موالی کے وظائف مقرر نہ کیے گئے، جنگ کے وقت انہیں سوار

ہو کر لڑنے کی اجازت نہ تھی، یہ شرف صرف عربوں کو حاصل تھا، ان امتیازات کے علاوہ اور بہت سی امتیازی حدیں قائم کر رکھی تھیں۔" ۱۲۷ے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ کوئی استثنائی مثال تو ہو سکتی ہے مگر عمومی مزاج نہیں تھا۔ کیونکہ یہ بات بہر حال تاریخی طور پر ماننے والی نہیں کہ طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر اور ان کی بربر موالی پر مشتمل فوج اندلس کی جنگ پیدل لڑی تھی۔ موالی کو پاپیادہ کرنے کی ایک مثال، اس وقت ضرور سامنے آئی تھی جب مختار کی فوجیں، شامی فوجوں سے نبرد آزما تھیں، اس وقت ایک دستہ فوج میں بعض متعصب عربوں کی مداخلت کی وجہ سے موالی کو گھوڑوں سے اتار لیا گیا تھا، مگر یہ ایک جنگ کے دوران فوج کے ایک دستہ کا حال تھا، ورنہ مختار ہی کے زمانے میں نہ صرف اس کی اور ابراہیم بن اشتر کی فوج میں موالی بکثرت شریک تھے اور اس ایک دفعہ کے علاوہ وہ ہمیشہ ہی سوار ہو کر لڑے۔ اب کسی ایک استثنائی واقعہ کو لے کر اسے پورے عہد پر منطبق کرنا بذات خود تعصب ہے اس سے تحقیق کا حق ادا نہیں ہوتا۔

حجابت، کتابت، مشاورت کے علاوہ اموی عہد میں بعض اہم انتظامی عہدوں پر بھی موالی نظر آتے ہیں۔ وردان، جو کہ حضرت عمرو بن العاص کے موالی تھے، ان کی طرف سے مصر کے معاملات کے نگران تھے، وہ عمرو بن العاص کی غیر موجودگی میں ان کے نائب ہوتے اور ان کی موجودگی میں بھی ان کے دست راست اور مشیر خاص ہوتے۔ جیسا کہ باب چہارم میں تفصیلاً بیان کیا گیا کہ ان کی مرضی کے خلاف امیر معاویہؓ جو کہ خلیفہ وقت تھے، مصریوں کے خراج میں اضافہ نہ کر سکے۔

امیر معاویہؓ ہی کے عہد خلافت میں ابو مہاجر موالی حضرت مسلمہ بن مخلد انصاری پورے افریقہ کے والی (گورنر) رہے۔ امیر معاویہؓ نے مسلمہ بن مخلد کو مصر و افریقہ کا والی بنایا تھا۔ انہوں نے اپنی طرف سے اپنے موالی ابوالمہاجر کو افریقہ کا والی بنایا۔ وہ اس عہدے پر ۵۰ھ تا ۶۰ھ فائز رہے۔ ۱۲۸ے

اسی طرح حجاج بن یوسف جب عبداللہ بن زبیر بن العوام کا محاصرہ کیے ہوئے تھا تو تازہ کمک جو کہ پانچ ہزار نفوس پر مشتمل تھی، طارق ابن عمرو، کی سرکردگی میں بھیجی تھی اور یہ

طارق، حضرت عثمانؓ ابن عفان کا موالی تھا۔ یہ شعبان ۷۲ھ کا واقعہ ہے۔ ۱۲۹؎ یہی طارق عبدالملک کی جانب سے (۷۲ھ میں) مدینے کا گورنر تھا، وہ پانچ ماہ تک اس عہدے پر فائز رہا۔ ۱۳۰؎ اس کے بعد یہ عہدہ حجاج کو دے دیا گیا۔

عبداللہ ابن زبیر نے جب اپنے بھائی حضرت مصعب ابن زبیر کو بصرہ کا گورنر بنا کر بھیجا تو ان کے امور و معاملات کے نگران بھی ایک موالی کیسان ابوفردہ تھے۔ (یہ حضرت عثمانؓ کے موالی تھے) جب حضرت مصعب قتل ہوگئے تو ان کے ساتھ جو کچھ مال تھا اور جس کی مالیت دس ہزار درہم تھی، وہ لے کر مدینہ چلے آئے۔ ۱۳۱؎

عمر بن عبدالعزیز کے مختصر عہد خلافت میں موالی کی کئی سیاسی و انتظامی تقرریاں نظر آتی ہیں۔ ایک مثال ابوالزناد کی ہے جو موالی تھے اور جنہیں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے (عراق کا) افسر خراج مقرر کیا تھا۔ ۱۳۲؎

اسی طرح حضرت عمر ثانی نے میمون بن مہران موالی بنی نصر بن معاویہ (م ۱۱۷ھ) کو الجزیرہ کا والی مقرر کیا تھا۔ ۱۳۳؎ ان کے بیٹے عمرو بن میمون بن مہران (م ۱۴۵ھ) بھی دیوان کے حاکم تھے۔ نیز اسمٰعیل بن عبداللہ جو کہ بنی مخزوم کے موالی تھے، انہیں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے افریقہ کا حاکم بنایا۔ اسی طرح مصر میں جن تین حضرات کو (حضرت عمر ثانی کے دور میں) فتویٰ دینے کا اختیار دیا گیا تھا، ان میں سے ایک جعفر بن ربیعہ تھے، دوسرے یزید ابن حبیب ۱۳۴؎ اور تیسرے عبداللہ ابن ابی جعفر، ان میں اول الذکر عرب، باقی دو موالی تھے۔

اموی عہد میں صرف ایک عہدہ قضا ایسا تھا جس پر ہمیشہ عربوں کا تقرر کیا گیا جس کی طرف بعض مؤرخین نے اشارہ کیا ہے کہ اس عہد (اموی عہد) کا مشہور قاعدہ یہ تھا کہ "لا یقضی بین الناس الاعرابی" ۱۳۵؎ چنانچہ اموی عہد کے جو مشہور قضاۃ تھے، مثلاً فضالہ بن عبید انصاری، ابو ادریس خولانی، عبداللہ بن قیس بن عبدمناف، ابوبکر بن حزم، محمد بن حزم، سلیمان بن حبیب المحاربی اور عبداللہ بن سعد الایلی وغیرہ سب کے سب عرب تھے۔ تاہم بعض صوبوں کے قاضی موالی بھی ہوئے۔ مثلاً حجاج بن یوسف نے کوفہ کا قاضی سعید ابن جبیر کو بنایا

تھا لیکن بعض عمائدین کے اعتراض پر ابو موسیٰ اشعری کے بیٹے ابو بردہ بن ابو موسیٰ ۱۳۶ کو عہدہ قضاء پر فائز کیا تاہم یہ پابندی لگادی کہ کوئی فیصلہ سعید ابن جبیر کے مشورے کے بغیر نہ کریں۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز نے امام میمون بن مہران (موالی) کو الجزیرہ کے منصب قضا پر بھی متعین کیا تھا۔ ۱۳۷ نیز وہب بن منبہ جو ایرانی الاصل تھے، یمن کے قاضی تھے۔ ۱۳۸

تاہم اس میں شک نہیں کہ عہد اموی میں زیادہ تر قاضی عرب تھے، اس کا سبب موالی کے لئے کسی قسم کا جذبہ اہانت وحقارت نہیں تھا بلکہ اس کا ایک انتہائی معقول سبب یہ تھا کہ ان عربوں کے باپ دادا مسلمان تھے۔ جن میں سے بعض کو شرف صحابیت بھی نصیب تھا اور دین اسلام اور اس کے تقاضوں کو کماحقہ سمجھتے تھے، ان عربوں کو بچپن سے ہی اسلامی ماحول ملا تھا۔ ان کی تربیت مسلمان گھروں میں مسلمان والدین نے کی۔ جبکہ موالی میں سے بیشتر نو مسلم تھے، یہ خود بھی ابھی علوم دینیہ سے آگاہی حاصل کرنے کے مقام پر تھے، ان میں سے بیشتر کے آبا و اجداد کا کوئی اسلامی ماضی نہیں تھا۔ دین اسلام، اس کے تقاضوں اور اس کی اسپرٹ پر جو دسترس ان عربوں کو حاصل تھی، موالی کو ایک صدی بعد حاصل ہو سکی، لہذا ایک صدی بعد ہم انہیں بلاتکلف عہدہ قضا پر فائز دیکھتے ہیں۔

اس بات کو یوں کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی حکومت نے موالی پر انتظامی، عسکری اور سیاسی معاملات پر تو بھروسا کیا اور انہیں اس نوعیت کے عہدوں پر فائز کیا کیونکہ موالی، انتظامی اور سیاسی معاملات میں، ایک بہتر ماضی کے حامل تھے اور ان کا سیاسی تجربہ اور سیاسی ماضی، عربوں کے سیاسی تجربات اور سیاسی ماضی سے بہرحال بہتر تھا۔ جبکہ عہدہ قضا کے لئے اسلامی حکومت نے موالی یعنی نومسلموں پر بھروسہ کرنے کے بجائے اصحاب رسول اللہؐ اور تابعین اور ان کی اولاد پر بھروسہ کیا کیونکہ ان کا دینی ماضی، عجمیوں اور موالی کے دینی ماضی سے یقیناً بہتر تھا۔

زیر نظر صدی میں باوجود اس کے کہ عرب استاد تھے اور موالی شاگرد، ترویج علوم میں دونوں شانہ بشانہ نظر آتے ہیں۔ پھر اسلام ایک ایسا دین تھا جو ہر مرد و زن، آزاد و غلام کے لئے حصول علم کے یکساں مواقع فراہم کرتا تھا، نیز اسلامی رواداری اور اخوت و مساوات کی فضا کی

وجہ سے بھی وہ موالی جو علوم و فنون کے میدان میں آگے نکلے، انتہائی عزت و وقار کے حامل ہوئے۔



حوالہ جات:

۱۔ حمورابی کا زمانہ ۲۳۳۲ ق م۔ ۲۲۸۸ ق م ہے، مؤرخین کا قیاس ہے کہ حمورابی حضرت ابراہیمؑ کا ہمعصر تھا۔ بابل کے ایک مینارے پر اس کے قوانین کندہ ملے ہیں، جو توراۃ کے احکام سے بہت مشابہہ ہیں، ممکن ہے یہ احکام حضرت ابراہیم کی شریعت کے ہوں جن کو حمورابی نے سنا اور قبول کیا۔ (تاریخ ارض القرآن، جلد ۱، ص ۱۳۹)

۲۔ فنیقیہ یا فینیقی عرب تھے جو شام و فلسطین کے سواحل بحر ابیض (بحر روم) پر آباد تھے۔ توراۃ میں ان کو آرامی کہا گیا ہے۔ ان کے دار الحکومت کا نام تائر تھا۔ یہ دنیا کی سب سے پہلی تاجر اور ایشیا سے یورپ کا سفر کرنے والی قوم سمجھی جاتی ہے اور یہی قوم ہے جس نے ایک طرف افریقہ میں قرطاجنہ جیسے مرکز علم و فن کو جنم دیا تو دوسری طرف یونانیوں کو تہذیب سکھائی۔ یورپ کا سب سے پہلا متمدن ملک یونان سمجھا جاتا ہے اور یونان کا تمام تر تمدن و علوم و خط فنیقیہ سے ماخوذ ہے اور یہیں سے اس کی ترقی کا آغاز ہوتا ہے۔ عرب تاجر قدیم زمانے میں یونان تک پہنچ چکے تھے وہاں انہوں نے اپنی کوئی تجارتی نوآبادی بھی قائم کرلی تھی۔ یہ بات سید سلیمان ندوی نے پلینی (مشہور جغرافیہ نویس) اور ایک یونانی مصنف اسٹرابو کے حوالے سے لکھی ہے۔ (تاریخ ارض القرآن، جلد ۱، ص ۱۲۶)

۳۔ عاد، ارم بن سام بن نوح کی نسل سے تھے۔ یہ دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی ایک عظیم الشان قوم تھی۔ ایشیا اور افریقہ کا کثیر حصہ اس کے زور وقوت کا تماشاگاہ تھا۔ بڑی بڑی عظیم الشان عمارتیں اس کے دست صنعت کا نتیجہ تھیں۔ اس قوم میں حضرت ہود کو مبعوث کیا گیا (القرآن: سورۃ الاعراف وسورۃ ہود) لیکن ان کی سرکشی میں کمی نہ آئی۔ یہ قوم اپنے غرور، ظلم و جور اور شرک کی بناپر ہلاک کردی گئی۔ حضرت ہود نے مع اپنے پیروکاروں کے عاد کے عذاب سے نجات پائی اور وہ

عذاب سے پہلے ہی عاد کی آبادی سے نکل کر حجاز چلے گئے۔ یہ عاد ثانیہ یا عاد عرب کہلائے جو حضرموت سے سواحل خلیج فارس کے طول میں عراق تک کے علاقوں پر قابض ہو گئے تھے۔

۴ عربوں کی تاریخ میں دو لقمان گزرے ہیں۔ ایک لقمان عاد، جو کہ نیک فطرت بادشاہ تھا، دوسرے حکیم لقمان، جس کا تذکرہ قرآن مجید میں آیا ہے۔

۵ سیرۃ ابن ھشام اور اسد الغابہ میں ہے کہ سوید بن صامت جب حج کرنے کے لئے مدینہ سے مکے آئے اور رسول اللہ ﷺ کو حاجیوں کے درمیان تبلیغ کرتے سنا تو کہا کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں اسی طرح کی ایک چیز "صحیفہ لقمان" میرے پاس بھی موجود ہے۔ آپ کی فرمائش پر اس نے صحیفے کا کچھ حصہ آپ کو سنایا۔ آپؐ نے فرمایا یہ بہت اچھا کلام ہے مگر ہمارے پاس اس سے بھی بہتر کلام ہے، چنانچہ آپؐ نے اسے قرآن سنایا اور اس نے اعتراف کیا کہ بلاشبہ یہ صحیفہ لقمان سے بہتر ہے۔ سوید بن صامت مدینے میں اپنی لیاقت، بہادری، شعر وسخن اور حسب ونسب کی بنا پر "کامل" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ مدینہ واپسی کے کچھ عرصہ بعد جنگ بعاث میں مارا گیا۔

۶ تاریخ ارض القرآن، جلد ۱، ص ۱۸۳ (کتاب مذکور کے بیان کے مطابق عدن کے پاس عاد ثانیہ کا ایک کتبہ ملا ہے، جس میں ہود کا نام بھی مذکور ہے۔ عاد ثانیہ کا یہ کتبہ ۱۸ اھ میں ملا تھا۔)

۷ ثمود، شمالی عرب کی ایک زبردست قوم تھی یہ لوگ جو جزیرہ نمائے عرب کی شمالی اور مغربی پٹی پر قابض تھے، جس کا نام اس زمانے میں وادی القریٰ تھا۔ ان کا دار الحکومت حجر تھا، جسے اب مدائن صالح کہتے ہیں۔ یہ شہر اس قدیم شاہراہ پر واقع ہے جو حجاز سے شام کو جاتی ہے۔ عاد ثانیہ کی طرح ثمود کو بھی فن تعمیر میں کمال حاصل تھا، پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بنانا، پتھروں کے عمارات و مقابر تیار کرنا، اس قوم کا خاص فن تھا، یہ یادگاریں اب تک باقی ہیں (جنہیں میں خود بھی دیکھ چکی ہوں۔ میرا یہ مطالعاتی سفر جون ۱۹۹۷ء میں ہوا) اس قوم کا زمانہ ۱۸۰۰ ق م تا ۱۶۰۰ ق م ہے۔

۸ اہل معین کا زمانہ سبا سے متقدم ہے اور سبا کا زمانہ بلاشک وشبہ ۸۰۰ ق م یا ۹۰۰ ق م سے شروع ہو جاتا ہے۔ معین کے کھنڈر اب تک باقی ہیں۔

۹ "ملکہ (سبا) نے خط پا کر درباریوں سے کہا کہ میرے نام ایک نامہ مقدس آیا ہے، یہ نامہ سلیمان کے پاس سے آیا ہے۔" (النمل: ۲۹-۳۰)

۱۰ ابن الندیم، کتاب الفھرست، ص ۱۵۔

۱۱ سد مآرب کا تذکرہ اسی مقالے کے دوسرے باب میں کیا جاچکا ہے۔ قصر غمدان بیس منزلہ محل تھا، جس کی بالائی منزل کے کمروں میں شیشے استعمال کیے گئے تھے۔ قصر غمدان کو فن ہیئت کا شاہکار مانا گیا ہے۔

۱۲ تاریخ ابن خلدون

۱۳ ایرانی حکومت نے ہرمز اول کے عہد میں کئی نو آبادیاں قائم کی تھیں جو رومی اسیران جنگ پر مشتمل تھیں، ان قیدیوں میں سے بہت سے ایسے تھے جو یونانی ثقافت کے حامل اور ہیئت، طب اور دیگر فنون میں ایرانیوں پر فوقیت رکھتے تھے، بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ حیرہ میں نصرانیت کا سرچشمہ بھی یہی لوگ تھے۔ (فجر الاسلام، ص ۱۸)

۱۴ فجر الاسلام، ص ۱۸۔

۱۵ ابن قتیبہ، عیون الاخبار، جلد ۲، ص ۱۰۳۔ مکے کے قریب رہنے والی قبیلہ ہذیل کی مشہور فاحشہ ظلمہ جب بچی تھی تو ایک مدرسے جاتی تھی جہاں اس کا سب سے دلچسپ مشغلہ یہ تھا کہ دواتوں میں قلم ڈال اور نکال کر کھیلا کرے۔ اس واقعہ سے پروفیسر حمید اللہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قریش کے رشتہ دار قبیلہ ہذیل میں ایسے مدرسے تھے جو خواہ کتنی ہی ابتدائی نوعیت کے ہوں، وہاں لڑکوں کے علاوہ لڑکیاں بھی پڑھنے جاتی تھیں۔ (عھد نبوی کا نظام حکمرانی، ص ۱۸۷۔)

۱۶ ابن ہشام، جلد ۲، ص ۲۰۷۔

۱۷ البقرہ: ۷۹۔

۱۸ فجر الاسلام، ص ۱۶۲۔

۱۹ قس بن ساعدۃ الایادی، امیہ بن ابی الصلت اور عدی بن زید وغیرہ کے اشعار میں دینی تعلیمات کا غلبہ ہوتا تھا۔ یہ لوگ رہبانیت کا درس، غور و فکر کی دعوت اور حوادث ارضی و سماوی سے عبرت حاصل کرنے کا سبق دیتے تھے۔ ان عرب نصاریٰ نے عربی زبان میں بہت سے ایسے الفاظ و تراکیب داخل کر دی تھیں جنہیں اس سے قبل عرب نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ اہل لغت بیان کرتے ہیں کہ امیہ بن ابی الصلت ہی نے عربوں کو "باسمک اللھم" کہنا سکھایا

اور قس بن ساعدہ الایادی پہلا شخص تھا جس نے ''اما بعد'' پہلے پہل بولا تھا۔

۲۰ عرب کے تیرہ مقامات پر بڑے بڑے میلے لگتے تھے، دومۃ الجندل، مشقر، صحار، دبا، شجرہ، عدن، صنعا، حضرموت، عکاظ، ذوالمجاز، منیٰ، خیبر اور یمامہ سب سے پہلے دومۃ الجندل میں میلہ لگتا، یہ علاقہ شام کے پاس حجاز کی آخری سرحد پر واقع ہے، ربیع الاول میں لگنے والے اس میلے میں عرب کے علاوہ عراق اور شام کے تاجر بھی بازار لگاتے تھے۔ دومۃ الجندل سے میلہ اکھڑ کر دمشق و بحرین میں آکر جمتا تھا، یہ میلہ پورے جمادی الاولیٰ کے مہینے میں رہتا تھا۔ یہ ایران کے قریب تھا، اس لئے یہاں ایرانی تاجر بھی آتے تھے۔ اکیسویں رجب سے صحار (عمان) میں سوداگر جمع ہونے شروع ہوتے۔ رجب کی آخری تاریخ کو عمان کی بندرگاہ دبا میں بازار لگتا تھا، یہاں ہندوستان، سندھ، چین اور افریقہ سے تاجر آتے تھے۔ یہاں سے اٹھ کر تمام سوداگر شجرہ میں جمع ہوتے تھے جو بحرعرب کے ساحل پر حضرموت اور عمان کے بیچ میں واقع ہے، نصف شعبان سے یہاں میلہ شروع ہوتا تھا۔ شجرہ کے بعد یکم سے ۲۰ رمضان تک عدن میں بازار لگتا تھا، سلاطین یمن اس بازار کا انتظام کرتے۔ عدن کے بعد صنعاء کے میلے کا زمانہ آتا تھا، صنعاء یمن کا پایہ تخت تھا۔ اواخر رمضان تک یہاں چہل پہل رہتی تھی۔ یہاں سے کچھ لوگ لوٹ کر حضرموت چلے جاتے تھے، وہاں بھی میلہ لگتا تھا البتہ زیادہ تر لوگ عکاظ آجاتے تھے۔ عکاظ کا مشہور بازار عرفات کے قریب لگتا تھا، یہ میلہ ذیقعدہ کے نصف آخر میں شروع ہوتا اور ذوالحجہ کا چاند دیکھ کر چھٹ جاتا اور سب لوگ ذوالمجاز کے بازار میں اٹھ آتے۔ یہ میلہ مین مکہ میں لگتا تھا اور ۹ ذی الحجہ تک جمتا، بعدازاں لوگ حج کرکے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے پھر نئے سال سے نیا پھیرا شروع ہوجاتا۔ (امام مرزوقی، کتاب الامکنہ و الازمنہ، جلد۲، ص۱۶۱-۱۶۵)۔

۲۱ حمید اللہ، عہد نبوی میں نظام حکمرانی، ص ۱۸۷۔

۲۲ مرزوقی، کتاب الامکنہ والازمنہ، جلد۲، ص۱۶۱-۱۶۶۔

۲۳ سبع معلقات، جنہیں ''سموط'' بھی کہتے ہیں، ان کے متعلق غالب رائے یہ ہے کہ یہ وہ سات قصائد تھے جو عربوں میں منتخب اور پسندیدہ تھے، جنہیں آب زر سے وصلیوں پر لکھوا کر اظہار مقبولیت اور دوامی شہرت کے لئے کعبہ پر آویزاں کردیا گیا تھا، چنانچہ ان میں سے بعض فتح مکہ

کے دن تک وہاں لٹکے ہوئے تھے، اور کچھ اس آگ کی نذر ہو گئے تھے جو اسلام سے قبل خانہ کعبہ میں لگی تھی۔ ان سات قصیدوں کے کہنے والے شعراء، امرؤ القیس، زہیر بن ابی سلمیٰ، طرفہ بن العبد، لبید بن ربیعہ، عنترہ بن شداد، عمرو بن کلثوم اور حارث بن حلزہ ہیں۔ ابن کثیر آخر الذکر دو ناموں کی جگہ نابغہ ذبیانی اور علقمہ بن عبدہ کا نام لکھتا ہے۔ (البدایہ والنہایہ)

۲۴۔ البلاذری، فتوح البلدان، ص ۷-۴۵۶؛ ابن الندیم، الفہرست، ص ۱۴۔ ابن خلدون کا بیان ہے کہ جس شخص نے اہل حیرہ سے سب سے پہلے کتابت سیکھی وہ سفیان بن امیہ یا حرب بن امیہ تھا جس نے اسلم بن سدرہ سے کتابت سیکھی۔ ابن خلدون کا خیال ہے کہ حجازیوں نے لکھنا، اہل حیرہ سے سیکھا اور اہل حیرہ نے تبابعہ اور حمیر سے۔ (مقدمہ، جلد۲، ص) ابن الندیم کا بیان ہے کہ اہل حیرہ نے انبار سے عربی رسم الخط سیکھا۔ (الفہرست، ص ۱۴)

۲۵۔ البلاذری، فتوح البلدان، ص ۴۵۷ - ۴۵۸۔

۲۶۔ ایضاً۔

۲۷۔ الفہرست، ص ۱۵۔

۲۸۔ ہاشم، عبد شمس، مطلب اور نفیل، یہ چاروں عبد مناف بن قصی کے بیٹے تھے۔ تاریخ میں ہاشم اور مطلب کے خاندان کا ذکر ایک ساتھ آتا ہے اور مصارف خمس میں بنو مطلب، بنو ہاشم کے ساتھ محسوب ہوتے تھے۔

۲۹۔ عامر بن فہیرہ مولیٰ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی کنیت ابو عمرو تھی، وہ طفیل بن عبداللہ بن سنجرہ (ابن سعد کے مطابق طفیل بن حارث) کے غلام تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے انہیں خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ وہ سیاہ فام تھے، رسول اللہ ﷺ کے دار الارقم میں داخل ہونے اور دعوت عام دینے سے پہلے اسلام لائے۔ ہجرت مدینہ کے سفر میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے رفیق سفر تھے۔ بدر اور احد میں شریک ہوئے۔ ۴ھ میں بئر معونہ کے واقعہ میں شہید ہوئے۔ ان کو عامر بن طفیل نے شہید کیا۔ اس وقت ان کی عمر چالیس برس تھی۔ شہادت کے بعد ان کی لاش نہیں ملی۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں ملائکہ نے دفن کیا۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد۳، ص ۲۳۰؛ الاستیعاب، جلد۲، ص ۲۹۶، ۲۹۷۔)

۳۰۔ الاستیعاب، جلد۱، ص ۶۹، (ابن کثیر کے مطابق سراقہ بن جعشم کو پروانہ آزادی لکھ کر دینے

والے حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے۔ البدایہ والنہایہ، جلد ۷، ص ۱۵۱۔)

۳۱۔ الطبقات الکبریٰ، جلد ۱، ص ۲۶۵ وبعدہ۔

۳۲۔ ابن کثیر نے البدایۃ والنہایۃ میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ امیہ بن ابی الصلت، ابوسفیان اور چند دیگر لوگوں کے ساتھ تجارت کے سلسلے میں شام جا رہا تھا تو امیہ منزل بہ منزل ٹھہر کر اپنے سامان سفر میں سے ایک کتاب نکالتا اور اپنے ہم سفر ساتھیوں کو پڑھ کر سناتا جاتا تھا۔

۳۳۔ ابن ابی اصیبعہ، طبقات الاطباء، جلد ۱، ص ۱۱۳۔

۳۴۔ اردو دائرۃ معارف اسلامیہ، جلد ۶، ص ۱۰۴۳۔

۳۵۔ مقاتل کی روایت ہے کہ نضر بن حارث تجارت کے لئے فارس جایا کرتا تھا اور وہاں سے عجمیوں کی کتابیں اور قصے خرید لاتا اور وہ قریش کو سناتا اور ان سے کہتا "ان محمد یحدثکم حدیث عاد و ثمود و انا احدثکم حدیث رستم و اسفندیار" یعنی (محمد تم سے عاد و ثمود کے قصے بیان کرتے ہیں اور میں تمہیں رستم واسفندیار کے (زیادہ دلچسپ) واقعات سناتا ہوں۔) (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱۸، ص ۱۳۶)

۳۶۔ *A Literary History of Persia*، جلد ۱، ص ۹۳۔

۳۷۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۳، ص ۶۷۲ (مادہ "ایران" مقالہ نگار مقبول بیگ بدخشانی)۔

۳۸۔ دوسرے ساسانی فرماں روا شاپور اول (۲۴۰ء۔ ۲۷۲ء) کے زمانے میں مانی کا ظہور ہوا۔ یہ ۲۱۵ء یا ۲۱۶ء میں بابل میں پیدا ہوا، وہ ایک ٹانگ سے لنگڑا تھا، اس کی ماں اشکانی خاندان کی ایک شاہزادی تھی اور باپ، جس کا نام ابن الندیم کی فہرست کے مطابق "فوتق" تھا، عیسائیوں کے فرقہ مغتسلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ مانی کی ابتدائی تعلیم انہی عقائد کے مطابق ہوئی، مانی نے ۲۴ سال کی عمر میں شاپور کی تاج پوشی کے دن اپنی نبوت کا اعلان کیا۔ شاپور نے بھی یہ مذہب قبول کرلیا، جس کی وجہ سے مانویت تیزی سے ایران میں پھیلنے لگی۔ مذہب زرتشت کے مذہبی قائدین کو اس صورت حال سے تشویش تھی، بالآخر انہوں نے شاپور کی اجازت سے دربار کے اندر مانی سے مناظرہ کیا اور اسے شکست دی، اپنے پیغمبر کی شکست سے بددل ہوکر شاپور نے مانی کے قتل کا حکم دے دیا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلا اور کشمیر اور تبت کا دورہ کرتا ہوا چینی ترکستان پہنچا جہاں اس کے مذہب کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔

شاپور کی وفات پر اس کا بڑا بیٹا ہرمز تخت نشین ہوا تو مانی کو ایران آنے کی دعوت دی گئی۔ مانی ایران واپس آیا تو اس کے ساتھ بہتر سلوک کیا گیا، دو سال بعد ہرمز کا انتقال ہوگیا اور اس کا بھائی بہرام تخت نشین ہوا۔ مانی نے بہرام کے سامنے اپنے عقائد پیش کیے۔ بہرام نے مانی اور موبدوں (زرتشتی مذہبی قائدین) کے درمیان دوبارہ مناظرہ کرایا، جس میں مانی کو پھر شکست ہوئی۔ اس بار مانی کو گرفتار کر کے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ اس کی کھال کھینچی گئی اور اس میں بھس بھر کر جندی شاپور کے دروازے پر لٹکا دی گئی۔ جس کی نسبت سے اب تک یہ "دروازۂ مانی" کے نام سے موسوم ہے۔ ۲۷۵ء میں جب کہ وہ قتل کیا گیا، اس کی عمر ساٹھ سال تھی، اس کے بعد اس کے پیروؤں پر مصیبت آئی اور ہزاروں کی تعداد میں بڑی بے رحمی سے مارے گئے۔ (نگار سجاد ظہیر، مطالعہ تہذیب، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۹۲، ۹۳۔)

۳۹ ظہیر، نگار سجاد، مطالعہ تہذیب، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۹۳۔

۴۰ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مادہ "ایران"، مقالہ نگار مقبول بیگ بدخشانی، جلد ۳، ص ۶۷۳۔

۴۱ نصر، سید حسین، Science and Civilization in Islam، سہیل اکیڈمی، لاہور، طبع ثانی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۸۸۔

۴۲ تھامس آرنلڈ اور الفریڈ گیام، The Legacy of Islam، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن، ۱۹۵۳ء، ص ۳۱۳۔

۴۳ اس ضمن میں کتب احادیث (خصوصاً صحاح ستہ) دیکھی جا سکتی ہیں۔ جن میں عموماً "باب العلم" کے تحت متعدد حدیثوں کا بیان موجود ہے۔ صحاح ستہ میں علم، علما، تعلیم، تعلم کی اہمیت و فضیلت پر وافر مواد موجود ہے، احادیث کے اکثر مجموعوں میں "علم" کو ابتدائی چند ابواب میں جگہ دی گئی ہے چنانچہ صحیح بخاری میں "بدء الوحی" اور "کتاب الایمان" کے بعد "کتاب العلم" لائی گئی ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

۴۴ الاستیعاب، جلد ۲، ص ۵۳۸؛ الاصابہ، جلد ۳، ص ۲۳۔

۴۵ الطبقات الکبریٰ، جلد ۲، ص ۲۲؛ کتاب الاموال، ص ۱۱۶ (ایک محدث نے اس واقعہ کو 'جواز المعلم المشرک' کے عنوان کے تحت لکھا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غیر مسلموں سے علم سیکھنا مسلمانوں کے لیے قطعی جائز ہے۔ خطبات بہاولپور، ص ۳۱۲)

۴۶ الطبقات الکبریٰ، جلد۳، ص ۱۱۷۔

۴۷ ابن سعد نے مدینہ کی سب سے پہلی مسجد، مسجد زریق کو قرار دیا ہے، جہاں سب سے پہلے قرآن پڑھا گیا تھا۔ (طبقات الکبریٰ)

۴۸ اس تعلیمی وفد میں یہ معلمین شامل تھے۔ مرثد بن ابی مرثد غنوی (حلیف حمزہ بن عبدالمطلب) خالد بن بکیر (حلیف بن عدی بن کعب) عاصم بن ثابت بن ابی الاقلح (اخا بنی عمرو بن عوف)، خبیب بن عدی (اخا بنی جحجی بن کلفہ بن عمرو بن عوف)، زید بن دثنہ (اخا بنی بیاضہ بن عامر)، عبداللہ بن طارق (حلیف بنی ظفر)، تاریخ طبری، جلد۲، ص ۵۳۸۔

۴۹ تاریخ طبری، جلد۲، ص ۵۳۹؛ مسعودی، التنبیہ و الاشراف، ص ۴۷۔

۵۰ صفۃ الصفوۃ، جلد۱، ص ۱۷۰، تاریخ طبری، جلد۲، ص ۵۴۶۔

۵۱ صفر ۴ھ میں بنی عامر بن صعصعہ کا رئیس ابوالبراء عامر بن مالک بن جعفر مدینہ آیا، رسول اللہ ﷺ نے اس کے سامنے اسلام پیش کیا۔ وہ اسلام تو نہ لایا مگر رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ اپنے اصحاب میں سے بعض کو اہل نجد کے پاس بھیجیں تا کہ یہ ان کو اس دین کی دعوت دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے جب اس اندیشے کا اظہار کیا کہ کہیں اہل نجد انہیں تنگ نہ کریں، تو ابو براء نے اپنی حفاظت کا یقین دلایا۔ اس پیش بندی کے بعد آپؐ نے اپنے بہترین چالیس صحابہ کو ابو براء کے ساتھ روانہ کر دیا۔ تاہم انہیں بئر معونہ کے مقام پر دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔ (تاریخ طبری، جلد۲، ص ۵۴۵؛ الطبقات الکبریٰ، جلد۲، ص ۳۷)

۵۲ زید بن ثابت کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے فارسی زبان اسی طرح سیکھی۔ (خطبات بہاولپور، ص ۳۰۹)

۵۳ معاذ بن جبل بن عمرو بن اوس الانصاری الخزرجی کی کنیت ابوعبدالرحمٰن تھی۔ مدینہ کے رہنے والے تھے، عالم شباب میں مسلمان ہوئے، بیعت عقبہ میں حاضر تھے۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے درمیان مواخاۃ قائم کی تھی۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت جعفرؓ بن ابی طالب میں مواخاۃ قائم کی گئی، یہ بات اس لئے قرین قیاس نہیں کہ جعفر اس وقت حبشہ میں تھے اور فتح خیبر کے سال مدینہ آئے تھے۔ حضرت معاذؓ نے بیس سال کی عمر میں غزوہ بدر میں شرکت کی

اور دیگر مشاہد میں بھی حاضر رہے۔ قرآن کے مستند قاری اور جید عالم تھے۔ ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ قول ملتا ہے "چار اصحاب یعنی ابن مسعود، ابی بن کعب، معاذ بن جبل اور سالم مولی ابو حذیفہ سے قرآن سیکھو۔" حضرت معاذ، رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے وقت یمن میں تھے جنہیں رسول اللہ ﷺ نے وہاں کا والی بنایا تھا۔ مگر حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں مدینہ واپس آ گئے۔ حضرت عمرؓ کے مشیر رہے، حضرت عمرؓ ان کے علم و فضل کی وجہ سے ان کے مشوروں کو بڑی اہمیت دیتے۔ ایک بار یہاں تک کہا کہ "اگر معاذ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔" حضرت معاذ شام کی مہمات میں حضرت ابو عبیدہ کے ساتھ رہے۔ حمص کی جامع مسجد میں ان کا حلقہ درس تھا، جہاں بہت سے معمر صحابہ بھی حاضر ہوتے۔ ۱۸ھ میں طاعون عمواس میں ۳۸ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ (تذکرۃ الحفاظ، جلد ا، ص ۱۹ - ۲۱؛ الطبقات الکبریٰ، جلد ۲، ص ۳۳۶؛ الاصابہ، جلد ۷، ص ۱۰۶ - ۱۰۷؛ الاستیعاب، جلد ۳، ص ۱۴۰۲ - ۱۴۰۷؛ جوامع السیرۃ، ص ۳۰)

۵۴ تاریخ طبری، جلد ۳، ص ۳۱۸۔

۵۵ عبادہ بن صامت کا تعلق عوف بن خزرج کے خاندان سے تھا۔ ان کی کنیت ابو الولید تھی، ان کی والدہ قرۃ العین بنت عبادہ بن نضلہ ابن مالک بن عجلان تھیں۔ عبادہ بیعت عقبہ اولیٰ، ثانیہ اور ثالثہ میں شریک تھے، انہیں بنو خزرج کا نقیب بھی بنایا گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبادہ اور حضرت ابو مرثد غنوی کے درمیان مواخات قائم کی تھی۔ عبادہ، غزوۂ بدر اور اس کے بعد تمام مشاہد میں شریک رہے۔ امیر معاویہؓ کی خلافت کے دوران، شام میں انتقال کیا، ان کی قبر بیت المقدس میں ہے۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد ۳، ص ۶۲۱؛ الاستیعاب، جلد ۲، ص ۸۰۸؛ سیر الاعلام النبلاء، جلد ۲، ص ۱ - ۵)

۵۶ آپ کی کنیت ابو الدرداء، عویمر بن زید نام اور نسب یوں ہے، ابو الدرداء عویمر بن زید الانصاری الخزرجی۔ والد کے نام میں اختلاف ہے، بعض نے عبد اللہ اور بعض نے ثعلبہ بتایا ہے۔ آپ کو "حکیم الامت" کہا جاتا تھا۔ جنگِ بدر کے بعد اسلام لائے۔ جنگ احد میں شریک تھے، آپ نے قرآن حکیم براہ راست رسول اللہ ﷺ سے حفظ کیا تھا۔ اہل شام کے عالم اور دمشق کے فقیہ اور قاضی بھی تھے۔ جامع دمشق میں ان کا حلقہ درس تھا، درس میں

سامعین کا ہجوم ہوتا، ایک وقت میں ان سامعین کی تعداد سولہ سو تک پہنچی۔ جب بھی حضرت معاویہ کو باہر جانے کی ضرورت ہوتی تو وہ بھی بھی حضرت ابو الدرداء کو اپنا قائم مقام بنا جاتے۔ ۳۲ھ/۶۵۲ء کے لگ بھگ دمشق میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ (تذکرۃ الحفاظ، جلد ا، ص ۲۴-۲۵؛ الاستیعاب، جلد ۴، ص ۸-۱۶۴۶؛ الاصابہ، جلد ۵، ص ۴۶)

۵۷ الطبقات الکبریٰ، جلد ۲، ص ۳۵۷؛ الاستیعاب، جلد ۴، ص ۶۴۶۔

۵۸ عبداللہ ابن مسعودؓ ہذلی تھے، بنی زہرہ بن کلاب کے حلیف، ابو عبدالرحمٰن کنیت تھی، رسول اللہ ﷺ کے دار الارقم میں داخل ہونے سے قبل اسلام لائے۔ دونوں ہجرتیں کیں، بدر، احد، خندق اور تمام مشاہد میں شریک تھے۔ حمص چلے گئے تھے، تا آنکہ حضرت عمرؓ نے انہیں معلم اور وزیر بنا کر کوفہ بھیجا۔ کوفہ میں مسجد کے پاس ان کا گھر تھا۔ پھر عثانی خلافت کے زمانے میں مدینہ آگئے۔ وہیں ۳۲ھ میں وفات پائی۔ بقیع میں دفن ہوئے۔ جید عالم اور بہترین معلم قرآن تھے۔ حدیث بیان کرنے میں بے حد محتاط اور روایت کے سلسلے میں تشدد سے کام لیتے تھے۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد ۳، ص ۱۵۰-۱۵۹؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد ا، ص ۱۳-۱۶)

۵۹ آپ کی کنیت ابو موسیٰ اور نام عبداللہ تھا۔ پورا نسب یوں ہے ابو موسیٰ عبداللہ بن قیس بن سلیم بن حضار الاشعری۔ آپ نے رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کی اور جعفر بن ابی طالب کی معیت میں فتح خیبر کے وقت خیبر پہنچے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت معاذ بن جبل کو یمن کے دو الگ الگ صوبوں پر امیر مقرر کیا۔ حضرت عمرؓ کی طرف سے کوفہ اور بصرہ کے بھی گورنر رہے۔ آپ سے علم حدیث حاصل کرنے والوں میں طارق بن شہاب، سعید ابن مسیب، اسود، ابو وائل، ابو عبدالرحمٰن سلمی، ربعی بن ابن خراش اور ابو عثمان کے علاوہ دیگر لوگ شامل ہیں، آپ بصرہ کے صف اول کے فقہا میں سے ایک تھے۔ صفوان کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ان چار حضرات یعنی حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت معاذؓ بن جبل اور حضرت ابو موسیٰؓ کے سوا کوئی فتویٰ نہیں دیتا تھا۔ ۴۴ھ میں وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ، جلد ا، ص ۲۳، ۲۴؛ الاصابہ، جلد ۴، ص ۱۱۹-۱۲۰)

۶۰ الطبقات الکبریٰ، جلد ۳، ۱۵۷؛ الاستیعاب، جلد ۳، ص ۹۹۲؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد ا، ص ۱۴۔

۶۱ تذکرۃ الحفاظ، جلد ا، ص ۳۰، ۳۶۔

۶۲ عمران بن حصین کی کنیت ابو نجید تھی۔ عرب کے مشہور قبیلہ بنو خزاعہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ بصرہ کے قاضی بھی رہے۔ زہریلے پھوڑوں کی وجہ سے اکثر بیمار رہتے۔ کتب حدیث میں ان کی روایات بڑی تعداد میں مذکور ہیں، آپ کا شمار بڑے زیرک اور فاضل صحابہ میں ہوتا تھا۔ جنگ صفین سے کنارہ کش رہے تھے۔ ۵۲ھ میں حضرت معاویہؓ کی خلافت کے دوران انتقال کیا۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد۴، ص ۲۸۷-۲۹۱؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد۱، ص ۲۹، ۳۰۔)

۶۳ تذکرۃ الحفاظ، جلد۱، ص ۲۹۔

۶۴ تاریخ طبری، جلد۴، ص ۲۰۲۔

۶۵ الطبقات الکبریٰ، جلد۴، ص ۲۸۹۔

۶۶ کتاب الاموال، ص ۲۴۳۔

۶۷ حضرت نافع کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر کا مولیٰ ہونے کی وجہ سے عدوی کہلاتے ہیں۔ نیشاپور کے رہنے والے تھے۔ ابن عمر کو جنگوں میں ملے تھے، ان کی زبان میں لکنت تھی۔ مدینہ میں سکونت رکھتے تھے۔ اپنے آقا حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت رافع بن خدیجؓ، حضرت ابولبابہؓ اور صحابہؓ کی ایک جماعت سے علم حدیث حاصل کیا۔ آپ سے ایوب، عبیداللہ ابن عمر، ابن عون، ابن جریج، امام اوزاعی، امام مالک، عقیل بن خالد، لیث بن سعد اور دوسرے بہت سے لوگ روایت کرتے ہیں۔ یہی نافع تھے جن کو حضرت عبداللہ ابن جعفر ہزاروں درہم کے عوض حاصل کرنا چاہتے تھے مگر حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے انہیں آزاد کردیا، بیچا نہیں۔ نافع کا انتقال ۱۱۷ھ میں ہوا۔
(تذکرۃ الحفاظ، جلد۱، ص ۹۹-۱۰۰؛ المعارف، ص ۲۰۳)

۶۸ نکلسن، *A Literary History of the Arabs*، ص ۵-۱۹۴۔

۶۹ ابن الندیم، الفہرست، ص ۱۱۸۔ عبید بن شریہ جرہمی حضرت معاویہؓ کے عہد میں گزرا ہے۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کا زمانہ بھی پایا تھا مگر آپؐ سے ملاقات نہیں کی۔ عبید کا انتقال عبدالملک کے دور خلافت میں ہوا۔

۷۰ نکلسن، ص ۵-۱۹۴۔

۷۱ الفہرست، ص ۳۰۰ (خالد ابن یزید کے لئے کتب کیمیا کے ترجمے کے لئے ''اصطفن قدیم''

کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ الفھرست، ص ۳۰۲)

۲ے ایضاً، ص ۳۳۳، (ابن الندیم، خالد بن یزید کے لئے خطیب، شاعر، فصیح اور صاحب الرائے کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔)

۳ے ڈاکٹر غلام جیلانی برق، یورپ پر اسلام کے احسان، ص ۱۳۷۔

۴ے ابن عبدالبر، جامع بیان العلم، مصر، ص ۳۶۔

۵ے اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱/۱۳، ص ۱۷۷۔

۶ے امام ابن شہاب زہری کی کنیت ابوبکر، نام محمد بن مسلم اور لقب "اعلم الحفاظ" تھا۔ قریش کے مشہور قبیلہ بنو زہرہ کی طرف منسوب اور مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے۔ ۵۰ھ میں پیدا ہوئے، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، سہل بن سعدؓ، انس بن مالکؓ، محمود بن ربیعؓ، سعید ابن مسیبؒ، ابو امامہ بن سہلؓ اور اس طبقہ کے دوسرے صحابہ اور کبار تابعین سے علم حدیث حاصل کیا۔ انہوں نے طلب علم میں حد درجہ کوشش کی حافظہ بہترین تھا۔ (تذکرہ الحفاظ، جلد ۱، ص ۱۰۸-۱۱۳)

۷ے اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱/۱۳، ص ۱۷۷۔

۸ے مقدمہ ابن خلدون، جلد ۲، ص ۳۲۳۔

۹ے ایضاً، ص ۲۲۷ - ۲۲۸۔

۱۰ے فجر الاسلام، ص ۱۵۳۔

۱۱ے عقد الفرید، جلد ۳، ص ۳۱۵ - ۳۱۶۔ یہی واقعہ گولڈ زیہر، الادیمیری (جلد ۲، ص ۱۰۷) کے حوالے سے بیان کرتا ہے، وہاں یہ مکالمہ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان اور ابن شہاب زہری کے درمیان ہوتا ہے۔ دیکھیے: Ignaz Goldziher (1850-1921) *Muslim Studies*,(Muhammedanische Studien) translated from the German by C.R.Barber & S.M.Stern,Chicago,Vol.1,P.110.

یہ تفاوت اس کہانی کا جھوٹ کھول دیتا ہے۔

۱۲ے یاقوت بن عبداللہ، معجم البلدان، جزء الثانی، ص ۳۵۴، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء۔

۸۳ الفہرست، ص ۱۱۷۔

۸۴ وہب بن منبہ کی کنیت ابو عبداللہ تھی، یمن کے باشندے تھے، ۳۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے پاس اہل کتاب کے علم کا وسیع ذخیرہ تھا۔ انہوں نے زیادہ تر توجہ اسی طرف مبذول رکھی اور کامیاب رہے۔ ان کی احادیث ان کے بھائی ہمام کے واسطے سے صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ ہمام کے پاس تحریر شدہ احادیث کا ایک مشہور مجموعہ تھا جو ان سے معمر روایت کرتے ہیں اور صحاح ستہ میں اس کا بیشتر حصہ نقل ہو چکا ہے۔ وہب کے والد فارس کے شہر ہرات کے رہنے والے تھے۔ کسریٰ، شہنشاہ ایران نے انہیں یمن فتح کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں سلام قبول کیا۔ صنعا شہر میں عہدہ قضاء پر مامور رہے۔ ۱۱۴ھ میں انتقال کیا۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۵۴۳؛ المعارف، ص ۲۰۲؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۱۰۰-۱۰۱۔)

۸۵ عروہ کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔ قریش کے مشہور خاندان بنو اسد سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ سیرۃ النبی کے بڑے عالم، نامور محقق اور حافظ تھے۔ آپ کے درس حدیث میں طلبہ کا ازدحام ہوتا تھا۔ انہوں نے یوم حرہ میں اپنی بہت سی کتب، جو فقہ سے تعلق رکھتی تھیں، جلا دی تھیں۔ بعد میں اپنے اس اقدام پر افسوس کرتے تھے۔ ان کا انتقال ۹۴ھ میں ہوا۔ اس سال کو فقہا کی کثرت وفات کی وجہ سے "سنہ الفقہا" کہا جاتا ہے۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۱۷۸؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۶۲۔)

۸۶ سعید ابن مسیب ابن حزن بن ابی وہب بن عمرو بن عائذ بن عمران بن مخزوم بن یقظہ، حضرت عمرؓ کی خلافت کے دوسرے سال میں پیدا ہوئے۔ ان کے اساتذہ میں حضرت زید بن ثابت، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر شامل تھے۔ نیز وہ حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کے پاس بھی جاتے تھے۔ ان کی اکثر روایات کی سند حضرت ابو ہریرہ سے ہے، جن کے وہ داماد تھے۔ ابن مسیب کی علمیت کا یہ عالم تھا کہ وہ فتوے دیا کرتے تھے، دراں حالیکہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب زندہ تھے۔ خود ان کا دعویٰ تھا کہ رسول اللہ ﷺ، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے فتاویٰ کا ان سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ "فقیہ الفقہا" اور "عالم العلما" کہلائے گئے۔ کئی اموی خلفا کا زمانہ پایا لیکن کسی کو خاطر میں نہ

لائے۔ ایام حرہ میں مسجد نبوی میں نمازوں کی ادائگی کرتے، یزید کی بیعت نہ کی۔ ان کی وفات مدینہ میں ۹۴ھ میں ولید بن عبدالملک کے دور خلافت میں ہوئی۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد۵، ص۱۱۹-۱۳۹؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد۱، ص۵۴-۵۶۔)

۸۷۔ سلیمان کے والد یسار، مسلم بن یسار، ام المومنین حضرت میمونہؓ کے غلام تھے۔ ان کے چار بیٹے عطا بن یسار، مسلم بن یسار، سلیمان بن یسار اور عبدالملک بن یسار، سب کے سب فقیہ تھے۔ سلیمان ابن یسار نے میمونہؓ بنت حارث ہلالیہ سے مکاتبت کرلی تھی۔ لہٰذا ان کے موالی تھے، ان کی کنیت ابوتراب تھی، بنی حدیلہ میں رہتے تھے، حضرت عمر بن عبدالعزیز کی جانب سے جو اس زمانے میں ولید بن عبدالملک کی طرف سے والیٔ مدینہ تھے۔ بازار مدینہ کے نگران تھے۔ ثقہ، بزرگ و بلند مرتبہ فقیہ اور کثیر الحدیث تھے۔ ۷۳ برس کی عمر میں ۱۰۳ھ یا ۱۰۷ھ میں وفات پائی۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد۵، ص۱۷۴؛ المعارف، ص۲۶۱؛ صفۃ الصفوۃ، جلد ۲، ص۴۵؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد۱، ص۹۱)

۸۸۔ زید بن ثابت بن ضحاک بن زید بن لوذان بن عمرو بن عبدعوف بن غنم بن مالک بن نجار الانصاری الخزرجی، رسول اللہ ﷺ کے نامور صحابی اور کاتب وحی تھے۔ ان کی عمر چھ سال تھی۔ جب ہجرت سے پانچ سال قبل ان کے والد جنگ بعاث میں مارے گئے۔ ان کی والدہ النوار بنت مالک بن معاویہ بن عدی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ جب ہجرت کرکے مدینہ آئے تو زید تیرہ برس کے نوجوان تھے، رسول اللہ ﷺ کی ہدایت پر یہود مدینہ سے فن خط و کتابت عبرانی سیکھا۔ قرآن کے جید حافظ اور علم الفرائض کے ماہر تھے۔ ان کا اہم کام جمع و تدوین قرآن کا ہے جو انہوں نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دور میں انجام دیا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں مدینہ منورہ کے قاضی بھی رہے۔ حضرت عمرؓ نے ان کی باقاعدہ تنخواہ مقرر کی۔ سن وفات میں اختلاف ہے۔ ۴۵ھ یا ۵۴ھ یا ۵۵ھ میں وفات پائی۔ ان کے معاصران کی تیز فہمی، ذکاوت اور علم و فضل کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کے علم و فضل کی بنا پر انہیں حبر امت کہا جاتا تھا۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد۲، ص۳۵۷؛ ابن حجر العسقلانی، الاصابہ، جلد۳، ص۲۲-۲۳؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد۱، ص۳۰-۳۲)

۸۹۔ رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی عبداللہ ابن عباس کی عمر، وفات رسول اللہ ﷺ کے وقت تیرہ

برس تھی۔ انہوں نے زیادہ تر علم حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابیؓ بن کعب سے حاصل کیا۔ وہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے سے اپنی وفات تک مفتی رہے۔ حضرت علیؓ نے اپنے دور خلافت میں انہیں بصرہ کا والی مقرر کیا تھا۔ وہاں ان کا حلقہ درس بھی تھا، آخیر زمانے میں مکہ مکرمہ چلے گئے، وہاں آپ مسجد حرام میں بیٹھ جاتے اور تفسیر، حدیث، فقہ اور ادب کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ الطبقات الکبریٰ میں ہے کہ وہ ایک دن صرف فقہ کا، ایک دن تفسیر کا، ایک دن مغازی کا، ایک دن شعر و ادب کا اور ایک روز تاریخ عرب کا درس دیا کرتے تھے۔ ۶۸ھ میں طائف میں انتقال ہوا۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد۲، ص ۳۶۵؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد۱، ص۴۰ - ۴۱؛ الاصابہ، جلد۳، ص۹۰ - ۹۴۔)

۹۰ ابو عبدالرحمن سلمی کا نام عبداللہ ابن حبیب ہے، کوفہ کے مشہور معلم قرآن اور عالم دین تھے، انہوں نے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہؓ ابن مسعود سے قرآن کا علم حاصل کیا۔ حضرت عمرؓ سے علم الحدیث حاصل کیا۔ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں علوم القرآن کے لئے مسند درس سنبھالی اور اپنی وفات تک یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔ ان کا انتقال ۷۳ھ یا اس کے کچھ بعد میں ہوا، جبکہ عراق پر بشر بن مروان گورنر تھا۔ (تذکرۃ الحفاظ، جلد۱، ص۶۳)

۹۱ زید بن ثابت کے بیٹے تھے، ان کی والدہ ام سعد جمیلہ بنت سعد، بنی حارث بن خزرج میں سے تھیں۔ خارجہ ابن زید مدینہ کے مشہور فقیہ تھے۔ کبار علما میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی وفات ۱۰۰ھ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد خلافت میں ہوئی۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد۵، ص۲۶۵؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد۱، ص۹۱)

۹۲ انس بن مالک انصاری کی کنیت ابوحمزہ اور لقب خادم رسول اللہؐ ہے۔ ان کی والدہ ام سلیم بنت ملحان تھیں۔ انصار کے مشہور قبیلے بنو نجار سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ہجرت سے لے کر وفات رسول اللہ ﷺ تک آپ کی خدمت کی۔ اس طویل صحبت کے نتیجے میں علم الحدیث میں کمال حاصل کیا۔ حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، ابیؓ بن کعب اور دیگر صحابہؓ سے بھی استفادہ کیا۔ سن وفات میں اختلاف ہے۔ ۹۰ھ تا ۹۳ھ کسی وقت انتقال کیا۔ صحابہؓ میں سب سے آخر میں انتقال کیا۔ (المعارف، ص۱۳۳؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد۱، ص۴۴ - ۴۸)

۹۳ علم سے زیادہ ان کو امور ریاست میں شہرت ملی، یزید بن معاویہ کے بعد خلیفہ ہوئے، ۶۵ھ

میں انتقال کیا۔

۹۴ حضرت عمرؓ کے بیٹے عبداللہ ابن عمر حدیث کے زبردست عالم تھے، تاہم فقہ میں اتنا مرتبہ نہ تھا۔ غزوۂ خندق اور بیعت رضوان میں شریک ہوئے۔ جنگ صفین کے بعد تحکیم کے موقع پر خلافت کے لئے آپ کا نام زیر غور آیا۔ آپ سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو آپ حدیث بیان کرتے، اپنی رائے یا قیاس کا اظہار نہ کرتے۔ ۷۳ھ میں انتقال کیا۔ (تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۳۷-۴۰؛ الاصابہ، جلد ۴، ص ۱۰۷-۱۰۹)

۹۵ طاؤس بن کیسان، بحیر حمیری کے موالی تھے، ان کی ماں بنو حمیر کی مولاۃ تھیں۔ ان کی کنیت ابو عبدالرحمٰن تھی۔ آپ یمن کے شہر جند کے رہنے والے تھے۔ آپ نے حضرت زید ابن ثابت، حضرت عائشہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، زید ابن ارقمؓ، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور بے شمار صحابہؓ سے علم حاصل کیا۔ محمد ابن یوسف (حجاج بن یوسف کے بھائی) نے انہیں بعض علاقوں کا محصل بنایا تھا۔ ۱۰۶ھ میں مکہ میں انتقال کیا۔ خلیفہ وقت ہشام بن عبدالملک نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ طاؤس اہل یمن کے شیخ اور ان کے مفتی تھے۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۵۴۲؛ المعارف، ص ۲۰۱؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۹۰)

۹۶ عطا کی کنیت ابو محمد تھی۔ ان کے والد یسار، ام المومنین حضرت میمونہؓ ہلالیہ کے موالی تھے۔ مدینے کے مشہور فقیہ تھے۔ یہ حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت عائشہؓ، حضرت ابو ایوب انصاریؓ، حضرت اسامہ بن زید، حضرت ابو ہریرہؓ اور دیگر متعدد صحابہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ عالم، محدث اور فقیہ تھے۔ ۱۰۳ھ میں وفات پائی (الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۱۷۳؛ المعارف، ص ۲۰۲؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۹۰)

۹۷ آپ کا نام جابر بن زید تھا۔ عرب کے مشہور قبیلہ ہوازن کی طرف منسوب ہیں۔ آپ چوٹی کے عالم اور حضرت عبداللہ ابن عباس کے خاص شاگرد تھے۔ آپ سے ایک جماعت نے حدیث کا علم حاصل کیا، اہل بصرہ کے مفتی تھے۔ ۹۳ھ میں انتقال کیا۔ (تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۷۲)

۹۸ حضرت ابو رجاء عطاردی کا نام عمران بن ملحان ہے۔ مخضرم ہیں (یعنی آپ نے اسلام اور جاہلیت کے دونوں دور دیکھے) تابعین میں آپ کا شمار کبار علما میں ہوتا ہے۔ آپ فتح مکہ کے

زمانہ میں مسلمان ہوئے، لیکن رسول اللہ ﷺ کو نہ دیکھ سکے۔ کافی عرصہ بعد مدینہ آئے اور حضرات عمرؓ، علیؓ، عمرانؓ بن حصین، ابوموسیٰ اشعریؓ اور دوسرے صحابہؓ سے علم حدیث کا سماع کیا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے قرآن پڑھا اور عبداللہ ابن عباس کو سنایا۔ ثقہ، باشعور اور عالم باعمل تھے۔ ایک سو بیس برس کی عمر میں ۱۰۷ھ کے لگ بھگ وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۶۶)

۹۹ ابوعمرو شعبی ہمدانی کا نام عامر بن شراحیل ہے۔ کوفہ کے رہنے والے تھے۔ شعب ہمدان سے تعلق رکھتے تھے، آپ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ جنگِ جلولاء کے اسیرانِ جنگ میں سے تھیں۔ جلولاء فارس کی ایک بستی ہے (المعارف، ص ۱۹۹)۔ آپ فقہ حدیث میں امامت کے درجہ تک پہنچے ہوئے تھے۔ حفظ و اتقان میں بے نظیر تھے۔ اور مختلف علوم میں بحر ناپیدا کنار۔ انہوں نے حضرات علیؓ، عمران بن حصینؓ، جریر بن عبداللہؓ، ابو ہریرہؓ، ابن عباسؓ، عائشہؓ، عبداللہ ابن عمرؓ، عدیؓ بن حاتمؓ، مغیرہؓ بن شعبہ، فاطمہ بنت قیسؓ اور دیگر صحابہؓ سے روایت کی ہے۔ خود کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے پانچ سو صحابہؓ سے ملاقات کی اور ان سے فیض حاصل کیا۔ آپ کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے۔ کوفہ میں آپ کے حلقہ درس میں بہت ازدحام ہوتا تھا۔ حجاج بن یوسف کے خلاف ابن اشعث کی بغاوت میں شریک رہے، تاہم بعد میں حجاج سے امان طلب کی اور اپنے خروج پر شرمندگی کا اظہار کیا۔ حجاج نے انہیں امان دے دی۔ کوفہ کے قاضی بھی رہے۔ (تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۷۹-۸۸)

۱۰۰ آپ کی کنیت ابوبکر اور ابومحمد، عبداللہ نام اور عبیداللہ ولدیت ہے۔ قریش کے مشہور قبیلہ بنوتیم سے تعلق رکھتے تھے، مکہ میں رہائش رکھتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن زبیر کی خلافت میں مکہ کے قاضی تھے، آپ حرم پاک کے مؤذن بھی رہے۔ فقہ حدیث میں امامت کے درجہ پر فائز تھے۔ آپ کا قول حجت سمجھا جاتا تھا۔ بڑے قادر الکلام، فصیح و بلیغ خطیب تھے۔ عبداللہ ابن زبیر نے اپنے عہد خلافت میں انہیں طائف کا بھی قاضی بنایا تھا۔ وہاں عبداللہ ابن عباس کی مدد سے پیچیدہ مسائل حل کیا کرتے تھے۔ ۱۱۷ھ میں انتقال کیا۔ (تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۱۰۱)

۱۰۱ ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔ مدینہ کے رہنے والے تھے حضرت عبداللہ ابن عباس کے موالی

ہونے کی وجہ سے ہاشمی کہلاتے تھے۔ بربر قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اتنی علمی استعداد پیدا کر لی تھی کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی زندگی ہی میں فتویٰ دینا شروع کر دیا تھا۔ مسلسل چالیس سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ وہ اپنے آقا کے علوم کے جامع تھے اور اپنے وقت میں تفسیر کے سب سے بڑے عالم تھے۔ تاہم خارجی عقیدہ رکھتے تھے۔ ۱۰۵ھ یا ۱۰۷ھ میں مدینہ میں انتقال کیا، اسی سال کی عمر تھی۔ (المعارف، ص ۲۰۱؛ الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۲۸۷، ۲۹۳؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۹۵)

۱۰۲ آپ کی کنیت ابو الحجاج، مجاہد نام اور ولدیت جبر ہے۔ قریش کے مشہور قبیلہ بنو مخزوم کی طرف نسبت ولاء کی بناء پر مخزومی کہلاتے تھے۔ سائب بن ابو سائب مخزومی کے موالی تھے۔ حضرات سعد بن ابی وقاصؓ، عائشہؓ، ابو ہریرہؓ، ام ہانیؓ، عبداللہؓ بن عمر اور ابن عباسؓ سے سماع حدیث کیا۔ ایک عرصہ تک حبر امت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی خدمت میں رہ کر قرآن پڑھا اور اس کی تفسیر سیکھی۔ فقیہ، عالم، ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ مجاہد کی وفات مکہ میں ۱۰۳ھ کے لگ بھگ ہوئی۔ (المعارف، ص ۱۹۴؛ الطبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۳۶۶؛ تذکرہ الحفاظ، جلد ۱، ص ۹۲)

۱۰۳ آپ کی کنیت ابو محمد اور نام عطاء بن اسلم تھا۔ یمن کے مشہور شہر جند میں پیدا ہوئے۔ یہاں کے غلاموں سے تعلق رکھتے تھے۔ ماں حبشن تھیں، جن کا نام برکہ تھا۔ ان کی نشو و نما مکہ میں ہوئی، حضرات عائشہؓ، ابو ہریرہؓ، ابن عباسؓ، ابو سعید خدریؓ، ام سلمہؓ اور دیگر اصحابؓ سے علم حاصل کیا۔ بنو فہر کے موالی تھے، لہٰذا نسبت ولاء کی وجہ سے قریشی کہلاتے تھے۔ انہوں نے ستر حج کیے، مسائل حج کا ان سے زیادہ جاننے والا اور کوئی نہ تھا۔ کم صورت تھے، رنگ سیاہ اور منہ پر چیچک کے داغ تھے۔ کانے، چپٹی ناک والے، لنجے اور لنگڑے تھے۔ بعد میں نابینا ہو گئے۔ تاہم علم، زہد، خدا ترسی میں بے مثال تھے۔ اٹھاسی سال کی عمر میں ۱۱۵ھ میں مکہ میں انتقال کیا۔ (الطبقات الکبریٰ، جلد ۲، ص ۳۸۶، جلد ۵، ص ۳۶۷؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۹۸)

۱۰۴ سعید ابن جبیر، بنو والب کے آزاد کردہ غلام، کوفہ کے مشہور معلم قرآن اور چوٹی کے علما میں سے ایک ممتاز فقیہ تھے۔ حضرات ابن عباسؓ، عدی بن حاتمؓ، عبداللہ ابن عمرؓ، عبداللہ ابن مغفلؓ

وغیرہ سے سماع حدیث کیا۔ حجاج کے خلاف ابن الاشعث کے خروج میں شامل ہونے کی بنا پر حجاج نے انہیں ۹۵ھ میں قتل کرا دیا تھا۔ اس سے قبل وہ حجاج کے مقربین میں شامل تھے اور کوفہ ابو بردہ کو یہ حجاج کا حکم تھا کہ سعید ابن جبیر کے مشورہ کے بغیر کوئی فیصلہ نہ کرے۔ (تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۷۶)

۱۰۵۔ ابوالعالیہ رفیع بن مہران ریاحی بصرہ کے رہنے والے مشہور فقیہ اور نامور معلم قرآن تھے۔ بنو تمیم کے قبیلہ بنو ریاح کی ایک عورت کے آزاد کردہ غلام تھے۔ آپ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو دیکھا تھا۔ حضرت ابی بن کعب اور دوسرے قاری صحابہؓ سے قرآن پڑھا۔ حضرات عمرؓ، علیؓ، عبداللہؓ، ابن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ اور دوسرے ممتاز صحابہؓ سے علم حدیث حاصل کیا۔ ۹۳ھ میں انتقال کیا۔ (تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۶۱)

۱۰۶۔ آپ کی کنیت ابو محمد ہے، ام المومنین حضرت میمونہؓ کے آزاد کردہ غلام اور مدینہ کے مشہور فقیہ تھے۔ مدینہ میں وعظ کہا کرتے تھے۔ حضرات زید بن ثابتؓ، ابوایوب انصاریؓ، عائشہؓ، اسامہ بن زیدؓ، ابو ہریرہؓ اور دیگر متعدد صحابہؓ سے روایت کرتے تھے۔ قابل اعتماد عالم، جلیل القدر محدث اور ممتاز فقیہ تھے۔ ۱۰۳ھ کے لگ بھگ وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۹۰)

۱۰۷۔ محمد ابن سیرین کی کنیت ابوبکر تھی۔ آپ خادم رسول حضرت انس بن مالک کے آزاد کردہ غلام تھے۔ آپ کی والدہ صفیہ تھیں، جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مولاۃ تھیں۔ جب سیرین کی صفیہ سے شادی ہوئی تو رسول اللہ ﷺ کی تین ازواج نے انہیں سجایا، دلہن بنایا اور ان کے حق میں دعا کی۔ نکاح کی تقریب میں اٹھارہ بدری صحابہؓ نے شرکت کی اور ان کے حق میں دعا کی۔ محمد ابن سیرین کی بیوی عربی تھیں۔ (المعارف، ص ۱۹۵) آپ نے حضرات ابو ہریرہؓ، زید بن ثابتؓ، عمران بن حصینؓ، عبداللہ ابن عباسؓ، عبداللہ ابن عمرؓ، انس بن مالکؓ اور دیگر صحابہؓ سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ آپ فقہ حدیث میں امامت کے رتبہ پر فائز تھے۔ ثقہ تھے، تعبیر رؤیا کے بھی ماہر تھے۔ محمد ابن سیرین فارس میں حضرت انس بن مالک کے کاتب تھے۔ (المعارف، ص ۷۷، ۱۳۳، ۱۹۵، ۱۹۶؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۷۷)

۱۰۸۔ شیخ الاسلام امام حسن بن ابی الحسن یسار کی کنیت ابو سعید تھی اور وہ بصرہ کے رہنے والے تھے۔

ان کے والد عیسان کے اسیرانِ جنگ میں سے تھے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کے موالی تھے۔ آپ کی والدہ خیرہ، ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی کنیز تھیں۔ آپ نے مدینہ میں پرورش پائی۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں قرآن حفظ کیا۔ حضرت عثمانؓ کے دار عثمان میں محصور ہونے کے وقت ان کی عمر ۱۴ سال تھی۔ بڑے ہوکر جہاد میں سرگرم حصہ لیا۔ حضرت معاویہؓ کے دور حکومت میں خراسان کے گورنر ربیع بن زیاد کے کاتب تھے۔ آپ نے حضرت عثمان، عمران بن حصین، مغیرہ بن شعبہ، عبدالرحمٰن بن سمرہ، سمرہ بن جندب، ابن عباس، ابن عمر، وغیرہ سے علم حدیث حاصل کیا۔ آپ کے تلامذہ کی ایک طویل فہرست ہے۔ آپ بلند پایہ عالم، ثقہ کثیر العلم اور فصیح البیان تھے۔ ۸۸ برس کی عمر میں ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔ (المعارف، ص ۲۰، ۱۹۵؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۷۱)

۱۰۹ ابو الاسود دؤلی کا شجرہ یہ تھا، ابو الاسود ظالم بن عمرو بن سفیان بن عمرو بن جندب بن یعمر بن حلس بن نفاثہ بن عدی بن الدئل۔ (جمہرۃ انساب العرب، ص ۱۸۵)

۱۱۰ ابن خلدون، مقدمہ

۱۱۱ اسکندریہ (*Alexandria*) مصر کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی۔ عہد بطالمہ (*Ptolemies*) میں دنیا کا دوسرا عظیم ترین شہر مانا جاتا تھا۔ اس شہر کی بنیاد سکندر نے ۳۳۲ ق م میں رکھی تھی۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۲، ص ۶۵۲، مقالہ "الاسکندریہ" مقالہ نگار *Rhuvon Guest*)۔ ۲۱ھ/۶۴۲ء میں اسکندریہ عربوں کے قبضے میں آیا۔ اس وقت یہ بڑا شاندار شہر تھا اور یونانی علوم کا مرکز مانا جاتا تھا۔ ان کے پاس مدون علوم کا بڑا ذخیرہ تھا۔ حضرت عمرؓ کے حکم سے اسکندریہ کے بڑے کتب خانے کو جلانے کا جو قصہ عام طور پر مشہور ہے، اسے صحیح تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

۱۱۲ شمالی شام کے شہر (*Antocheia*) کا معرب نام ہے۔ یہ شہر دریائے عاصی (*Orontes*) کے کنارے، بحر روم کے ساحل سے چودہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کی بنیاد سیلوکس اول (*Seleucus-I*) نے ۳۰۰ ق م میں رکھی تھی۔ رومی سپہ سالار پومپی (*Pompey*) نے اس شہر پر ۶۴ ق م میں قبضہ کرلیا تھا جس کے بعد وہ ایشیا میں رومیوں کا سب سے اہم شہر اور سلطنت روما کی ایشیائی ولایات کا صدر مقام بن گیا۔ ایران میں ساسانیوں کے عروج کے ساتھ ساتھ

انطاکیہ کا تدریجی زوال ہوا۔ ساسانیوں نے انطاکیہ کو مفتوح اور تاراج کیا اور یہاں کے بہت سے باشندوں کو جندی شاپور لے جایا گیا۔ ۲۶۶ء تا ۲۷۲ء تک انطاکیہ، تدمر (Palmyra) کی ملکہ زنوبیہ کے زیر اقتدار رہا۔ پیہم داخلی جھگڑوں اور تباہ کن زلزلوں کے باوجود اس شہر کی خوشحالی قائم رہی۔ یہاں تک کہ ۵۴۰ء میں ساسانی بادشاہ خسرو اول (انوشروان) نے اس شہر کا محاصرہ کر کے اسے تباہ کر ڈالا اور اس کے باشندے یہاں سے جبراً ایرانی مملکت منتقل کیے گئے۔ اس کے بعد قیصر روم جسٹینین (Justinian) نے انطاکیہ کو محدود لیکن زیادہ مضبوط حصار میں از سر نو تعمیر کرایا، یہی حدود ازمنہ وسطی کے پورے دور میں قائم رہیں، لیکن ایرانی لشکروں نے اسے پھر ۶۰۲ء اور ۶۱۱ء میں تاراج کیا اور ۱۶ھ/ ۶۳۷ء میں عربوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ابتدائی خلفائے اسلام کے عہد میں انطاکیہ عربوں کے سرحدی فوجی نظام "العواصم" کا صدر مقام اور علمی سرگرمیوں کا فعال مرکز تھا۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۳، ص ۳۳۴، مادہ "انطاکیہ")

۱۱۳ نصیبین، عراق عرب کا شہر تھا جو بقول یاقوت حموی، نہر ہرماس کی بالائی گزرگاہ پر واقع تھا۔ اس کے اردگرد بے شمار باغات تھے۔ یہ اتنا قدیم شہر ہے کہ آشوریوں کے زمانے میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ آشوریوں اور اہل بابل کی آخری جنگوں میں اس کا ذکر ۶۱۲ ق م میں آتا ہے۔ سیلوکس اول کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے یہاں یونانیوں کو آباد کیا تھا۔ عیسوی سال کے آغاز تک اس پر یکے بعد دیگرے پارتھیوں، ارمنوں، ارشک خاندان کے بادشاہوں کا قبضہ رہا، پھر یہ شاہان روما کے قبضے میں چلا گیا۔ ساسانی بادشاہ اردشیر کے زمانے سے یہ شہر کبھی یونانیوں کے زیر نگین رہا، پانچویں صدی عیسوی میں یہاں نسطوری دار العلوم منتقل کر دیا گیا اور خسرو ثانی کے عہد میں سینٹ سرجیوس (St. Sergius) کا گرجا تعمیر ہوا۔ ۱۸ھ/ ۶۳۹ء میں مسلمان سپہ سالار عیاض بن غنم نے نصیبین پر چڑھائی کی اور معمولی مزاحمت کے بعد اہل شہر نے اطاعت قبول کر لی۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۲۲، ص ۳۳۸)

۱۱۴ الطبقات الکبریٰ، جلد ۲، ص ۳۸۵، جلد ۵، ص ۲۸۷؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۹۶۔

۱۱۵ تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۹۷۔

۱۱۶ طبقات الکبریٰ، جلد ۵، ص ۲۸۷۔

۱۱۷ ایضاً،ص۹۲۔

۱۱۸ ایضاً،ص۹۲۔

۱۱۹ تاریخ ابن خلدون، جلد۳،ص۱۹۔

۱۲۰ جہشیاری، ص۲۲، ۲۶، ۳۱، ۳۳۔

۱۲۱ ایضاً،ص۳۸۔

۱۲۲ ایضاً،ص۴۷۔

۱۲۳ ایضاً،ص۵۳۔

۱۲۴ ایضاً،ص۳۶۔

۱۲۵ الکامل فی التاریخ، جلد۲،ص۱۳۴۔

۱۲۶ تاریخ ابن خلدون، جلد۳،ص۱۹۔

۱۲۷ النظم الاسلامیہ،ص۳۱۷۔

۱۲۸ تاریخ ابن خلدون، جلد۳،ص۱۱۔

۱۲۹ تاریخ طبری، جلد۵،ص۱۴۳۔

۱۳۰ ایضاً،ص۱۴۷۔۱۴۸۔

۱۳۱ المعارف، ص۸۷۔

۱۳۲ ابوالزناد کا نام عبداللہ ابن ذکوان تھا۔ وہ حضرت عثمانؓ کی بیوی رملہ بنت شیبہ بن ربیعہ کے موالی تھے۔ ان کی کنیت ابوعبدالرحمٰن بھی تھی۔ فقیہ مدینہ تھے۔ ایک روایت ہے کہ ان سے علم حاصل کرنے کے لئے تین سو چالیس تابعین ان کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے۔ حضرت عمرؓ ثانی نے انہیں عبدالحمید بن عبدالرحمٰن بن زید بن خطاب کے ساتھ عراق کا افسر خراج مقرر کیا تھا۔ ان کا انتقال ۱۳۰ھ میں ہوا۔ (کتاب المعارف، ص۲۰۳؛ تذکرۃ الحفاظ، جلد۱،ص۱۳۴)

۱۳۳ جہشیاری، ص۵۳۔ (میمون بن مہران کی کنیت ابوایوب تھی۔ عراق کے مشہور شہر رقہ کے رہنے والے تھے، آپ کوفہ کی ایک عورت کے موالی تھے۔ وہیں پل کر جوان ہوئے۔ بعد میں الجزیرہ کو اپنا وطن بنالیا، اہل جزیرہ کے عالم تھے۔ اسی (۸۰) سال کی عمر میں ۱۱۷ھ میں وفات پائی۔ تذکرۃ الحفاظ، جلد۱،ص۹۸)

۱۳۴ یزید بن ابی حبیب کی کنیت ابو رجاء تھی۔ بنو ازد کا موالی ہونے کی وجہ سے ازدی کہلاتے تھے۔ مصر کے رہنے والے نامور فقیہ تھے۔ ملک حبشہ سے تعلق رکھنے والے سیاہ فام تھے۔ ۵۳ھ میں پیدا ہوئے، ۱۲۸ھ میں وفات پائی۔ حلیم الطبع، عقل مند اور اہل مصر کے مفتی تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۱۲۹)

۱۳۵ الکامل للمبرد، جلد ۲، ص ۸۱۔

۱۳۶ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے بیٹے، ابو بردہ، لائق اعتماد اور نامور فقیہ تھے۔ اپنے والد ابو موسیٰ اشعری، حضرات علیؓ، زبیر بن العوامؓ، حذیفہؓ، عبداللہ ابن سلامؓ اور ابو ہریرہؓ وغیرہ سے روایت کرتے تھے۔ قاضی شریح کے بعد کوفہ کے قاضی رہے۔ ۱۰۳ھ میں انتقال کیا۔ (تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۹۵)

۱۳۷ تذکرۃ الحفاظ، جلد ۱، ص ۹۹۔

۱۳۸ ایضاً، جلد ۱، ص ۱۰۰۔



باب ہشتم

شعوبیت

پہلی، تا تیسری صدی کی سیاسی، تہذیبی، علمی و ادبی تاریخ کے مطالعہ کے دوران ہمیں ایک ایسے رجحان کا سامنا ہوتا ہے جسے "شعوبیت" کہا جاتا ہے۔ شعوبیت کی عام فہم تعریف یہ ہے کہ عربوں کی مذمت کرنا اور ہر معاملے میں ان کی تنقیص کرنا۔ شعوبیت نے کب جنم لیا، کس طرح نشو و ارتقاء ہوا، مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب، ادب و سیاست پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے، زیر نظر باب میں اس کا مطالعہ پیش کیا جائے گا۔

"شعوبیہ" کا لفظ "شعوب" سے ماخوذ ہے جو "شعبُ" کی جمع ہے۔ 'شعب' لوگوں کے گروہ کو کہتے ہیں، یہ لفظ اپنے اندر "قبیلے" سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ عربوں کی قومیت و خاندان اور اتحاد نسب کے طبقات میں یہ سب سے آخری حلقہ ہے۔[1]

قرآن کریم میں لفظ شعوب سورۃ الحجرات آیت ۱۳ میں ادا ہوا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ

[لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ اللہ کے نزدیک تم میں عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔]

قرآن کریم کی اس آیت میں بھی لفظ شعوب، قبائل ہی کے مترادف استعمال ہوا ہے۔
شعوبیت دراصل ایک رجحان ہے، عربوں پر عجمیوں کی فضیلت کا، اسے ایک احتجاجی رویہ بھی کہا جاسکتا ہے اس رجحان کا آغاز پہلی صدی ہجری میں اس وقت ہوا جب اسلام کی عطا کردہ طاقت نے عربوں کو جزیرہ نمائے عرب سے باہر نکالا اور انہوں نے اپنی عظیم پڑوسی سلطنتوں یعنی ساسانی اور بازنطینی حکومتوں کو مغلوب کیا۔ ایران، عراق، شام و مصر کے وسیع علاقے فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کیے اور عربوں کو، غیر قومیتوں، خصوصاً ایرانیوں اور رومیوں سے اتصال کا موقع ملا، اس اتصال کے نتیجے میں جو معاشرہ ظہور پذیر ہوا، اس میں واضح طور پر تین رجحانات پائے جاتے تھے۔

ا۔ عربی سیادت کا رجحان

ایک گروہ کا رجحان یہ تھا کہ عرب اقوام میں افضل اور بہتر ہیں۔ اس گروہ کے دلائل یہ تھے کہ عربوں نے اپنی زندگی ہمیشہ استقلال و حریت کے ساتھ گزاری ہے، جاہلیت کے زمانے میں بھی وہ دو حکومتوں یعنی ایران و روم کے پڑوسی رہے، یہ دونوں حکومتیں اپنی طاقت اور استحکام کے باوجود عربوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکیں بلکہ یہ زبردست حکومتیں، عربوں کی محتاج رہیں۔ چنانچہ حیرہ میں لخمی ۲ عربوں کے ساتھ اور شام میں غسانی ۳ عربوں کے ساتھ ان کے اسی قسم کے تعلقات تھے، ایران و روم کی سلطنتیں ان کو مال بھی دیتی تھیں اور جزیرہ نمائے عرب کے عربوں کے حملوں سے حفاظت کی خاطر اپنے شہروں میں ان کی عزت بھی کرتے تھے۔ لہٰذا وہ خود عربوں کے زیادہ محتاج تھے۔ یہ تو زمانہ جاہلیت کی بات تھی، عہد اسلامی میں بھی عربوں نے مسلمان ہونے کے بعد بھی اپنی حریت و استقلال کی پوری حفاظت کی اور ایرانیوں اور رومیوں کو پوری طرح مغلوب کیا اور انہیں اپنا تابع فرمان بنایا۔

اس رجحان کے حامل گروہ کا خیال تھا کہ عربوں میں بعض ایسی خلقی صفات موجود ہیں جن کی بدولت وہ دیگر اقوام کے مقابلے میں ممتاز و محترم ہیں۔ مثلاً ان کی انتہا درجے کی

مہمان نوازی، مظلوموں کی فریاد رسی، وعدے کا پاس اور پناہ گزینی کا حق ادا کرنا۔ اس کے ساتھ ساتھ قوتِ بیان اور حسنِ تعبیر میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا، شعر و شاعری کا مخزن تھے، اپنے انساب کی حفاظت کرنے والے، بدیہہ گوئی، ضرب الامثال بنانے اور ندرت و جدت پیدا کرنے میں ان کا کوئی ہمسر نہیں تھا۔ اس رجحان کے حامل افراد اس بات پر بھی انتہائی فخر کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ عرب تھے، دوسری اقوام میں اسلام کو پھیلانے والے اور اسلام کی حفاظت کرنے والے بھی عرب تھے۔ اہل عجم میں سے جسے بھی اسلام نصیب ہوا اس کی گردن پر عربوں کا یہ عظیم احسان تھا، عرب ہی تھے جنہوں نے انہیں پرانے دین کی تاریکی سے نجات دی اور شرک سے توحید کی طرف لے آئے، عرب ہی تھے جنہوں نے اسلام کی ہدایت کو چار دانگِ عالم میں پھیلانے کے لئے آتشِ جنگ کی تپش سہی اور اپنی جانوں کی قربانی دی۔ [۴]

۲۔ مساوات کا رجحان

اس عہد میں دوسرے گروہ کا رجحان یہ تھا کہ عرب، دوسری اقوام سے افضل نہیں اور نہ ہی کوئی قوم نسلاً کسی قوم سے افضل ہو سکتی ہے۔ سارے انسان ایک ہی طرح کی مٹی سے بنے ہیں، ایک دوسرے پر فضیلت افراد میں تو ہو سکتی ہے مگر اقوام میں نہیں۔ اس رجحان کے حامل افراد نے تمام اقوامِ عالم کی مساوات کا موقف اختیار کیا یہ حسب نسب کی بنیاد پر لوگوں کے درمیان باہمی فضیلت سے انکار کرتے تھے اور فضیلت کا محور دین، اخلاق، شرافتِ نفس اور بلندی کردار کو دیتے تھے۔ یہ گروہ "اہل التسویہ" کہلایا، یہ اپنی رائے کو اسی سورۃ الحجرات کی تیرہویں آیت سے مضبوط کرتے تھے جس کا حوالہ مقالے کی ابتدا میں دیا جا چکا ہے یعنی "ہم نے تم کو خاندانوں اور قبائل میں اس لئے تقسیم کیا تا کہ تم ایک دوسرے سے پہچانے جاؤ ورنہ اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔" [۵]

وہ مختلف احادیث سے بھی استدلال پیش کرتے تھے، جیسے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد، جو انہوں نے خطبۂ حجۃ الوداع میں فرمایا:

کلکم لآدم و آدم من تراب لیس لعربی علی عجمی فضل الا بالتقویٰ.

[تم سب آدم ہو، اور آدم مٹی سے بنائے گئے، کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں بجز پرہیزگاری (تقویٰ) کے۔]

''اہل التسویہ'' کی دلیل یہ تھی کہ ہر قوم میں اچھے اور برے لوگ ہوتے ہیں، ہر قوم میں کچھ خوبیاں اور کچھ برائیاں ہوتی ہیں، اعمال کا وزن کرنے کے لئے بہترین دین اور اخلاق ہی ہو سکتے ہیں۔ یہ لوگ اقوام و ملل میں مساوات کے قائل تھے، اکثر دیندار عرب و عجم کے علما اسی خیال کے گزرے ہیں کیونکہ اسلام کی روح اور اس کی بنیادی تعلیمات اسی رجحان کی تائید کرتی ہیں۔

۳۔ غیر عربی سیادت کا رجحان

اس عہد میں ایک تیسرا گروہ غیر عربی سیادت کے رجحان کا حامل تھا۔ یہ لوگ دیگر اقوام کو خصوصاً ایرانیوں کو عربوں پر فضیلت دیتے تھے۔ اس گروہ میں خصوصاً ایرانی شامل تھے جو اس بنا پر عربوں سے حسد کرتے تھے کہ عربوں نے ان کے ملک کو فتح کر لیا تھا۔ غیر عربی سیادت کے رجحان والے اس گروہ کو ابتدا ''المتطرفون''[۶] (یعنی حد سے گزرنے والے) کہا گیا، بعد میں انہیں ''شعوبی'' کہا جانے لگا۔

المتطرفون کے بھی دو گروہ تھے۔ ایک گروہ وہ جو صرف عربوں سے عداوت رکھتے تھے۔ دین اسلام یا محمد عربی ﷺ سے نہیں۔ دوسرا گروہ ان عجمیوں کا تھا جو عربوں سے عداوت رکھنے کے ساتھ ساتھ دین اسلام سے بھی متنفر تھے، کیونکہ اسلام ہی نے عربوں کو اس قابل بنایا تھا کہ وہ روم و ایران پر حکومت کر سکیں۔

المتطرفون کا اول الذکر گروہ عربوں کی تحقیر کرتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ آخر عربوں میں ایسی کون سی خصوصیت ہے جس پر فخر کیا جا سکے۔ ان کی صحرائی زندگی صرف لوٹ مار اور تنگی

ترشی کی زندگی تھی، قابل فخر تو رومیوں کے لئے ان کی سلطنت، ایرانیوں کے لئے ان کا تمدن، ہندوستانیوں کے لئے ان کی حکمت، فلسفہ و طب اور چینیوں کے لئے ان کی صنعت و حرفت ہوسکتی ہے۔ اس گروہ کا موقف تھا کہ فخر چند چیزوں پر ہوا کرتا ہے۔ مثلاً حکومت و سلطنت پر، اگر ایسا ہے تو فراعنۂ مصر، عمالقہ، اکاسرہ اور قیاصرہ کے مقابلے میں عربوں کی حکومت و سلطنت کی کیا حیثیت ہوسکتی ہے؟ اگر فتوحات پر فخر کیا جاسکتا ہے تو عربوں میں کوئی سکندر اعظم نہیں ہوا، اگر نبوت پر فخر کیا جاسکتا ہے تو سارے انبیا غیر عرب تھے بجز چار کے (یعنی حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت محمد ﷺ)، اگر صنعت و حرفت پر فخر کیا جاسکتا ہے تو عرب تمام اقوام کے مقابلے میں کمزور تر تھے، ان کے ہاتھ بانجھ اور عقلیں بنجر تھیں۔ اگر شعروں پر، پُر شوکت خطبوں پر، سحر آمیز تقاریر پر فخر کیا جاسکتا ہے تو یونانی اور رومی ان سے کسی طور کم نہیں۔ یہ جہاں تک عربوں کا خلقی صفات کا تعلق ہے، تو محض لمبے چوڑے دعوے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس گروہ کا موقف تھا کہ اگر عرب، اسلام پر فخر کرتے ہیں تو اسلام تنہا عربوں کا دین نہیں ہے، وہ پوری نوع انسانی کا دین ہے۔ خود اسلام نے شرافت کا سب سے بڑا معیار تقویٰ کو قرار دیا ہے، لہٰذا دین تو ہمارے اور عربوں کے درمیان قدر مشترک ہے، رہ گئی دنیا تو اس میں ہم ان سے بہت آگے ہیں۔

المتطرفون کا دوسرا گروہ وہ تھا جو عربوں کی دشمنی میں اس حد تک بڑھا کہ عقیدے پر حملہ آور ہوا۔ لہٰذا عباسی عہد میں باطنیت کو فروغ ہوا، نت نئے گمراہ کن فرقے سامنے آئے، ان میں سے شاید ہی کوئی فرقہ عرب ہو۔

ابتداً اهل التسویه اور المتطرفون، دونوں گروہوں کو شعوبیہ کہا جاتا تھا، تاہم آگے چل کر صرف المتطرفون (یعنی غیر عربی سیادت کے رجحانات کے حامل گروہ) پر اس لفظ کا اطلاق ہونے لگا۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے کہ "شعوبی اس شخص کو کہتے ہیں جو عربوں کی شان گھٹانے کا قائل ہو اور غیر عربوں پر ان کی فضیلت و برتری نہ مانتا ہو۔" ۸

اسلام سے قبل عربوں کی حالتِ اجتماعیہ کے بنظر غائر مطالعے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ عربوں میں عہد جاہلیت میں کوئی قومی شعور موجود نہیں تھا، البتہ قبائلی شعور بھرپور اور غالب تھا۔ عہد جاہلیت کی شاعری کا ایک سرسری جائزہ بھی یہ کہنے کے لئے کافی ہے کہ ایک عربی اپنے قبیلے کی تعریف کرتا ہے۔ اس کی فتح و نصرت کے گیت گاتا ہے، اپنے قبیلے کی مدح اور مخالف قبیلے کی ہجو کرتا ہے۔ ایسا بہت کم ہی ملتا ہے کہ کوئی عربی اپنے عرب ہونے پر فخر کرتا ہو، اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ عرب عہد جاہلیت میں صحیح معنوں میں ایک امت یا ایک قوم تھے ہی نہیں۔ وہ زبان اور دین کے اعتبار سے بھی کوئی ایک وحدت نہیں تھے، ان کی وطنی آرزوئیں یکساں نہیں تھیں، کسی گروہ انسانی میں قومی شعور پیدا کرنے کی جو ابتدائی شرائط ہوتی ہیں، یعنی کم از کم وحدتِ فکر، وحدتِ زبان، وحدتِ مفاد اور ایک منظم حکومت کا وجود، یہ بنیادیں عربوں کے قبائلی معاشرے میں موجود نہیں تھیں۔

عربوں کے برعکس ایرانیوں اور رومیوں میں یہ قومی شعور پوری طرح اجاگر تھا، نسلی لسانی اور ایک حد تک دینی وحدت نیز ایک مستحکم حکومت کی موجودگی نے ان کے قومی شعور کو پروان چڑھانے میں مدد دی۔ گو کہ عہد جاہلیت میں عربوں کے اپنے دونوں بڑے پڑوسیوں یعنی مشرق میں ایرانیوں اور مغرب میں بازنطینیوں (رومیوں) کے ساتھ، تجارتی، مذہبی، اور سیاسی تعلقات تھے جو عربوں کی تہذیبی زندگی پر اثر انداز بھی ہوتے تھے، لیکن ان اقوام میں موجود قومی شعور اور جذبۂ قومیت عربوں کو متاثر نہ کر سکا۔ اس کی وجہ عربوں کی حالتِ اجتماعیہ ہی ہو سکتی ہے، وہ اپنے قبائلی طرز پر اس شدت سے کارفرما تھے کہ کوئی ایسی سوچ یا فکر انہیں متاثر نہیں کر سکتی تھی۔ تاہم ایک استثنائی مثال کے طور پر قصی بن کلاب کا نام لیا جا سکتا ہے، اس نے حدود شام میں تربیت پائی تھی۔ اس نے تہذیب زندگی، نظم حکومت اور تاسیس قومیت کے جو اصول رومیوں سے سیکھے انہیں حجاز میں آزمانے کی کوشش کی، اس نے قریش کے بکھرے ہوئے خاندانوں کو یکجا کر کے مکہ میں آباد کیا اور یونانی طرز پر ایک چھوٹی سی جمہوری ریاست کی بنیاد ڈالی، جس کے چودہ عہدے، دس بطونِ قریش میں موروثی طور پر تقسیم تھے۔ لیکن یہ مثال ایک عرب قبیلے کو یکجا

کرنے کی حد تک ہے، سارے عربوں کو، اسلام سے قبل کوئی طاقت ایک مرکز پر جمع نہیں کر سکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی قومیت ان کے ''قبیلے'' تک محدود تھی۔

جب جزیرہ نمائے عرب میں اسلام آیا تو سارے عرب ایک امت بن گئے، اسلام نے انہیں وہ بنیادیں فراہم کر دیں جس نے انہیں محدود قبائلی شعور سے وسیع تر قومی و ملی شعور کی طرف سفر کرنے میں مدد دی یعنی اتحادِ زبان، اتحادِ دین، اتحادِ میلانات اور پھر ایک منظم حکومت کا قیام۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو اسلام کا دائرہ اثر جزیرۃ العرب تک ہی محدود تھا البتہ ہمسایہ اقوام کو اسلام کی دعوت دی جا چکی تھی اور بعض کے ساتھ چھوٹی بڑی سرحدی جھڑپیں بھی شروع ہو چکی تھیں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں ملکوں کی عظیم فتح کا آغاز ہوا اور مسلمان فوجیں عراق عرب اور عراق عجم کے علاقوں میں فتوحات کرتے ہوئے آگے بڑھتی رہیں۔ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں پہلے مرحلے پر عراق کی فتوحات مکمل ہوئیں پھر پے در پے ایران، شام اور مصر فتح ہوئے۔ ان حیرت انگیز فتوحات کے نتیجے میں نہ صرف ایک وسیع رقبہ مملکت اسلامیہ کا جزو بنا اور بے اندازہ مالِ غنیمت کی وجہ سے شہروں میں خوشحالی آئی بلکہ نت نئی اقوام ان کی مفتوح ہو گئیں اور لاکھوں افراد مملکتِ اسلامیہ کے شہری بنے۔

ان فتوحات کے نتیجے میں ایک طرف عربوں کی عصبیت کا ٹکراؤ دیگر قوموں کی عصبیتوں سے ہوا اور دوسری طرف فاتح اور مفتوح اقوام کے مابین اختلاط و امتزاج کا عمل بھی شروع ہو گیا۔ یہ اختلاط کئی سطحوں پر تھا، خون میں، نظم اجتماعی میں، دینی عقائد اور تہذیب و ثقافت میں، چنانچہ ایرانی اور رومی عادات، عربی عادات کے ساتھ مختلط ہوئیں، ایرانی اور رومی قانون ان احکام کے ساتھ مختلط ہوا جن کو قرآن و سنت نے بیان کیا تھا، ایرانی حکمت اور رومی فلسفے کا عربی حکمت کے ساتھ امتزاج ہوا، ایرانی اور رومی طرز حکومت کا عربی حکومت کے ساتھ اختلاط ہوا، انتہا یہ ہے کہ اسلامی عقائد بھی اس امتزاج کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکے۔

فتوحات کے ان واقعات سے ایک طرف تو بعض عربوں کے نفس میں ذرا اُبھار پیدا ہوا، سب نہیں تاہم بعض عربوں نے اس معاملے میں مبالغے اور غلو سے کام لیا، ان میں یہ

خیال پیدا ہونے لگا کہ جو خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے وہ کوئی ممتاز خون ہے اس شعور نے ان کے اندر سیادت اور عظمت کے خیالات پیدا کیے اور وہ مفتوح اقوام کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھنے لگے جیسے ایک مالک اپنے غلاموں کو دیکھتا ہے۔

دوسری طرف مفتوح اقوام میں سے خصوصاً ایرانیوں نے اپنی شکست کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے شاندار ماضی پر نازاں تھے اور عربوں کو اُجڈ، گنوار، بدو اور وحشی سمجھتے تھے، ان کے اندر کے تکبر اور فخر و مباہات نے ہی آگے چل کر شعوبیت کی شکل اختیار کر لی۔

جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا، ایرانیوں سے عربوں کے تعلقات بہت قدیم تھے، ان کے تجارتی کاروان ایران جاتے، وہاں اپنا مال بیچتے اور اپنی ضروریات کا سامان خرید کر واپس آتے۔ اسی طرح ایرانی تجار بھی کاروباری اغراض سے عرب آتے رہتے تھے۔ ایرانیوں سے عربوں کے سیاسی روابط بھی نہایت گہرے اور دیرینہ تھے۔ عراق عجم میں عربوں کی نقل مکانی کے سلسلے زمانہ قدیم سے جاری تھے۔ انہی عرب آبادکاروں کی ایک ریاست حیرہ میں قائم تھی جس کا تفصیلی تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ حیرہ کے عربوں نے ایرانی مدنیت کے آثار قبول کرتے ہوئے متمدن شہری زندگی گزارنی شروع کر دی تھی، تاہم یہ پہلے بھی کم متمدن نہیں تھے کہ ان کا تعلق یمنی قبائل سے تھا، جن کی تمدنی ترقیاں کسی طور پر ایران و روما سے کم نہیں تھیں۔ لہذا گولڈ زیہر کا یہ کہنا کہ عربوں نے لکھنا اہل حیرہ سے سیکھا جو کہ ایرانیوں کے پڑوسی تھے اور اسی وجہ سے متمدن تھے، کچھ اتنا مبنی بر حقیقت نہیں۔[۱۰] یہ عرب مدتوں ایرانیوں کے حلیف بن کر ان کے پڑوس میں آباد رہے، ایرانیوں نے ان سے بہت فوائد بھی حاصل کیے۔ عراق عرب اور اندرون عرب، ایرانیوں کے سیاسی مفادات کی نگرانی انہی کے ذمہ تھی، حیرہ کے لخمی حکمران، ایرانی حکومت کے اس حد تک وفادار تھے کہ وہ ایران و روم کی جنگوں میں رومیوں کے خلاف بہادری سے لڑتے تھے۔[۱۱] لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایرانی بادشاہ اپنے عرب حلیفوں کو اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے اور موقع ملنے پر انہیں ذلیل کرنے سے بھی باز نہیں رہتے تھے۔ چنانچہ انہوں

نے حیرہ کے لخمی سردار نعمان بن منذر سوم کو اپنے پایہ تخت مدائن بلا کر قید کر دیا۔ جس کا قید ہی کی حالت میں تھوڑے عرصے ہی میں انتقال ہو گیا تھا، یہی واقعہ آگے چل کر جنگ ذی قار کا سبب بن گیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب ساسانی بادشاہ نے حیرہ کے سردار نعمان بن منذر سوم کو مدائن طلب کر لیا تو نعمان نے حیرہ سے جاتے ہوئے اپنی قیمتی زرہیں اور بعض دوسری اشیاء بنو بکر کے رئیس ہانی بن مسعود شیبانی کے پاس امانتاً رکھوا دیں تھیں، نعمان کی موت کے بعد ایرانی حکومت نے حیرہ میں اپنا گورنر مقرر کر دیا اور ایک عرب سردار ایاس بن قبیصہ طائی کو برائے نام حکومتِ حیرہ کا رئیس نامزد کر دیا۔ ساسانی بادشاہ خسرو پرویز کے، حکومت حیرہ پر براہِ راست حکومت کرنے کے اس غلط فیصلے سے ایران کے وفادار عربوں میں بددلی پیدا ہوئی اور جب ایرانی بادشاہ نے ہانی بن مسعود سے نعمان بن منذر سوم کی امانت کی واپسی کا مطالبہ کیا تو عربوں میں مزید اشتعال پیدا ہوا۔ ہانی نے ایرانی حکومت کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا، جس پر ایک ایرانی فوج اسی ایاس بن قبیصہ طائی کی سرکردگی میں سرکش عرب قبائل کو سزا دینے کی غرض سے روانہ کی گئی، اس فوج کے ساتھ ایرانیوں کے وفادار طے اور ایاد کے عرب قبائل کی کمک بھی تھی۔ عربوں سے ایرانی فوج کا مقابلہ "ذی قار" نامی چشمے کے قریب ہوا۔ عربوں نے جان پر کھیل کر ایرانیوں کا مقابلہ کیا اور انہیں شکست دی۔ ذی قار کی یہ تاریخی جنگ ۶۰۴ء تا ۶۱۱ء کے درمیان کسی وقت ہوئی [۱۲] یہ ایرانیوں کے خلاف باقاعدہ جنگ میں عربوں کی پہلی فتح تھی، اس واقعہ کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو ہوئی تو انہوں نے اظہار مسرت کیا اور فرمایا "الیوم اول یوم انتصف فیه العرب من العجم و بی نصروا۔" [یہ پہلا موقع ہے جب عربوں نے ایرانیوں پر غلبہ حاصل کیا اور یہ مدد انہیں اللہ عزوجل کی جانب سے میرے وسیلے سے عطا ہوئی۔]

گولڈ زیہر جنگ ذی قار کی تاریخ ۶۱۱ء بتاتے ہوئے اسے قبل از اسلام عربوں کی تین بڑی جنگوں میں شمار کرتے ہیں [۱۳] گولڈ زیہر کا کہنا ہے کہ جنگ ذی قار میں عربوں کی فتح، اس قوم پر جو ان (عربوں) پر حکمرانی کرتی تھی۔ بہت بڑا واقعہ تھا، اس پر رسول اللہ ﷺ کی

پیش گوئیاں عربوں کے لیے، ایرانیوں کے مقابلے میں، وجۂ افتخار بن گئیں۔ گولڈزیہر اسے دونوں قوموں یعنی عرب وعجم کے درمیان قومی منافرت (National hatred) کہتا ہے، جسے اسلام سے ذرا قبل ہونے والی جنگ ذی قار نے ہوا دی۔[۱۴]

عرب وعجم تعلقات میں جنگ ذی قار کو اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ اس کامیابی سے عربوں کا ایرانیوں کے مقابلے میں احساس کمتری ختم ہوا اور ایرانی برتری کا طلسم ٹوٹنے لگا۔ عربوں اور ایرانیوں میں جنگ ذی قار کے بعد سے ایک طرح کی قومی رقابت قائم ہوگئی۔ عربوں میں ''قومیت'' کے جذبات اس سے قبل اتنے زیادہ نہیں تھے چونکہ اس جنگ میں کئی عرب قبائل ایرانیوں کی طرف سے لڑے تھے لہٰذا اسے متحدہ عرب کی متحدہ ایران سے جنگ ہرگز قرار نہیں دیا جاسکتا مگر یہ ضرور ہے کہ اس جنگ کے بعد عربوں میں ایرانیوں کے خلاف قومی جذبات بیدار ہوئے اور عربوں اور ایرانیوں کے مابین وہ قومی عصبیت اور مقاربت پیدا ہوگئی جو وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی رہی۔

جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا، ایرانیوں اور رومیوں کے درمیان قدیم زمانے سے حریفانہ کشمکش جاری رہتی تھی۔ اس کشمکش میں مسلمانوں کی ہمدردیاں اہلِ کتاب ہونے کے ناتے، رومیوں کے ساتھ رہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے مکی دور میں جب رومیوں کے مقابلے میں ایرانیوں کو پے در پے کامیابیاں حاصل ہوئیں تو مسلمانوں کو فطرتاً رنج ہوا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ پر سورۂ روم کی آیات نازل ہوئیں۔

الٓمّٓ ۞ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۞ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۞ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۭ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ
(الروم: ۱-۴)

[رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہوگئے ہیں اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہوجائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار ہے، پہلے بھی اور بعد میں بھی اور یہ وہ دن ہوگا کہ جب اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں

منائیں گے۔]

چنانچہ یہ پیشین گوئی اس وقت پوری ہوگئی جب روم اور ایران کی جنگ میں رومی غالب آگئے، قیصر روم، ہرقل نے نہ صرف ایرانیوں کو مصر اور شام سے بے دخل کر کے اپنے کھوئے ہوئے مقبوضات حاصل کر لیے بلکہ ایرانی دار الحکومت کو گھیر لیا اور نینوا کی جنگ میں ایرانیوں کو شکست فاش دی۔ رسول اللہ ﷺ کو اس واقعہ کی اطلاع صلح حدیبیہ کے دن ملی جس پر آپ نے اظہار مسرت کیا۔

۷ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے جو تبلیغی خط خسرو پرویز کے نام روانہ کیا تھا، اُسے اس نے پھاڑ دیا اور قاصد (عبداللہ ابن حذافہ سہمی) سے گستاخانہ پیش آیا اور اپنے ایرانی گورنر[۱۵] باذان کو یہ حکم بھجوایا کہ "مدینہ کے نبی" کو گرفتار کر کے مدائن روانہ کر دے۔ اس واقعہ سے دربار ایران کے عربوں کے ساتھ اہانت آمیز رویہ کا ثبوت ملتا ہے۔[۱۶]

ایرانی حکومت، عرب میں اسلام کی اشاعت اور عربوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی فکر سے غافل نہیں رہی چنانچہ عہد صدیقی میں حروب ردہ کے دوران ہی مقامی ایرانی آبادی اور ساسانی حکمرانوں کی شہ پر حیرہ کے لخمی خاندان کے ایک فرد منذر بن نعمان کو اہل بحرین نے اپنا حاکم بنا کر مسلمانوں کے خلاف لڑائی کا ڈول ڈالا تھا[۱۷] نیز سجاح تمیمیہ نے دعویٰ نبوت کے بعد جب مدینے پر حملے کی غرض سے عرب کا رخ کیا تو اس میں بھی ایرانی حکومت اور اس کے عراقی کارپردازوں کی ریشہ دوانیوں کا دخل تھا۔[۱۸]

عہد فاروقی میں تقریباً سارا ایران فتح ہوگیا۔ ان جنگوں میں طرفین کے ہزاروں افراد کام آئے۔ مفتوح ایرانیوں کے مقتولین کی تعداد ہر اعتبار سے زائد تھی، بقیۃ السیف میں سے بہتوں نے اسلام قبول کر لیا، عربوں کے ساتھ حلفِ ولاء میں داخل ہوگئے اور موالی کہلائے۔ بہتوں نے جزیہ دینے پر آمادگی ظاہر کی اور بہتوں کو قید و بند اور غلامی بھگتنی پڑی۔ قومی عصبیت کے حوالے سے ایرانیوں کے لئے یہ ایک سانحہ عظیم تھا جس نے مسلمان عربوں کی متحدہ جمعیت کے آگے ان کی قومیت کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ اس شدید حادثے نے ان

کے دلوں میں گرہیں ڈال دیں اور جلد ہی ان نفرتوں کے نتائج سامنے آنے لگے۔ ابولولو فیروز مدینے میں ایرانی غلاموں یا موالی کے بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیرتا اور روتا تھا۔ ساتھ ہی کہتا جاتا "عمر نے میرا کلیجہ کھالیا ہے۔" ۹؎ اور پھر بالآخر اس نے خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطاب کو، جو کہ فتوحات ایران کے اہم ذمہ دار اور روح رواں تھے، قتل کردیا، ان کے علاوہ اس نے تیرہ مزید مسلمانوں کو زخمی کیا جن میں سے نو زخموں کی تاب نہ لاکر شہید ہوگئے۔ حضرت عمرؓ پر ایک ایرانی کا کامیاب قاتلانہ حملہ، مغلوب ایرانیوں کی طرف سے عربوں کے خلاف پہلی بڑی منتقمانہ کارروائی تھی۔

حضرت عمرؓ کے انتقال کے بعد کئی ایرانی علاقوں مثلاً آذربائیجان، آرمینیا، رے، اصطخر، خراسان اور بجستان وغیرہ نے باغیانہ روش اختیار کرتے ہوئے جزیہ کی ادائیگی، جس پر عربوں سے مصالحت کی تھی بند کردی۔ لہٰذا حضرت عثمانؓ کو ان مفتوحہ علاقوں پر دوبارہ فوج کشی کرکے اسلامی ریاست کے حلقۂ اطاعت میں لانا پڑا۔ دیگر وجوہات کے ساتھ ساتھ اس باغیانہ روش کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ ایرانی، خصوصاً ان کا طبقۂ امراء، اپنے آپ کو بدو عربوں سے بدرجہا بہتر اور مہذب سمجھتے تھے۔ شاہان کسریٰ کے شاندار تمدن کے سامنے اعراب انہیں کمزور اور حقیر نظر آتے تھے لہٰذا یہ عربوں کے ہاتھوں اپنی شکست کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر پا رہے تھے۔ یہ ان کی قومی غیرت اور عصبیت تھی، جس نے روزِ اول سے انہیں عربوں سے متصادم رکھا اور کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

اموی عہد کا معاشرہ ایک مختلف النوع معاشرہ تھا، جس میں عربوں کے علاوہ موالی کا ایک بڑا طبقہ نظر آتا ہے۔ عربوں کو سابق الاسلام ہونے اور فاتح ہونے کی وجہ سے ان موالی پر خود بخود یک گونہ نفسیاتی برتری حاصل ہوگئی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے سابقون الاولون اور اصحابِ بدر کو یہ برتری مولفۃ القلوب یا اعراب پر حاصل تھی تاہم اس برتری میں کسی قسم کا بے جا احساسِ تفاخر نہیں تھا۔ اسی طرح موالی، یعنی وہ غیر عرب جنہوں نے اسلام قبول کیا اور

اسلامی ریاست کے باشندے بنے، کیفیت ایمان کے اعتبار سے انہیں بھی کم از کم دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اولاً وہ موالی جن کا اسلام خالص تھا، انہوں نے اسلام کی روح کو اس طرح سمجھا کہ ان کی قلب ماہیت ہوگئی، اسی گروہ سے ان اکابر علما مشائخ و ارباب زہد و ورع کا تعلق ہے جو اموی اور عباسی عہد میں اسلامی دنیا پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ثانیاً وہ موالی تھے جنہوں نے بظاہر اسلام قبول کرلیا تھا، لیکن نفسیاتی طور پر وہ اپنے قدیم مذہب و ثقافت کے حلقۂ اثر سے باہر نہیں آسکے تھے، ان کے ذہنوں سے اپنے قومی افتخار اور تہذیبی برتری کے خیالات محو نہیں ہوسکے تھے۔ اسی احساس نے آگے چل کر شعوبیت کی شکل اختیار کرلی۔

یہی معاملہ عربوں کا تھا۔ اسلامی تعلیمات نے عربوں کے عقلی رجحانات کو بہت حد تک تبدیل کردیا تھا تاہم اسلامی معاشرے میں سارے ہی افراد (عرب) تقویٰ کے مطلوبہ معیار تک پہنچے ہوئے نہیں تھے، بلکہ یہ ایک ملا جلا معاشرہ تھا جہاں مختلف افراد یا گروہ افراد نے اسلامی تعلیمات کو مختلف پیمانے پر قبول کیا تھا۔ چنانچہ بعض تو وہ لوگ تھے جنہوں نے پوری آمادگی اور قلب صمیم سے اسلام کی دعوت، ابتدائی سالوں میں ہی قبول کرلی تھی۔ یہ سابقون الاولون تھے۔ انہیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں زیادہ رہنا نصیب ہوا تھا، لہٰذا ان کی قلب ماہیت ہوگئی، تعداد میں یہ لوگ کم تھے۔

دوسرے وہ لوگ تھے جنہوں نے قدرے تاخیر سے اسلام قبول کیا، رسول اللہ ﷺ کی براہ راست صحبت انہیں کم نصیب رہی۔ اسلام قبول کرنے سے انہیں کچھ مادی فوائد حاصل ہونے کی توقع تھی۔ تاہم ان کا اسلام اچھا تھا۔ ان کی تعداد اول الذکر سے زیادہ تھی۔

تیسرا گروہ ان عربوں کا تھا جو رسول اللہ ﷺ کے آخری ایام میں صرف اس لئے اسلام لایا کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اسلام اس وقت کی پھیلتی اور بڑھتی ہوئی سیاسی فوجی قوت تھی۔ مکہ فتح ہوچکا تھا۔ گرد و نواح کے قبائل اسلام کے دامن میں پناہ لے چکے تھے۔

لہذا کوئی راستہ نہ پا کر انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ زیادہ تر اہل البادیہ تھے۔ جن کو قرآن "اعراب" کا نام دیتا ہے۔ یہ سب سے کثیر التعداد گروہ تھا، اسلام کی حقیقی روح سے بے خبر بھی وہ لوگ تھے جو رسول اللہ ﷺ کی آنکھ بند ہوتے ہی مرتد ہو گئے، کچھ زکوٰۃ دینے سے انکاری ہوئے اور کچھ جھوٹے مدعیان نبوت کے پیچھے چل پڑے، ان سب کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جہاد کے ذریعے دوبارہ اسلام قبول کرنے پر آمادہ کیا اور انہیں مصروف رکھنے کے لئے اور دنیاوی فوائد پہنچانے کے لئے ملکی فتوحات میں مصروف کر دیا۔ چنانچہ یہی وہ لوگ تھے جو عراق و عجم کی فتوحات کرنے والی افواج میں شامل تھے، آگے چل کر انہیں کی عصبیت سے ایرانی عصبیت کے تصادم کے نتیجے میں شعوبیت نے جنم لیا۔

المختصر اموی معاشرے میں دونوں بڑے طبقات یعنی عرب و موالی کے درمیان ایک کشمکش کی رو چلتی نظر آتی ہے۔ خصوصاً ایرانی موالی نے اپنی شکست کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ ان کا ایک شاندار سیاسی اور تہذیبی ماضی تھا۔ جس کے اعادے کے وہ متمنی تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ہر اس مخالفانہ اور باغیانہ طاقت کا ساتھ دیا جو خلافت بنو امیہ کے خلاف اٹھی، اس خواہش نے ایرانی موالی کو طائف کے ایک طالع آزما شخص مختار ثقفی کے گرد جمع ہونے پر آمادہ کیا۔ جس کا تفصیلی تذکرہ گزر چکا ہے۔

تاہم اس تجزیے سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ سارے عرب یا سارے ایرانی موالی عصبی رویے کا اظہار کرنے والے تھے۔ حقیقتاً پورے اموی دور میں دو طرح کے سماجی رویے ملتے ہیں۔ ایک رویہ سماجی مساوات کا تھا اور دوسرا عصبیت و زعم کا۔ پہلے رویے کا مظاہرہ کرنے والے عرب بھی تھے اور موالی بھی۔ وہ عرب و موالی جنہوں نے اسلام کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ قبول ہی نہیں کیا تھا، ان کا سماجی رویہ عصبیت پر مبنی تھا، انہی کے باہمی ٹکراؤ نے آگے چل کر شعوبیت کو جنم دیا۔

شعوبیت کا سب سے زیادہ مظاہرہ شعراء کی طرف سے ہوا۔ ایک طرف وہ عرب

شعراء تھے جو عربی افتخار وفضیلت کا بڑھا چڑھا کر پروپیگنڈا کرتے، دوسرے وہ غیر عرب اور غیر مسلم شعراء تھے جو عربوں کو ذلیل کرنے سے نہ چوکتے۔ گولڈ زیہر، یاقوت حموی کے حوالے سے اخطل ۲۱ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اخطل یہ سمجھتا تھا کہ عربوں کو ذلیل کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ عربوں کو "اہل اذ قباد" کہا جائے، جو میسان کے نزدیک ایک مقام تھا۔ یعنی چونکہ عرب، اہل فارس نہیں لہٰذا ان کے لیے کوئی فضیلت بھی نہیں۔ ۲۲

اموی عہد کا مشہور شاعر فرزدق ۲۳ اپنے حریف ابن جریر کے لیے ۲۴ "یا ابن الفارسیہ" (اے ایرانی ماں کے بیٹے) کے الفاظ حقارۃً استعمال کرتا ہے، کیونکہ ابن جریر کی دادی کی ماں (یعنی پردادی) ایک ایرانی کنیز تھی۔

اسی طرح فرزدق، عبداللہ الحضرمی کی ہجو کرتے ہوئے کہتا ہے (کیونکہ عبداللہ الحضرمی نے اس کی شاعری پر تنقید کی تھی) اگر عبداللہ مولیٰ ہوتا تو میں اُسے کچھ کہتا بھی، مگر وہ تو مولیٰ کا مولیٰ ہے۔ (اب اتنے نیچ کے بارے میں) کیا کہوں؟ ۲۵

بنو امیہ کے زمانے ہی سے جو ایرانی موالی عربوں کے خلاف فخر کرنے لگے تھے، ان میں اسماعیل ابن یسار کا نام لیا جاسکتا ہے۔ یہ ہمیشہ ایرانیوں کی عظمت کے گیت گاتا رہتا تھا۔ وہ ایک مرتبہ اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے دربار میں پیش ہوا۔ ہشام نے اس سے اشعار سنانے کی فرمائش کی تو اس نے اپنا ایک قصیدہ سنانا شروع کردیا۔

انی وجدک ماعودی بذی خور
عند الحفاظ ولا حوضی بمهدوم
اصلی کریم و مجدی لایقاس به
ولی لسان کحدا لسیف مسموم
احمی به مجد اقوام ذوی حسب
من کل قومٍ بتاج الملک معموم
جحاجح سادةٍ بلج مراز بةٍ

جودٍ غطارفٍ مسامیحٍ مطاعیم

من مثل کسریٰ وسابور الجنود معاً

والهرمزان لفخر او لتعظیم

اسد الکتائب یوم الروع ان زحفوا

وهم اذلوا ملوک الترک والروم

یمشون فی حلق الماذی سابغة

مشی الضراغمة الاسد اللهامیم

هناک ان تسالی تنبی بان لنا

جرثومة قهرت عز الجراثیم ۳۶ـ

[تیری عزت کی قسم! حفاظت کرتے وقت میری لکڑی ٹیڑھی نہیں ہے اور نہ ہی میرا حوض منہدم شدہ ہے۔ میرا خاندان شریف ہے اور میری بزرگی کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ میرے پاس ایسی زبان ہے جس کی دھار اتنی تیز ہے جتنا زہر پلائی ہوئی تلوار کی دھار ہوا کرتی ہے۔ میں اس تلوار سے ایسی قوموں کی بزرگی اور عظمت جو صاحبان حسب ہیں، ہر بے ہودہ آدمی سے، جس کے سر پر حکومت کا تاج عمامہ کی شکل میں باندھ دیا گیا ہو، حفاظت کرتا ہوں۔ اصحاب مکارم سرداران قوم، روشن رو اور روساء ملک، عمدہ اور اصیل گھوڑوں والے، چشم پوشی کرنے والے اور لوگوں کو کھلانے والے۔ کسریٰ اور شاپور__ صاحب افواج__ اور ہرمزان جیسا آدمی۔ فخر اور تعظیم کے لیے اور کون ہے؟ فوجوں کے شیر، جنگ کے دن جب حملہ کرنے کے لیے نکلیں، جنہوں نے ترک اور روم کے سلاطین کو ذلیل کر کے رکھ دیا تھا پورے جسم کو ڈھانپنے والی زرہیں پہن کر یوں چلتے ہیں جیسے شیر ببر چلا کرتے ہیں۔ اس موقع پر اگر تو پوچھ بیٹھے تو تجھے بتایا جائے گا کہ ایک چھوٹا سا جرثومہ بڑے بڑے جرثوموں کی عزت کو خاک میں ملا دیا کرتا ہے۔]

اس پر ہشام غضبناک ہوا اور اسے شام سے نکال دیا۔

یہ اکا دکا مثالیں نہیں ہیں، عرب شعراء، غیر عربوں کو حقیر ثابت کرنے میں؛ اور غیر عرب شعراء عربوں کی تذلیل اور ہتک کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے تھے۔ ایسے میں بعض غیر عرب شعراء اگر عربوں کی کسی صفت کا، یا عرب شعراء غیر عربوں کی کسی فضیلت کا اعتراف کرتے تو ایسے اشعار کو تعجب سے سنا جاتا تھا۔

شعوبیت کے مظاہر عربی شعر و ادب میں ظاہر ہوئے تو بڑی تیزی سے معاشرے کے ہر طبقے میں سرایت کر گئے۔ گولڈ زیہر کا ماننا ہے کہ شعوبیت کا اظہار کرنے والے یہ شعراء یا ادباء نہ تو معاشرے کے کچلے ہوئے لوگ تھے اور نہ ہی باغی تھے۔ ۲۷

ڈاکٹر طٰہٰ حسین اس میں ایک اضافہ کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ موالی شعراء نے اموی عہد میں جن سیاسی احزاب کو اختیار کر لیا تھا، ان کے لیے مدحیہ قصائد اور مخالفین کے لیے ہجویہ قصائد کہا کرتے تھے۔ لہذا بنو امیہ کے، آل زبیر کے اور بنو ہاشم کے اپنے اپنے شعراء تھے۔ یوں سیاسی احزاب کے اختلافات نے ان عجمی شعراء کو گویا یہ اجازت دے دی کہ عربی سیاست میں داخل ہو کر اشراف قریش اور رسول اللہ ﷺ کے قرابت داروں کی ہجو کریں۔ اس حوالے سے ابو العباس الاعمیٰ، بنو امیہ کا شاعر تھا اور اسماعیل بن یسار، آل زبیر کا شاعر تھا۔ بنو ہاشم کے طرف دار اپنے شاعر تھے۔ ان شعراء کو اپنے ممدوحین سے وظائف اور انعامات ملا کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان عجمی موالی شعراء نے پہلے تو عربوں کی ہجو کرنا اپنے لیے جائز کر لیا، پھر اپنے قدیم عہد کا ذکر اور ایرانی ہونے پر فخر کا اظہار کرنے لگے۔ ان عجمی شعراء نے ایسے اخبار و اشعار گڑھے اور انہیں عربوں کی طرف منسوب کیا جن میں ایرانیوں کی قدیم شان و شوکت اور زمانۂ جاہلیت میں ان کے اقتدار و عظمت کا ذکر ہو۔ یہ بات عربوں کو مجبور کرتی تھی کہ وہ بھی جواباً ایسے اشعار کہیں جس میں عرب کے ایران پر غالب آنے کا تذکرہ ہو، اور جن میں یہ ثابت کیا جائے کہ شاہان ایران کی زمانۂ جاہلیت میں اور عربوں پر ان کے دوران تسلط میں۔ یہ حیثیت نہیں تھی کہ عربوں کی اس سے توہین ہوتی ہو یا یہ کہ ایرانی عربوں پر فوقیت محسوس کریں۔ ۲۸

عباسی عہد میں جب ایرانیوں کو غلبہ اور نفوذ حاصل ہو گیا تو شعوبیت نے بھی پھلنا پھولنا شروع کر دیا۔ شعوبیت کوئی عقیدہ نہیں تھا کہ اس کی تعلیمات مشہور و محدود اور شعائر و رسوم ظاہر اور متعین ہوں جیسا کہ دینی مسالک اور مذاہب کے معاملے میں ہوتا ہے مثلاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ فلاں شخص حنبلی یا شافعی، یا فلاں شخص خارجی یا معتزلی ہے کیونکہ ان کے عقائد معلوم و مشہور ہیں۔ لہٰذا ان کے اختلاف کی حد بندی اور رسوم و شعائر وغیرہ ان کے امتیازات کو واضح کر سکتے ہیں، لیکن شعوبی کے بارے میں کوئی اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ اس میں عقیدے کی نسبت رجحان کا زیادہ تعلق ہے۔

شعوبیت کا ابتدائی درجہ تو یہ تھا کہ شعوبی صرف عربوں کی تحقیر و تذلیل کر کے ان سے ہر فضیلت کو سلب کر لیا کرتے تھے، عربوں کی امتیازی خصوصیات کی مختلف جہات سے تنقیص کرتے تاہم اسلام پر حملہ آور نہیں ہوتے۔

شعوبیت کا دوسرا درجہ یہ تھا کہ بعض شعوبی عربوں کی تحقیر و تذلیل میں اتنا آگے نکل جاتے کہ دین اسلام بھی ان کی لپیٹ میں آجاتا۔ جاحظ۲۹ نے انہیں لوگوں کے بارے میں لکھا ہے کہ انہی لوگوں نے دین اسلام میں شبہات پیدا کیے اور یہ لوگ کفر و الحاد کی طرف نکل گئے۔۳۰

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں شعوبیت اپنے کمال پر پہنچ چکی تھی۔ اس بات نے ان کی اور بھی مدد کی کہ خلفائے بنو عباس میں اسلام کے لئے تو تعصب تھا، مگر عربیت کے لئے کچھ زیادہ تعصب نہیں تھا۔ انہوں نے انتہائی سختی سے زندقہ کا تو مقابلہ کیا لیکن اس عجمی رجحان (شعوبیت) کا مقابلہ نہیں کیا۔ اور یہ بات ایک حد تک طبعی و فطری بھی تھی کیونکہ زیادہ تر عباسی خلفا کی مائیں عجمی الاصل تھیں۔۳۱

جس طرح امویوں کی حکومت ''عربی سیادت'' تھی، اسی طرح عباسیوں کی حکومت ''عجمی سیادت'' کا مظہر تھی۔ جب امویوں کے خلاف عباسی تحریک عروج پر تھی تو اس خطرے سے آخری اموی خلیفہ مروان ثانی کو اُس کے گورنر خراسان، نصر بن سیار اپنے اشعار سے متنبہ کر چکا تھا جس میں وہ کہتا ہے ''عربوں اور اسلام کو الوداع'' اسلام تو بہر حال زندہ رہا لیکن

عربیت یا عربی سیادت کا خاتمہ ہوگیا۔

امویوں کے زوال اور عباسیوں کے ہاتھوں ایرانی اقتدار قائم ہوجانے کے بعد شعوبیت (یعنی عربوں کے خلاف عجمی تعصب) ایک اور رنگ میں جلوہ گر ہوئی، اور وہ یہ کہ مختلف علوم میں مہارت رکھنے والے عجمی علماء کو جب عباسیوں کی سیاسی سرپرستی بھی نصیب ہوگئی تو علم کے ہر شعبے میں اُن کی شعوبیت کا ظہور ہوا، بات صرف شعروشاعری تک محدود نہ رہی بلکہ ادب، لغت، کلام، فلسفے میں بھی شعوبیت کے مظاہرے سامنے آنے لگے۔ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ آگ کو مٹی پر۔ ابلیس کو آدم پر۔ مجوسیت کو اسلام پر ترجیح دی جانے لگی اور شعوبیت، زندیقیت کے سانچے میں ڈھلنے لگی۔

عباسی عہد کے مشہور شعوبی اہل قلم، جنہوں نے عربی زبان سیکھ لی تھی اور وہ اپنے نسب پر فخر اور اپنی قوم پر ناز کرتے تھے۔ ان میں اہم نام بشار بن برد۳۲، ابوعبیدہ معمر بن مثنیٰ۳۳، ہیثم بن عدی۳۴، علان شعوبی۳۵ اور دیک الجن۳۶ وغیرہ کے ہیں۔ عباسی عہد میں شعوبیوں نے اہل عجم کے مناقب اور عربوں کی مذمت میں بکثرت کتب تصنیف کیں، مثلاً سعید بن حمید جو ایک پُرگو شاعر تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ وہ ایرانی بادشاہوں کی اولاد میں سے ہے، اسے عربوں کے خلاف شدید تعصب تھا، اس نے **انتصاف العجم من العرب، فضل العجم علی العرب و افتخارھا** اور **مفاخر العجم** کے نام سے کتب تصنیف کیں۔ ۳۷

مشہور شعوبی، ہیثم ابن عدی نے، جو تاریخ اور روایات کے مشہور علما میں سے ہے، ابوجعفر منصور، مہدی، ہادی اور ہارون الرشید کا ہم نشین رہا ہے، عربوں کی مذمت میں کئی کتابیں لکھیں مثلاً **کتاب المثالب الصغیر، کتاب المثالب الکبیر، کتاب مثالب ربیعہ، اسماء بغایا قریش فی الجاھلیۃ و المساء من ولدن** اور **کتاب من تزوج من الموالی فی العرب** خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ۳۸

اسی طرح سہل بن ہارون کے متعلق بھی ابن الندیم نے بیان کیا ہے کہ وہ صاحب حکمت اور نہایت فصیح شاعر تھا۔ ایرانی الاصل اور رجحان کے اعتبار سے شعوبی تھا، اُس نے بخل

کے بارے میں اپنا ایک مشہور رسالہ تصنیف کیا تھا، عرب اپنی سخاوت اور کرم نوازی کو اپنے بہترین فضائل میں شمار کرتے تھے۔ سہل بن ہارون نے اپنے اس رسالے میں اس کا رد کیا ہے، اس نے کرم اور سخاوت کو ایک برائی اور بخل کو ایک بڑی فضیلت ثابت کیا ہے۔

علان شعوبی نے بھی، جو ایرانی الاصل تھا، اپنی کتاب المیدان فی المثالب میں عربوں کی توہین کی اور ایک ایک قبیلے کا نام لے کر اس کی مذمت کی۔ ۳۹؎ اس پر طاہر ابن الحسین نے اُسے تیس ہزار درہم انعام دیے۔

ابوعبیدہ معمر بن مثنیٰ جو زبان وادب کے سلسلے میں سند اور مرجع تھا، عربوں سے نفرت کرنے اور اُن کی تحقیر کرنے میں بھی سب سے زیادہ سخت تھا اُس نے عربوں کی مذمت اور عجم کی تعریف و فضیلت میں کئی کتب تصنیف کیں مثلاً مثالب العرب، کتاب لصوص العرب (عرب کے چوروں کے متعلق کتاب)، کتاب ادعیاء العرب اور کتاب فضائل الفرس وغیرہ۔ ۴۰؎ ابوعبیدہ کی اصل ایران کے یہودیوں میں سے تھی اور یہ نحو اور اخبار عرب کے مشہور ترین علما میں سے تھے۔

ان شعوبی مصنفین کا طریقہ کار یہ تھا کہ کسی عرب قبیلے کے کسی ایک گھرانے کی کوئی بھی قابلِ عار بات یا قابلِ مواخذہ عمل کا کوئی جرم لے لیا جاتا اور اس کی اچھی طرح تشہیر کر کے اس پورے قبیلے کو بدنام کیا جاتا اور ثابت کیا جاتا کہ عرب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اسی طرح جن مصنفین نے ایرانیوں کے مناقب اور فضائل میں کتب لکھیں، انہوں نے ایرانیوں کی کوئی ایک اچھی عادت لی، یا ان کے بادشاہوں کی عظمت، فوجی نظام اور ملکی سیاست میں سے کوئی ایک خوبی لے لی گئی اور اس کا زبردست پروپگنڈا کر کے ثابت کیا کہ سارے ایرانی ایسے ہی ہوتے ہیں۔

عربوں کی مذمت یا عجمیوں کی فضیلت میں لکھی جانے والی کتب میں سے کوئی کتاب بھی عہد حاضر تک محفوظ نہیں رہی۔ ہم تک ان کے چیدہ چیدہ اقوال یا آرا ہی بعض مورخین کی تحریروں میں محفوظ رہ جانے کی وجہ سے پہنچی ہیں، مثلاً امام جاحظ کی کتاب البیان و التبیین، ابن عبد ربہ کی کتاب العقد الفرید یا ابن قتیبہ کی کتاب العرب میں نقل ہو کر یہ

اقوال ہم تک پہنچے ہیں۔ ان کتابوں کے ضائع ہونے کا سب سے بڑا سبب یہی تھا کہ مسلمانوں نے شعوبیت کے اس رجحان کو اسلام کے خلاف سمجھا، لہٰذا اس موضوع پر تصنیف شدہ کتابوں کو نقل کرنے سے احتراز برتا، جو لوگ مخلص تھے، انہوں نے اس رجحان سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا، جیسا کہ علامہ زمخشری نے اپنی کتاب المفصل کی ابتدا ہی میں اس بات پر خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ان کے دل میں عربوں کے لئے عصبیت پیدا کردی اور شعوبیت کے رجحان سے محفوظ رکھا۔

اہل شعوبیت نے ایسے قصے کہانیاں گھڑ گھڑ کر عربی ادب میں شامل کردیں جو ان کے مقصد کو پورا کرنے والی تھیں، یہ بات عربوں کے لئے سخت نقصان دہ تھی کیونکہ اس کا توڑ بہت دشوار تھا اور ان کو غلط ثابت کرنا اور بھی مشکل تھا۔ جاحظ اپنی پوری قوت صرف کرتے تھے کہ ان عجمی حملوں سے عربوں کا دفاع کرسکیں اس حوالے سے جاحظ کی کتاب العصا اور کتاب الحیوان کا تذکرہ مناسب ہوگا۔ جہاں تک کتاب العصا کا تعلق ہے اس کی وجہ تصنیف یہ تھی کہ عرب بلا کے خطیب تھے اور اپنے خطباء پر فخر کیا کرتے تھے۔ عرب خطیب جب خطبہ دیتے تو عموماً ایک عصا کا سہارا لے کر کھڑے ہوتے۔ عجمی موالی اس کا مذاق اڑاتے، اپنے اشعار، تحریر اور تقریر میں عرب خطباء کی ہیئت، انداز اور اُن کے عصا (لاٹھی) کو تضحیک کا نشانہ بناتے۔ اس پر جاحظ نے کتاب العصا لکھی جس میں اس نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ عرب، عجم سے زیادہ اچھے مقرر ہوتے ہیں۔ اور عرب خطیب کا دوران خطبہ عصا کی ٹیک لینا، خطبے میں کوئی کمی پیدا نہیں کرتا۔ پھر وہ سوال کرتا ہے کہ کیا عصا کی تعریف قرآن میں، حدیث میں، تورات میں، قدما کے کلام میں نہیں کی گئی؟ یہیں سے جاحظ نے عصا (لاٹھی) کے فضائل بیان کرنا شروع کیے یہاں تک کہ پوری کتاب مرتب ہوگئی۔

اسی طرح جاحظ کی کتاب الحیوان مرتب ہوئی۔ جب عجمیوں نے عربوں کی جہالت پر طنز کیا کہ انہیں نہ نباتات کا علم ہے نہ حیوانات کا، تو جاحظ نے حیوانات کی قسمیں بتانی شروع کیں اور یہ بھی کہ فلاں جانور کے لیے عہد جاہلیت میں عربوں کے ہاں فلاں فلاں الفاظ

مروج تھے۔ کوئی ایک حیوان ایسا نہیں بچا جس کے بارے میں واضح طور پر یا اشارۃً عربوں نے کچھ کہا نہ ہو، جاحظ نے ہر چیز کی اولیت کے سلسلے میں عربوں کا کوئی نہ کوئی قول درج کیا، یوں پوری کتاب الحیوان مرتب ہوگئی۔ جاحظ تو ایک مثال ہے، متعدد عرب علماء جن میں ابن قتیبہ بھی شامل ہیں، عباسی عہد میں اسی طرح شعوبیت سے اپنا دفاع کرتے رہے۔

شعوبیت نے تاریخ میں بھی رطب و یابس شامل کر دیا۔ انہوں نے ایران کی جو تاریخ بیان کی اس میں بڑے مبالغے سے کام لیا، طوالت کے خوف سے یہاں صرف ایک مثال دی جاتی ہے کہ ایرانیوں نے حضرت سلمان فارسیؓ کو بہت زیادہ آسمان پر چڑھا دیا، زہد، حکمت اور علم و فضل کی وہ وہ باتیں ان کی طرف منسوب ہیں جو کسی دوسرے صحابی کی طرف منسوب نہیں کی گئیں حتیٰ کہ ان کے متعلق کہا گیا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ پایا تھا۔ ابوالشیخ نے طبقات الاصفہانیین میں نقل کیا ہے کہ اہل علم کہتے ہیں کہ سلمان فارسیؓ تین سو پچاس سال زندہ رہے۔

حدیث کی دنیا میں تو ایرانیوں کو ایک بڑا وسیع میدان مل گیا۔ ایرانیوں کی فضیلت میں بے شمار احادیث گھڑ گھڑ کر انہوں نے معتمد صحابہ اور تابعین کی طرف منسوب کر دیں مثلاً یہ روایت کہ عجمیوں کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا ''مجھے ان عجمیوں پر تم سے کہیں زیادہ اعتماد ہے۔'' ایک دوسری روایت میں ہے کہ ''عنقریب عجم کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ دمشق کے علاوہ تمام شہروں پر قابض ہو جائے گا۔'' ایک حدیث میں ہے کہ ''ایرانیوں کو برا نہ کہو۔ کسی نے آج تک اُن کو برا نہیں کہا مگر اس سے جلد یا بدیر انتقام ضرور لیا گیا۔'' انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک روایت نقل کی کہ آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی ان تتولوا یستبدل قوماً غیر کم [اگر تم لوگ اسلام سے پھر گئے تو وہ تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا۔] لوگوں نے آپؐ سے پوچھا کہ ہماری جگہ کون سی دوسری قوم لے کر آئے گا؟ تو رسول اللہ ﷺ نے سلمانؓ کے کندھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر ایمان ثریا سے بندھا ہوا بھی

ہوگا تو ایران کے کچھ لوگ اسے وہاں سے بھی پالیں گے۔"

انہیں سلمان فارسی کے بارے میں یہ روایت نقل کی جاتی ہے کہ "سلمان ہم (یعنی اہل بیت) میں سے ہیں۔"

اسی قبیل سے وہ احادیث ہیں جو امام ابوحنیفہؒ (آپ ایرانی الاصل ہیں) کے سلسلے میں گھڑی گئی ہیں مثلاً یہ روایت کہ "آدم نے مجھ پر فخر کیا تھا اور میں اپنی امت کے ایک آدمی پر فخر کرتا ہوں جس کا نام نعمان ہوگا اور کنیت ابوحنیفہ ہوگی، وہ میری امت کا چراغ ہوگا۔" اور یہ روایت بھی نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "تمام انبیا مجھ پر فخر کرتے ہیں اور میں ابوحنیفہ پر فخر کرتا ہوں، جس نے اُس سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے اس سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا۔"

سچ بات یہ ہے کہ عربوں نے بھی اور ان لوگوں نے بھی جن میں عربوں کے لئے تعصب تھا، ان چیزوں کا مقابلہ انہی ہتھیاروں سے کیا۔ انہوں نے بھی عربوں کی فضیلت میں حدیثیں گھڑ گھڑ کر ڈھیر لگا دیے، چند احادیث ملاحظہ ہوں:

۱۔ جس نے عربوں سے فریب کیا وہ میری شفاعت میں داخل نہیں ہوگا اور نہ اسے میری محبت مل سکے گی۔

۲۔ جب لوگوں میں اختلاف ہو تو حق وہ ہے جس پر مُضر ہوں۔ الخ

۳۔ عربوں کے ساتھ تین وجوہ سے محبت کرو اس لئے کہ میں عربی ہوں، اس لئے کہ قرآن عربی ہے اور اس لئے کہ اہل جنت کی زبان عربی ہوگی۔

۴۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سلمانؓ سے فرمایا "اے سلمان! مجھ سے عداوت نہ رکھنا ورنہ تم دین سے خارج ہو جاؤ گے۔" سلمان کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا "اے رسول اللہ ﷺ! یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپ سے عداوت رکھوں حالانکہ خدا نے آپ کے ذریعے مجھے ہدایت دی ہے، تو آپؐ نے فرمایا "بس عربوں سے عداوت نہ رکھنا، اس طرح تم مجھ سے عداوت رکھنے کے مرتکب ہو گے۔" وغیرہ

اہل شعوبیت نے تو قرآن کی تفسیر کو بھی نہ چھوڑا اور بعض آیات کی ایسی تاویل کی جو ان کے مقصد کو پورا کرتی ہو، مثلاً سورۃ الحجرات کی آیت ہے:

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط
اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

[لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ اللہ کے نزدیک تم میں عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔]

شعوبی کہتے ہیں کہ اس آیت میں ''شعوب'' سے مراد عجمی خاندان ہیں اور ''قبائل'' سے مراد عربی خاندان اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے شعوب کا ذکر پہلے اور قبائل کا بعد میں کیا ہے، لہٰذا شعوب (عجمی خاندانوں) کو قبائل (عربی خاندانوں) پر برتری حاصل ہے۔ ابن قتیبہ اس کا رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تذکرے میں کسی کو مقدم کرنا، فضیلت و برتری کی دلیل نہیں ہے۔ قرآن کریم میں یا معشر الجن و الانس کہہ کر جنات کا تذکرہ انسانوں سے پہلے کیا گیا ہے، حالانکہ انسان، جنات سے برتر ہیں۔[۴۲]

افسوسناک بات یہ ہے کہ شعوبیت عہد عباسی میں پروان چڑھی، جو کہ تدوین علوم کا زمانہ تھا، چنانچہ ہر علمی حرکت جو بعد میں پیدا ہوئی اس کی بنیاد انہی علوم پر استوار ہوئی، جن کی تدوین بنو عباس کے اس شعوبیت آشنا دور میں ہو چکی تھی۔ اس سے قبل علوم مدون صورت میں موجود نہیں تھے، اس بنا پر شعوبیت کے اثرات کی تحقیق کرنا اور نشاندہی کرنا اور بھی مشکل ہو گیا، اگر اموی عہد کی مدون کی ہوئی کوئی تاریخ ہوتی تو عباسی عہد میں شعوبیوں کی شعبدہ بازیوں کا پتہ لگایا جاسکتا تھا۔ اسی طرح اگر ایران کی کوئی مستند تاریخ، ایرانی دور حکومت کی مدون شدہ ہوتی تو وضاحت کے ساتھ اس امر کا پتہ لگایا جاسکتا تھا کہ شعوبیوں نے اس دور کو کس طرح مصنوعی اور جھوٹے طور پر خوش نما بنا کر پیش کیا تھا۔ یہی حال تمام علوم کا ہے، لیکن قسمت نے تدوین علوم کے زمانہ کا جوڑ شعوبیت کے دبدبے سے ملا دیا اور یہ علوم کے لئے بڑی ہی بدقسمتی

کی بات ہوئی۔

شعوبیت کا ایک مثبت پہلو بھی تھا، شعوبیت اس وقت پیدا ہوئی جب کہ ہر اس چیز کی عزت کی جاتی تھی جس پر عربی چھاپ لگی ہو، عربی نسب، عربی زبان، عربی رائے، عربی عادت واقدار تقدس کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔ شعوبیوں نے ان سب کو تنقید و تحلیل کی کسوٹی پر رکھ لیا، جس سے مقابلے کی فضا پیدا ہوگئی اور عربوں کے ساتھ دیگر اقوام بھی ابھر کر سامنے آئیں۔ اگر شعوبیت اسی حد تک رہتی تو نقصان دہ نہ ہوتی، لیکن اس معاملے میں وہ حد سے تجاوز کر گئے۔ عربوں سے آگے بڑھ کر ان کے دین پر حملہ آور ہوئے اور اسلام میں زندیقیت کا پیوند لگانے کی کوشش کی جس کی وجہ سے وہ علمی دنیا اور سنجیدہ دینی حلقوں میں ناپسندیدہ اور معتوب قرار پائے۔



حوالہ جات:

۱۔ ابن منظور افریقی، لسان العرب، جلد ۵، ص ۷۷، بولاق، مصر ۱۳۰۷ھ۔

۲۔ حکومت حیرہ، عراق عرب میں قائم عربوں کی نیم خودمختار حکومت تھی۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: اسی کتاب کا باب دوم، ص: ۵۵، حاشیہ: ۹۔

۳۔ جس طرح بنولخم نے حیرہ میں حکومت قائم کر رکھی تھی اسی طرح آل غسان نے شام میں ایک حکومت کی بنیاد ڈال لی تھی۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: اسی کتاب کا باب دوم، ص: ۵۶، حاشیہ: ۱۱۔

۴۔ احمد امین المصری، ضحیٰ الاسلام، جزء الاول، ص ۴۹ تا ۵۰، مکتبۃ النہضۃ المصریہ، الطبعۃ الثامنۃ (ت ن)۔

۵۔ الحجرات: ۱۳۔

۶۔ دکتور محمد نبیہ حجاب، مظاہر الشعوبیہ فی الادب العربی، ص ۴، مکتبۃ نہضۃ مصر، الطبعۃ

الاولی، ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء۔

۷۔ ابن عبد ربہ، العقد الفرید، جلد ۳، ص ۴۰۳، مطبعہ لجنۃ التالیف و الترجمہ والنشر، قاہرہ، ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء۔

۸۔ ابن منظور افریقی، لسان العرب۔

۹۔ عراق کا وہ حصہ جو ایران سے متصل تھا ''عراق عجم'' کہلاتا تھا اور وہ حصہ جو عرب سے متصل تھا ''عراق عرب'' کہلاتا تھا۔

۱۰۔ Ignaz Goldziher (1850-1921) *Muslim Studies*,(Muhammedanische Studien) translated from the German by C.R.Barber & S.M.Stern,Chicago,Vol.1,P.106.

۱۱۔ ڈاکٹر حمید اللہ، رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی، ص ۱۹۳ تا ۱۹۶، دار الاشاعت، کراچی۔

۱۲۔ نعمان بن منذر سوم کی حکومت کے خاتمے کے بعد (یعنی ۶۰۲ء تا ۶۰۵ء کے درمیان کسی وقت) ایاس بن قبیصہ کی حکومت شروع ہوئی۔ اسی کے دور میں ذی قار کی جنگ ہوئی جبکہ قبیصہ کی حکومت ۶۱۱ء تک چلی۔ ان حقائق کی روشنی میں یوم ذی قار کی تاریخ ۶۰۴ء تا ۶۱۱ء کے درمیان متعین کی جاسکتی ہے۔

۱۳۔ گولڈ زیہر، جلد ۱، ص ۱۰۰۔

۱۴۔ ایضاً، جلد ۱، ص ۱۰۱۔

۱۵۔ یمن پر بعثت نبوی کے قریبی زمانے میں حکومتِ ایران کا قبضہ ہوگیا تھا اور وہاں ایرانی فوجی گورنر، باذان، ایرانی فوج کے ساتھ مقیم تھا۔

۱۶۔ ڈاکٹر حمید اللہ، رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی، ص ۱۳۳ تا ۱۵۴۔

۱۷۔ طبری، ابو جعفر محمد بن جریر، تاریخ الرسل و الملوک، جلد ۳، ص ۳۰۳ تا ۳۰۴، دار المعارف، مصر۔

۱۸۔ ایضاً، جلد ۳، ص ۲۶۷ تا ۲۶۹۔

۱۹۔ ابن کثیر، عماد الدین اسماعیل ابن عمر، البدایۃ و النہایۃ، جلد ۷، ص ۱۱۲، مطبعۃ السعادۃ، مصر،

۱۹۳۴ء۔

۲۰ اس سلسلے میں ایچ۔اے۔آر گب (H.A.R. Gibb) ایک نہایت معقول تجزیہ پیش کرتا ہے، دیکھئے اس کی کتاب *Studies on the Civilization of Islam*, p. 5, London, 1962.

۲۱ اخطل (م ۹۵ھ/ ۷۱۳ء)، بنو امیہ کا شاعر تھا، نام غیاث بن غوث، کنیت ابو مالک اور لقب اخطل تھا۔ عرب قبیلہ بنو تغلب کے نصرانی خاندان سے تعلق تھا۔ وہ الجزیرہ میں اپنے قبیلے میں پلا بڑھا۔ کم عمری میں اس کی ماں وفات پا گئی، سوتیلی ماں کی بدسلوکی کے نتیجے میں وہ ایک زبان دراز، بدطینت اور شرابی بن کر بڑا ہوا۔ لڑکپن میں ہی شعر کہنے لگا۔ اموی دربار تک اس کی رسائی یزید بن معاویہ کی وجہ سے ہوئی۔ یزید کے بعد آنے والے اموی حکمرانوں نے بھی اس کی سرپرستی کی۔ خصوصاً عبدالملک بن مروان نے اخطل کو قبیلہ مضر اور اس کے شاعروں کے خلاف استعمال کیا کیونکہ وہ آل زبیر کی طرف ہو گئے تھے۔ اخطل نے عبدالملک کی مدح میں بہترین قصائد کہے، جس کے نتیجے میں عبدالملک کی طرف سے اسے "شاعر الخلیفہ" کا خطاب ملا۔

۲۲ گولڈ زیہر، جلد۱، ص۱۱۳۔

۲۳ فرزدق (م ۱۱۰ھ/ ۷۲۸ء)، اموی دور کے تین اکابر شعرا میں فخر کے موضوع پر فرزدق سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اس کا نام ہمام، کنیت ابو فراس اور تعلق بنو تمیم کی شاخ بنو دارم سے تھا۔ وہ ۶۴۰ء میں حضرت عمر کے دور خلافت میں بصرہ میں پیدا ہوا۔ تاسیس بصرہ کے دن سے ہی اس میں اس کے آباء و اجداد اور قبیلے کے فصیح اور بادیہ عرب کی خالص زبان بولنے والے لوگ بس گئے تھے۔ اس کا دادا صعصعہ عرب کا بڑا نامور آدمی ہو گزرا تھا اور "محی الموؤدات" (زندہ دفن کی جانے والی بچیوں کو زندگی دینے والا) کے لقب سے مشہور تھا، کیونکہ عرب جاہلیہ میں کوئی عرب اپنی نومولود بچی کو زندہ درگور کرنے کا ارادہ کرتا تو صعصعہ اس بچی کو خرید کر اس کی پرورش کرتا تھا۔ فرزدق کا باپ غالب بھی بڑا معزز سردار تھا۔ فرزدق اپنے خاندان کے اس اونچے رتبے کی وجہ سے اپنی شاعری میں فخر کا اظہار کرتا تھا اور اس میدان میں اس نے اپنے زمانے کے سب شعراء پر فوقیت حاصل کر لی۔ فرزدق کا اصل جوہر شاعری میں اس وقت چمکا

جب اس کی اس کے معاصر شاعر جریر کے ساتھ ہجو گوئی کا سلسلہ شروع ہوا۔

۲۴؎ جریر (م ۱۱۰ھ/ ۷۲۸ء)، ابو حزرہ جریر بن عطیہ کا تعلق بنو تمیم کی شاخ بنو کلیب بن یربوع سے تھا۔ وہ یمامہ کے علاقے میں پیدا ہوا اور صحرائی ماحول میں نشو ونما پائی جس کے اثر سے اس کے اندر زبان و بیان کی فصاحت پیدا ہوئی۔ جس وقت اس نے بصرہ میں اقامت کا فیصلہ کیا وہ بطور شاعر اپنے قبیلے میں مشہور ہو چکا تھا۔ بصرہ میں سوق مربد میں آنے جانے لگا اور فرزدق سے ہجو گوئی کا مقابلہ کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ جریر حجاج بن یوسف کی نظروں میں آ گیا جس نے اس کی سرپرستی کی اور حجاج کی مدح میں جریر نے متعدد نظمیں کہیں۔ بعد میں اسے عبدالملک کے پاس دمشق بھیج دیا۔ یوں وہ اموی خلفاء کی سرپرستی حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔

۲۵؎ گولڈ زیہر، جلد ا،ص ۱۱۳۔

۲۶؎ طویل قصیدے کے لئے رجوع کیجئے، ابوالفرج، کتاب الاغانی، جلد ۴،ص ۱۲۰، مصر، ۱۳۲۳ھ۔

۲۷؎ ایضاً، جلد ا،ص ۱۴۷۔

۲۸؎ طٰہٰ حسین المصری، عربی کا قدیم ادب، مترجم: محمد رضا انصاری،ص ۲۹۲۔ ۲۹۶، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۱۷ء۔

۲۹؎ جاحظ (م ۸۶۸ء)، ابو عثمان عمرو بن بحر الجاحظ، بلند پایہ نثر نگار، متعدد کتابوں کا مصنف، مذہبی و سیاسی مباحث اور معتزلی الٰہیات پر دلچسپ رسائل کا خالق اور اپنے زمانے کی ایک نادرۂ روزگار شخصیت۔ جاحظ آٹھویں صدی عیسوی کے آخری دہائیوں میں بصرہ میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ بصرہ ہی میں گذارا اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں منہمک رہا۔ عباسی خلفاء مامون، معتصم، واثق اور متوکل کے عہد میں وہ کبھی کبھی بغداد چلا جاتا لیکن جلد ہی بصرہ واپس آ جاتا۔ عمر کے آخری حصے میں اس پر فالج کا حملہ ہوا اور بالآخر ۸۶۸ء میں ۹۳ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ جاحظ کا دادا ایک سیاہ فام غلام تھا جو بصرہ کے ایک آدمی کے اونٹ چراتا تھا۔ خود جاحظ بدصورت تھا، اس کی آنکھوں کے بڑے بڑے ڈھیلے باہر کو ابلے پڑتے تھے، اسی لئے اسے ''جاحظ'' کا نام دیا گیا۔

۳۰؎ جاحظ، الحیوان، جلد ۷،ص ۶۸، مصر (ت ن)۔

۳۱؎ صرف دو عباسی خلفاء، ابوالعباس السفاح اور امین کی مائیں عرب تھیں۔

۳۲ بشار بن بُرد (م ۷۸۳ھ) نے اموی اور عباسی دونوں حکومتوں کا زمانہ پایا، نابینا ہونے کے باوجود ادب اور بلاغت میں بلند مقام پایا۔ بشار کے آباء طخارستان کے فارسی لوگوں میں تھے۔ اُس کے والدین بنی عقیل کے غلام تھے۔ وہ بصرہ میں پیدا ہوا اور یہیں پروان چڑھا۔ وہ عربی ادب کی تاریخ میں آخری شاعر تھا جس کے کلام کو علمائے نحو و لغت سند مانتے تھے۔ اس کی شعوبیت کے ڈانڈے زندیقیت سے ملتے تھے۔

۳۳ ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ عرب ماہر لسانیات فارسی نژاد تھا۔ ۱۱۰ھ / ۷۲۷ء میں بصرہ میں پیدا ہوا اور ۲۰۹ھ / ۸۲۵ء میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ قریش کے قبیلہ تیم میں خانوادہ عبید اللہ معمر کے یہاں بطور ایک موالی پیدا ہوا۔ اُس نے دبستان بصرہ کے سر برآوردہ علمائے لسانیات ابو عمرو بن العلاء اور یونس بن حبیب سے تعلیم پائی اور قواعد لغت اور لسانیات کے بعض مباحث پر متعدد رسائل تصنیف کیے۔ جن میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہا۔ اس کی دلچسپی کے خاص میدان عربوں کی تاریخ و ثقافت کے موضوعات تھے۔ مسلک کے اعتبار سے ابو عبیدہ خوارج کے فرقۂ صفریہ سے تعلق رکھتا تھا وہ انتہا پسند شعوبی تھا اور اپنے بارے میں بتاتا ہے کہ اُس کے دادا باجروان کے یہودی تھے۔ باجروان شام کے علاقے رقہ کے قریب واقع ہے۔

۳۴ ابو عبدالرحمٰن ھیثم بن عدی بن عبد الرحمٰن بن زید بن اُسید طائی ۱۲۸ھ میں کوفہ میں پیدا ہوا۔ ۲۰۹ھ میں فم الصلح میں وفات پائی۔ اس کا والد واسط کا عرب تھا مگر اس کے کچھ مخالفین اس کو ایک مشکوک النسب شخص قرار دیتے ہیں۔ وہ عربوں سے شدید تعصب اور نفرت رکھتا تھا وہ عربوں کے نسب سے لے کر اُن کے رسوم و رواج ہر چیز کا مذاق اڑایا کرتا تھا اس بارے میں اُس نے کئی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ اُس نے حضرت عباس بن عبد المطلب کی شان میں بھی بے ادبی کی جس کی وجہ سے چند سال قید بھگتنی پڑی۔ عربوں کے عیوب پر اُس کی کتاب المثالب، کتاب المثالب الصغیر، کتاب المثالب الکبیر، کتاب المثالب ربیعہ مسلکاً ھیثم بن عدی بھی خارجی تھا اور اس حوالے سے اُس نے ایک کتاب کتاب خوارج بھی لکھی تھی۔

۳۵ علان یا غیلان بن الحسن الوراق، فارسی الاصل تھا۔ انساب و مثالب اور منافرات کا راوی اور ان پر گہری نظر رکھنے والا تھا۔ عربوں کے خلاف اپنے شدید بغض و تعصب اور ایرانی قوم کو

عربوں سے برتر سمجھنے کی وجہ سے "شعوبی" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے ہارون الرشید کے زمانے میں برامکہ سے رابطہ استوار کیا جو اس وقت دربار خلافت میں ارباب اثر و رسوخ اور اصحاب بست و کشاد تھے، انہوں نے اس کا خیر مقدم کیا اور 'بیت الحکمۃ' میں ملازمت دے دی۔ یہ پہلے ہارون الرشید کے لیے پھر مامون الرشید کے لیے کتابت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ علان کو مؤرخین نے بے دین اور زندیق کہا ہے۔

۳۶۔ عباسی دور کا شاعر دیک الجن (م ۲۳۵ھ) جس کا تعلق بنو تمیم سے تھا، اس کے آباؤ اجداد جنگ موتہ کے بعد اسلام لے آئے تھے، یہ عرب تھا مگر عرب مخالف جذبات یعنی شعوبی رجحان رکھتا تھا۔

۳۷۔ ابن الندیم، الفہرست، ص ۱۲۳، ۱۲۴، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۶ء۔

۳۸۔ ایضاً، ص ۹۹ تا ۱۰۰۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۰۵، ۱۰۶۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۵۰۔

۴۱۔ قریش کا تعلق قبیلہ مضر سے تھا، ان کے مدمقابل ربیعہ تھے۔

۴۲۔ احمد امین المصری، ضحی الاسلام، جزء الاول، ص ۷۳۔



نتائج تحقیق

مولیٰ (جمع موالی) عربی زبان کا ایک کثیر المعنیٰ لفظ ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ اکیس مرتبہ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ بعض موقعوں پر یہ لفظ خود اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوا ہے، جس کے معنی مالکِ حقیقی، آقا، نگران، سرپرست، متولی، کارساز اور رفیق کے ہیں۔ نیز یہ لفظ مجازاً بھی استعمال ہوا ہے۔ لفظ مولیٰ قرآن حکیم میں عصبات، قرابت دار اور بنو اعمام کے لئے بھی مذکور ہوا ہے۔ البتہ قرآن میں لفظ مولیٰ کہیں بھی آزاد کردہ غلام کے لئے استعمال نہیں ہوا۔ دراں حالیکہ عرب جاہلیہ کی شاعری اور احادیث میں یہ لفظ مندرجہ بالا تمام مفاہیم کے علاوہ آزاد کردہ غلاموں کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اہل لغت ایسے کثیر المعنی الفاظ کی درجہ بندی کر کے اس کی تفہیم کو آسان بنا دیتے ہیں۔ اہل لغت کی درجہ بندیوں کی روشنی میں موالی کی درج ذیل قسمیں کی جا سکتی ہیں:

۱۔ مولیٰ القرابت و الولادۃ — مولیٰ کی اس قسم میں ہر وہ رشتہ دار شامل ہوتا تھا جس سے رشتہ داری کی وجہ یا تو ولادت ہوتی تھی یا زوجیت۔

۲۔ مولیٰ الحلف و الیمین — معاہدہ اور عہد و پیمان کے ذریعہ عقد موالات قائم کرنے والے اشخاص آپس میں ایک دوسرے کے مولیٰ ہوتے تھے۔

۳۔ مولیٰ فی الدین — دینی یگانگی کی وجہ سے جو موالات اور دوستی قائم ہو جائے، اس کی بناء پر بھی فریقین ایک دوسرے کے مولیٰ ہوتے تھے۔ انہیں مولی الموالات بھی کہا جاتا ہے۔

۴۔ مولی النعمة انہیں مولی العتاقہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں آزاد کردہ غلام اور آزاد کنندہ دونوں شامل ہیں۔ آزاد کردہ غلام ''مولیٰ من تحت'' اور آزاد کنندہ ''مولیٰ من فوق'' کہلاتا تھا۔

قبل از اسلام کا عرب معاشرہ تہذیبی اعتبار سے دو دائروں میں تقسیم نظر آتا ہے۔ شمالی اور جنوبی عرب کے باشندے شاندار سیاسی اور تہذیبی زندگی کے حامل تھے، جبکہ وسطی عرب کے باشندے سیاسی، معاشی اور ثقافتی اعتبار سے خاصے پسماندہ تھے۔ ان کا طرز حیات قبائلی تھا، وہ شدید سیاسی لامرکزیت کا شکار تھے، ایسی حالت میں کہ ملک میں کوئی سیاسی نظام نہ ہو اور معاشرہ میں لاقانونیت کا چلن ہو، ہر قبیلہ طاقتور ہو کر رہنا چاہے گا۔ اپنی طاقت میں اضافے کے لئے ان کے ہاں مختلف طریقے رائج تھے، جن میں سے ایک ''عقد موالات'' کا طریقہ تھا۔ ان کے یہاں باقاعدہ ''نظام ولاء'' رائج تھا۔ اس پیمانِ ولاء سے وابستہ دونوں فریقین کو فائدہ پہنچتا تھا۔ ایک طرف وہ کمزور افراد یا قبائل جو کسی طاقتور قبیلے سے عقدِ موالات کرتے تھے، ان کو جان ومال کی ضمانت مل جاتی تھی جبکہ دوسری طرف طاقتور کو اپنے حامیوں کی ایک جماعت مل جاتی تھی جس سے ان کی شان وشوکت، اور رعب ودبدبہ میں اضافہ ہوتا تھا۔

اس معاشرے میں جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی، تو پورے عربی معاشرے کی قلب ماہیت ہوگئی، قرآن کے فلسفۂ اخلاق نے انہیں ایک بالکل مختلف قوم بنا دیا۔ ہجرت مدینہ کے بعد پہلا اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا جو اپنی روح اور مزاج کے حوالے سے عہد جاہلیت کے معاشرے سے یکسر مختلف تھا۔ جاہلی عرب معاشرے کی بنیاد نسلی عصبیت، قبائلی تقسیم اور لامرکزیت پر تھی۔ جبکہ اسلامی معاشرہ کی بنیاد مساوات، اخوت اور عدلِ اجتماعی پر تھی۔ قبیلہ اس وقت بھی موجود تھا اور یہ بھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ عہدِ رسالت یا عہدِ خلافت راشدہ میں قبائلی منافرت اور قبائلی تفاخر کلیتہً ختم ہو گیا تھا۔ تاہم یہ ضرور تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس عصبیت کا رخ 'قبیلہ' سے 'دین' کی طرف موڑنے کی کوشش کی تھی جس میں آپؐ بڑی حد تک کامیاب رہے۔

عہد خلافت راشدہ میں بڑے پیمانے پر ہونے والی فتوحات کے نتیجے میں غیر عرب عنصر اسلامی معاشرے کا حصہ بنا۔ عربوں میں رائج نظامِ ولاء کی وجہ سے یہ غیر اقوام کے لوگ مختلف عرب قبائل سے عقدِ موالات قائم کر کے اسلامی ریاست کے شہری بن گئے اور موالی کہلائے۔ یہیں سے عرب اور موالی مسئلے کا آغاز ہوا۔ مقالہ زیر نظر کے لئے لفظ 'موالی' کی مزید تحدید کی گئی ہے اور موالی سے "ایران موالی" ہی مراد لیے گئے ہیں۔ عرب اور (ایرانی) موالی کے حوالے سے بہت سے تاریخی نظریات قائم تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ عربوں کے متعصبانہ اور مفاخرانہ رویہ کی وجہ سے عرب موالی کشمکش شروع ہوئی، جبکہ یہ نظریہ اس تحقیق کے نتیجے میں اس طرح قائم نہ رہ سکا اور یہ بات سامنے آئی کہ ایرانی موالی ابتدا سے ہی جارح ثابت ہوئے تھے۔ ان کی جارحیت کا پہلا مظہر خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ پر قاتلانہ حملے کی صورت میں سامنے آیا۔ اس کے بعد انہوں نے مختار ثقفی کی تحریک میں شامل ہو کر بنو امیہ کی عرب حکومت سے براہ راست ٹکر لی۔

ایم۔ اے۔ شعبان کا یہ مفروضہ کہ مختار ثقفی کی تحریک میں موالی کی قابل ذکر تعداد شامل نہیں تھی، اس تحقیق کے دوران قائم نہ رہ سکا اور یہ بات سامنے آئی کہ مختار کی طاقت کا مرکز (Power Base) یہ موالی ہی تھے۔ ایرانی موالی کی ان کی جارحیتوں کے نتیجے میں بنو امیہ کی عرب حکومت نے ان کے خلاف سخت رویہ کا مظاہرہ کیا۔ گویا مؤرخین، جن میں بعض ابتدائی تاریخ نویس مثلاً ابن عبد ربہ اور بعض متاخرین مثلاً حسن ابراہیم حسن، جرجی زیدان وغیرہ نے اب تک "عرب ردِّ عمل" کو "عرب عمل" اور "موالی عمل" کو "موالی ردِّ عمل" لکھا اور ثابت کیا تھا۔ یہ تاریخی نظریہ زیر نظر مقالے میں بعینہٖ قائم نہیں رہ سکا لہٰذا حجاج بن یوسف کی موالی دشمنی جزوی طور پر غلط ثابت ہوئی۔ یہ خیال کہ حجاج بن یوسف ایک ظالم گورنر تھا اور اس نے موالی پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے، درست ثابت نہ ہو سکا۔ اس کے برخلاف یہ بات سامنے آئی کہ عبدالرحمٰن ابن اشعث کی بغاوت جو ابتداً حجاج بن یوسف اور اس کے بعد شام کی مروانی حکومت کے خلاف تھی اور جس کے نتیجے میں حجاج کو چند سالوں کے لئے عراق سے

ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ان ایرانی موالی نے اس بغاوت میں ابن اشعث کا ساتھ دے کر حجاج کو اپنا دشمن بنالیا تھا۔جس کے ردِ عمل میں حجاج بن یوسف نے ان کے خلاف سخت حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے موالی قوت پر کاری ضرب لگائی۔انہیں سیاسی اور سماجی طور پر کچلا گیا، جس کی وجہ سے برسہا برس تک موالی کی کسی جارحیت کا پتا نہیں چلتا۔

اسی طرح ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن اس تحقیق کے دوران غیر محتاط مصنف ثابت ہوئے۔موالی کے حوالے سے ان کا یہ بیان کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ بھی موالی سے سخت ناراض تھے اور خلفائے بنو امیہ نے انہیں کی تقلید کی، بے بنیاد پایا گیا۔سعید احمد اکبر آبادی نے اپنی کتاب مسلمانوں کا عروج و زوال میں موالی کے حوالے سے خلفائے بنو امیہ اور حجاج بن یوسف پر جو الزامات لگائے ہیں وہ دوران تحقیق درست نہیں پائے گئے ۔ دوران تحقیق جرجی زیدان کی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی میں بعض واقعات بغیر کسی مستند حوالے کے پائے گئے۔ نیز جرجی زیدان پر علامہ شبلی نعمانی نے جو تنقید النقد علی التمدن لکھی ہے، اس کی روشنی میں احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ جرجی زیدان کے بیان سے گریز اختیار کیا جائے۔اس گریز کی وجہ سے حقائق تک پہنچنے میں کافی مدد ملی۔

عرب اور موالی کے حوالے سے یہ خیال کہ بنو امیہ کی عرب حکومتوں نے بر بنائے عصبیت موالی کو سیاسی اور انتظامی عہدوں سے الگ رکھا، کوئی درست خیال ثابت نہ ہوسکا۔ آخری باب میں عام حقائق اور (Data Collection) کے ذریعے جو منظر نامہ ترتیب پایا، اس نے ثابت کیا کہ اموی عہد میں موالی اہم سیاسی عہدوں مثلاً مشاورت، کتابت، حجابت وغیرہ پر مقرر کیے گئے، اور بعض حالات میں ان کی تعداد عربوں سے بڑھ گئی۔بعض قابل موالی اہم عسکری اور انتظامی عہدوں (یعنی سپہ سالار لشکر اور گورنری) تک بھی پہنچے۔لہٰذا ابراہیم حسن ابراہیم کا یہ بیان کہ موالی تحصیل علم کی طرف اس لئے زیادہ منہمک ہوگئے کیونکہ بنو امیہ کی عربی حکومت میں انہیں کوئی سیاسی مقام نہیں دیا گیا، تاریخ کا درست تجزیہ نہیں ہے۔صرف ایک عہدہ قضا ایسا تھا جس پر ہمیشہ عربوں کا تقرر کیا گیا۔اس تحقیق کے دوران عہد اموی کا مشہور

قاعدہ "لا یفضیٰ بین الناس الا عربی" کو درست پایا گیا۔ تاہم اس کا سبب موالی کے لئے کسی قسم کا جذبہ اہانت وحقارت نہیں تھا، بلکہ اس کا معقول سبب یہ تھا کہ عربوں کے باپ دادا مسلمان تھے، جن میں سے بعض کو شرف صحابیت بھی حاصل تھا۔ یہ دین اسلام اور اس کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھنے والے تھے جبکہ موالی تو مسلم تھے۔ ان کے آباواجداد کا کوئی اسلامی ماضی نہیں تھا۔ یہ موالی ابھی علوم دینیہ سے آگاہی حاصل کرنے کے ابتدائی مدارج میں تھے۔ ان سے قضا کا انتہائی اہم، نازک اور مشکل کام نہیں لیا جاسکتا تھا۔ تاہم ایک صدی کے بعد یہ عربی زبان، صرف ونحو، لغت اور تمام علوم قرآنی کے ماہر ہوگئے تو عباسی عہد میں یہ بلاتکلف عہدہ قضا پر بھی فائز کیے گئے۔

اس تحقیق کے دوران علامہ ابن خلدون کا یہ بیان بھی درست ثابت نہ ہوسکا جس کی رو سے انہوں نے موالی کو علم وعرفان کے بلند وبالا مرتبے پر پہنچادیا اور عربوں سے ان کا وہ حصہ بھی چھین لیا جو جائز اور برحق تھا۔ ابن خلدون کی اس جانبداری کی ڈاکٹر احمد امین المصری نے نشاندہی کی، جسے اس مقالے کے دوران درست پایا گیا۔

المختصر عرب موالی مسئلے کے حوالے سے تحقیق کا نچوڑ یہ ہے کہ اسلام کی دعوت کو عربوں نے دوسطحوں پر قبول کیا تھا۔ ایک وہ عرب جو سابقین اولین تھے۔ انہیں رسول اللہ ﷺ کی زیادہ سے زیادہ صحبت نصیب ہوئی۔ لہٰذا ان کی قلب ماہیت ہوگئی۔ یہ گروہ حقیقی معنوں میں اسلام شناس تھا۔ دوسرے وہ عرب جو فتح مکہ کے بعد صرف اس لئے اسلام لائے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اسلام اس وقت کی بڑھتی، پھیلتی، سیاسی اور فوجی قوت تھی، یہ زیادہ تر اہل البادیہ تھے، جن کو قرآن "اعراب" کا نام دیتا ہے۔ انہیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت یا تو نصیب نہ ہوئی یا بہت قلیل عرصے کے لئے نصیب ہوئی۔ نہ تو اس گروہ کی قلب ماہیت ہوسکی، اور نہ یہ اسلام کی روح کو سمجھ سکے۔ اس سلسلے میں **H.A.R. Gibb** کا تجزیہ بڑا معقول ہے جس کا ذکر گزشتہ ابواب میں کی گیا۔

دوسری طرف کیفیت ایمان کے اعتبار سے موالی کو بھی دو گروہوں میں تقسیم کیا

جاسکتا ہے۔ موالی کا ایک گروہ وہ تھا جس کا ایمان خالص تھا، انہوں نے قلب کی مکمل آمادگی سے اسلام قبول کیا اور اسلام کی روح کو اس طرح انگیز کیا کہ ان کی قلب ماہیت ہوگئی۔ جبکہ ان کا ایک طبقہ وہ تھا جنہوں نے مجبوراً اسلام قبول کیا کیونکہ وہ اس عہد کی بڑھتی ہوئی سیاسی اور فوجی طاقت تھی، عرب مسلمانوں سے ان کا عناد بعض حالات میں اسلام دشمنی پر منتج ہوتا۔

اسلام کو مختلف سطحوں پر قبول کرنے کی وجہ سے اموی عہد کے مختلف النوع معاشرہ میں دو طرح کے رویے ملتے ہیں۔ ایک رویہ سماجی مساوات کا تھا، اور دوسرا رویہ عصبیت و زعم کا۔ پہلے رویے کا مظاہرہ کرنے والے عرب بھی تھے اور موالی بھی، اسی طرح دوسرے رویے کا مظاہرہ کرنے والے عرب بھی تھے اور موالی بھی۔ وہ عرب و موالی جنہوں نے اسلام کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ قبول کیا تھا، سماجی مساوات اور عدلِ اجتماعی کے قائل تھے، جو عین اسلامی تعلیمات کے مطابق تھا۔ دوسری طرف وہ عرب و موالی تھے، جنہوں نے اسلام کو اس حقیقی روح کے ساتھ قبول ہی نہیں کیا تھا۔ لہٰذا ان سے عصبیت و جاہلیت کے مظاہرے ہوتے رہتے تھے۔ پورے اموی عہد میں یہ دونوں سماجی رویے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اس بارے میں احمد امین المصری کا تجزیہ، جو انہوں نے فجر الاسلام میں کیا ہے، بڑا وقیع اور قابل قبول ہے۔ احمد امین کا یہ نظریہ بھی زیر نظر مقالے میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ ایسی صورت حال میں عرب اور موالی میں سے کسی ایک کے رویے کو موردِ الزام ٹھہرانا اور دوسرے کے رویے کو اس کا ردِّعمل قرار دینا، سرے سے ہی غلط ثابت ہو جاتا ہے، اور درست صورت یہ سامنے آتی ہے کہ بعض حالات میں عربوں کی عصبیت نے موالی کو ناراض کیا اور بعض حالات میں موالی عصبیت نے عربوں کو عدم تحفظ میں مبتلا کیا۔ پورے اموی عہد میں یہی صورت حال رہی۔ یہاں تک کہ موالی عنصر کے ردِّعمل نے شدت اختیار کرتے ہوئے 'شعوبیت' کی شکل اختیار کر لی۔ جو عباسی عہد کا غالب رجحان تھا۔



اشاریہ (اعلام)

﴿خ﴾

﴿م﴾



کتابیات

عربی کتب:

- ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، (مصطفیٰ بابی حلبی، مصر، ۱۹۵۹ء)۔
- ابن اثیر جزری، ابوالحسن علی بن محمد، الکامل فی التاریخ، (دار صادر، بیروت، ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء)
- وہی مصنف، اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ، (قاہرہ، ۱۹۷۰)
- وہی مصنف، النہایۃ فی غریب الحدیث و الاثر، (مطبعہ خیریہ، مصر، ۱۳۲۳ھ)
- ابن الجزری، شمس الدین محمد دمشقی، طبقات القراء، (مصر، ۱۳۵۲ھ)
- ابن الجوزی، ابی الفرج عبدالرحمٰن بن علی، صفۃ الصفوۃ (دائرہ معارف عثمانیہ ۱۳۵۵ھ)
- ابن حبیب، محمد بغدادی، کتاب المحبر، (دائرہ معارف عثمانیہ، حیدرآباد دکن، ۱۳۶۱ھ)
- ابن حزم الاندلسی، علی بن احمد، جمہرۃ انساب العرب، (دار المعارف، مصر، ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء)
- وہی مصنف، جوامع السیرۃ، (دار المعارف، مصر)
- ابن حجر عسقلانی، شہاب الدین، تہذیب التہذیب، (دائرۃ المعارف النظامیہ، حیدرآباد دکن، ۱۳۲۵ھ)
- وہی مصنف، الاصابہ فی تمییز الصحابہ (دار الکتب العلمیہ، بیروت)
- ابن خلدون، عبدالرحمٰن بن محمد، مقدمہ، (دار صادر، بیروت)
- وہی مصنف، کتاب العبر و دیوان المبتدا و الخبر (تاریخ ابن خلدون) (مصر)
- ابن خلکان، احمد بن محمد، وفیات الاعیان، (مکتبۃ النہضۃ المصریۃ، قاہرہ، ۱۹۴۸ء)
- ابن سعد، ابوعبداللہ محمد، الطبقات الکبریٰ (دار صادر، بیروت، ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء)
- ابن طقطقا، محمد بن علی بن طباطبا، الفخری، (دار صادر، بیروت، ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء)
- ابن عبدالبر ابی عبداللہ بن محمد، الاستیعاب (دار الجیل، بیروت، ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء)

- ابن عبدربہ الاندلسی، العقد الفرید (مطبعۃ لجنۃ، التالیف والترجمہ والنشر، قاہرہ،۱۳۸۲ھ/۱۹۵۳ء)
- ابن قتیبہ الدینوری، ابی محمد بن عبداللہ بن مسلم، المعارف (قدیمی کتب خانہ، کراچی)
- وہی مصنف، عیون الاخبار، (مطبعہ دارالکتب، مصر،۱۹۲۸ء)
- ابن القیم الجوزیہ، زاد المعاد، (مکتبہ المنار الاسلامیہ، سعودی عرب،۱۹۷۹ء)
- ابن کثیر، عماد الدین اسماعیل بن عمر، البدایہ و النہایہ (مطبعۃ السعادۃ، مصر،۱۹۳۲ء)
- وہی مصنف، تفسیر القرآن (اصح المطابع، کراچی)
- وہی مصنف، السیرۃ النبویۃ، (داراحیاء التراث العربی، بیروت)
- ابن منظور افریقی، لسان العرب، (بولاق، مصر،۱۳۰۷ھ)
- ابن الندیم، ابوالفرج محمد، الفہرست، (دارالمعرفہ، بیروت،۱۴۱۵ھ/۱۹۹۶ء)
- ابن ہشام، السیرۃ النبویہ (مصطفیٰ بابی حلبی، مصر،۱۳۷۵ھ/۱۹۵۵ء)
- ابوتمام، حبیب بن اوس الطائی، دیوان الحماسہ (مصر،۱۳۷۴ھ/۱۹۵۵ء)
- ابوداؤد، سلیمان ابن اشعث بجستانی، سنن ابو داؤد، (اسلامی اکادمی، لاہور،۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء)
- ابوعبید قاسم بن سلام، کتاب الاموال، (مکتبہ الکلیات الازہریہ، قاہرہ،۱۹۸۱ء)
- ابویوسف، یعقوب بن ابراہیم، کتاب الخراج، (مکتبہ سلفیہ، مصر،۱۳۸۲ھ)
- ابی عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ، الجامع الصحیح (سنن ترمذی)، (داراحیاء التراث العربی، بیروت)
- ابی حاتم، محمد بن حیان، السیرۃ النبویہ و اخبار الخلفاء، (دارالفکر، بیروت،۱۹۹۱ء)
- احمد امین المصری، فجر الاسلام، (لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر، قاہرہ،۱۹۶۵ء)
- وہی مصنف، ضحیٰ الاسلام (مکتب النہضہ، مصر،۱۹۳۵ء)
- احمد بن حنبل، مسند، (دارالمعارف، مصر،۱۹۳۹ء)
- الاصفہانی، ابوالفرج علی بن الحسین، کتاب الاغانی، (مصر،۱۳۲۳ھ)
- آلوسی، شہاب الدین بغدادی، روح المعانی، (ادارہ الطباعۃ المنیریہ، مصر،۱۳۴۵ھ)
- آلوسی، شکری، محمود، بلوغ الارب (مطابع دارالکتاب العربی، مصر)
- بخاری، امام محمد اسماعیل، الجامع الصحیح (دارالکتب العلمیہ، بیروت، لبنان)
- بغدادی، عبدالقاہر بن طاہر، الفرق بین الفرق، (مطبعۃ المدنی، مصر)

- بلاذری، احمد بن یحییٰ بن جابر، فتوح البلدان، (دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء)
- وہی مصنف، انساب الاشراف (یروشلم، ۱۹۳۶ء)
- جاحظ، ابی عثمان عمرو بن بحر، کتاب المحاسن و الاضداد، (مطبعہ السعادۃ، مصر، ۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۲ء)
- وہی مصنف، البیان و التبیین (مطبعۃ الفتوح الادبیہ، مصر، ۱۳۳۲ھ)
- وہی مصنف، ثلاث رسائل، (برل، لائیڈن، ۱۹۰۳ء)
- جرجی زیدان، العرب قبل الاسلام (مطبعۃ الہلال، مصر ۱۹۰۸ء)
- وہی مصنف، تاریخ التمدن الاسلامی، (دار الہلال، مصر، ۱۹۳۷ء)
- الجلالی، مولانا سید عبدالدائم، لغات القرآن، (ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۷ء)
- جشیاری، ابن عبداللہ محمد بن عبدوس، کتاب الوزراء و الکتّاب (مصطفیٰ باب حلبی، مصر، ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء)
- جوہری، اسماعیل بن حماد، تاج اللغہ و صحاح العربیہ، (دار الکتب العربی، مصر)
- حسن ابراہیم حسن، السیادۃ العربیہ و الشیعہ و الاسرائیلیات فی عہد بنی امیہ، (قاہرہ، ۱۹۳۳ء)
- وہی مصنف، النظم الاسلامیہ، (قاہرہ، ۱۹۳۹ء)
- وہی مصنف، تاریخ الاسلام، السیاسی و الدینی و الثقافی و الاجتماعی (قاہرہ، ۱۹۵۳ء)
- دینوری، ابوحنیفہ احمد بن داؤد، الاخبار الطّوال (دار احیاء الکتب العربیہ، مصر، ۱۹۶۰ء)
- ذہبی، شمس الدین محمد بن احمد، سیر اعلام النبلاء (دار المعارف، مصر)
- وہی مصنف، تذکرۃ الحفاظ (دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن، ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء)
- وہی مصنف، تاریخ الاسلام (قاہرہ، ۱۳۶۷ھ)
- راغب الاصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، (اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۱ء)
- زبیدی، سید محمد مرتضیٰ حسینی، تاج العروس من جواہر القاموس، (مطبعہ خیریہ، مصر، ۱۳۰۶ھ)
- زمخشری، محمود بن عمر، الکشاف (مطبعۃ الاستقامۃ، قاہرہ، ۱۳۶۵ھ/ ۱۹۳۶ء)
- زیات، احمد حسن، تاریخ الادب العربی (دار النہضۃ مصر، قاہرہ، ۱۹۳۰ء)
- سمعانی، عبدالکریم بن ابی بکر، الانساب، (لائیڈن، ۱۹۱۲ء)

- سیوطی، عبدالرحمٰن جلال الدین، تاریخ الخلفا (مطبع مجتبائی، دہلی، ١٣٠٩ھ)
- طبری، ابوجعفر محمد بن جریر، تاریخ الرسل و الملوک (تاریخ طبری) (دار المعارف، مصر، ٩-١٩٦١ء)
- وہی مصنف، جامع البیان (تفسیر طبری) (مصطفیٰ بابی حلبی، مصر ١٣٧٣ھ/١٩٥٣ء)
- طہٰ حسین، الفتنۃ الکبریٰ، (دار المعارف، مصر، ١٩٦١ء)
- عبدالباقی، محمد فواد، تفصیل آیات القرآن الحکیم، (سہیل اکیڈمی لاہور، ١٩٩٣ء)
- علی المتقی، شیخ، کنز العمال، (دائرۃ معارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن ١٩٥٥ء)
- مالک، امام، ابن انس، الموطا (اسلامی اکادمی، لاہور، ١٤٠٢ھ)
- مبرد، ابی العباس محمد بن یزید، الکامل فی اللغۃ و الادب (مصر، ١٣٣٩ھ)
- محمد نبیہ حجاب، دکتور، مظاہر الشعوبیہ فی الادب العربی (مکتبہ نہضۃ، مصر، ١٩٦١ء)
- مرزوقی، شیخ ابی علی، الاصفہانی، کتاب الازمنہ و الامکنہ (حیدرآباد دکن، ١٣٣٢ھ)
- وہی مصنف، شرح دیوان الحماسہ (لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر، مصر)
- مسعودی، ابوالحسن بن حسین بن علی، التنبیہ والاشراف، (مصر ١٣٥٧ھ/ ١٩٣٨ء)
- وہی مصنف، مروج الذہب و معادن الجواہر (مطبعۃ السعادۃ، مصر، ١٣٦٧ھ)
- مسلم، امام ابی الحسین ابن حجاج، صحیح مسلم (دار احیاء التراث العربی، بیروت، س ن)
- مصری، حسین مجیب، دکتور، صلات بین العرب و الفرس و الترک (مکتبہ الانجلو المصریہ، قاہرہ)
- میرزا ابوالفضل بن فیاض علی بن نوروز، غریب القرآن فی لغات الفرقان، (حیدرآباد دکن، ١٩٢٧ء)
- نجار، محمد طیب، الدکتور، تاریخ العالم الاسلامی الدولۃ الامویہ فی الشرق، (مکتبہ معارف، ریاض، ١٤٠٦ھ/ ١٩٨٥ء)
- نسائی، امام ابی عبدالرحمٰن احمد بن شعیب، السنن الکبریٰ (دار الکتب العلمیہ، بیروت، ١٩٩١ء)
- ہیکل، محمد حسین، حیاۃ محمدؐ، (مصر، ١٩٢٧ء)
- وہی مصنف، عمر فاروق، (مصر، ١٣٦٣ھ)
- واقدی، محمد بن عمر، فتوح الشام، (مصطفیٰ بابی حلبی، مصر ١٩٣٣ء)
- وہی مصنف، کتاب المغازی، (مطبعہ جامعہ آکسفورڈ، ١٩٦٦ء)

- یاقوت حموی، ابو عبداللہ، معجم البلدان، (دار صادر، بیروت، ۱۹۵۷ء)
- یعقوبی، احمد بن ابی یعقوب، تاریخ یعقوبی (دار صادر، بیروت، س ن)

اردو کتب:

- اصلاحی، امین احسن، تدبر القرآن، (فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۹۶ء)
- اکبرآبادی، سعید احمد، اسلام میں غلامی کی حقیقت (دہلی، س ن)
- وہی مصنف، صدیق اکبر، (دہلی، ۱۹۵۸ء)
- وہی مصنف، مسلمانوں کا عروج و زوال، (ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۴۳ء)
- برق، ڈاکٹر غلام جیلانی، یورپ پر اسلام کے احسان، (شیخ غلام علی اینڈ سنز، کراچی، ۱۹۷۵ء)
- بدخشانی، پروفیسر مقبول بیگ، تاریخ ایران، (مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۱ء)
- حمید اللہ، ڈاکٹر محمد، رسول اکرم کی سیاسی زندگی (دارالاشاعت، کراچی، بار ششم)
- وہی مصنف، عہد نبوی میں نظام حکمرانی (اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۱ء)
- وہی مصنف، خطباتِ بہاولپور، (ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء)
- داناپوری، ابوالبرکات، عبدالرؤف، اصح السیر (اصح المطابع، کراچی، س ن)
- طٰہٰ حسین المصری، عربی کا قدیم ادب، مترجم: محمد رضا انصاری (انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۱۷ء)
- عثمانی، مفتی محمد تقی، حضرت امیر معاویہؓ اور تاریخی حقائق، (ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۶ء)
- غلام سرور، ڈاکٹر، تاریخ ایرانِ قدیم، (کراچی، ۱۹۵۶ء)
- فارق، خورشید احمد، قرنِ اول کا ایک مدبر، (مکتبہ برہان، دہلی، ۱۹۶۱ء)
- گستاؤلیبان، موسیو، تمدن عرب، مترجم سیّد علی بلگرامی (مقبول اکیڈمی، لاہور)
- مودودی، سیّد ابوالاعلیٰ، اسلامی ریاست، (اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۶ء)
- وہی مصنف، ترجمۂ قرآن مجید، (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۸۰ء)
- وہی مصنف، خلافت و ملوکیت، (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۸۸ء)
- وہی مصنف، تفہیم القرآن (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۹۳ء نیز ۲۰۰۹ء)

- ندوی، سیّد سلیمان، تاریخ ارض القرآن، (مجلس نشریات اسلام، کراچی)
- ندوی، عبدالسلام، سیرت عمر بن عبدالعزیز (مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۳۶۵ھ)
- وہی مصنف، اسوہ صحابہ (مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۰ء)
- نعمانی، علامہ شبلی وندوی، سیّد سلیمان، سیرۃ النبی (مکتبہ المعارف، اعظم گڑھ، طبع چہارم)
- نعمانی، علامہ شبلی الفاروق (مدینہ پبلشنگ کمپنی، کراچی، ۱۹۷۷ء)
- اردو دائرۃ معارف اسلامیہ، (دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۹ء)

رسائل وجرائد:

- ''المعارف'' ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، اکتوبر ۱۹۸۱ء۔
- ''آگہی''، ماہنامہ، کراچی، جلد ۲، شمارہ ۳/۴ بابت مارچ - اپریل ۱۹۹۰ء
- ''آگہی''، ماہنامہ، کراچی، جلد ۲، شمارہ ۵ بابت مئی ۱۹۹۰ء

English Books — انگریزی کتب:

- Ameer Ali, S., *Spirit of Islam*, Karachi, 1969.
- ____________, ***A Short History of the Saracens***, Karachi, 1986.
- Arnold, T.W. & A. Guillaume, ***Legacy of Islam***, London, 1931.
- Arnold, T.W., ***Preaching of Islam***, London, 1936.
- Brockelmann, C., ***History of the Islamic People***, (Tr. J. Carmichael & M. Perlmann), London, 1980.
- Browne, E.G., ***A Literary History of Persia***, New York, 1920.
- Dennett, D.C., ***Conversion and the Poll Tax in Early Islam***, Cambridge, 1950.
- Hell, Joseph, ***The Arab Civilization***, tr. S. Khuda Bakhsh, Lahore, 1969.
- Hitti, P.K., ***History of the Arabs***, London, 1953.
- Hitti, P.K., ***History of Syria***, New York, 1951.

- H.A.R. Gibb, ***Studies on the Civilization of Islam***, London, 1962.
- Hughes, T.P., ***A Dictionary of Islam***, London, 1895.
- Hasan Ibrahim Hasan, ***Islam- A Religious, Political, Social and Economic Study***, Baghdad, 1967.
- Hernan Santa Cruz, ***Racial Discrimination***, New York, 1971.
- Ignaz Goldziher (1850-1921) ***Muslim Studies***,(Muhammedanische Studien) translated from the German by C.R.Barber & S.M.Stern,Chicago.
- Levy, Reu Ben, ***The Social Structure of Islam***, Cambridge, 1957.
- M.A. Shaban, ***Islamic History: A New Interpretation***, Cambridge, 1971.
- __________, ***The Abbasid Revoution***, Cambridge, 1970.
- Munir W. ***Caliphate, Its Rise, Decline and Fall***, Beirut, 1963.
- Nehru, J.L., ***Discovery of India***, Calcutta, 1946.
- Noldeke, Theodor, ***The Historians History of the World***, (Vol. VIII), London, 1908.
- Nicholson, R.A., ***A Literary History of the Arabs***, Cambridge, 1953.
- Pickthall, M., ***The Cultural Side of Islam***, Karachi, 1993.
- Sarojni Naidio, ***Speeches & Writings of Sarojni Naidio***, Madras, 1918.
- Toynbee, A.J., ***Civilization on Trial***, New York, 1948.
- Wellhausen, J., ***The Arab Kingdom and its Fall***, Karachi, 1980.
- Watt, W.M., ***Muhammad at Mecca***, Karachi, 1993.
- __________, ***Muhammad at Medina***, Karachi, 1994.

__________, ***Encyclopaedia of Islam***, Leiden, 1991.



''عرب اور موالی'' نگار سجاد ظہیر کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، جس پر کراچی یونی ورسٹی نے انھیں ۲۰۰۱ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ مقالے کا عنوان ''پہلی صدی ہجری کے اسلامی معاشرے میں موالی کی سماجی حیثیت وعلمی مرتبہ'' تھا جسے مختصر کرکے ''عرب اور موالی'' کے نام سے کتابی شکل دی گئی ہے۔ کتاب پہلی بار ۲۰۰۶ء میں شایع ہوئی، موجودہ دوسرے ایڈیشن میں ''شعوبیت'' پر ایک باب کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں اسلام کی پہلی صدی میں عربوں اور موالی (غیر عرب نو مسلموں) خصوصاً ایرانی موالی کے مابین تعلقات پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سے قبل مصنفہ کی جو کتب شایع ہو چکی ہیں اُن میں ''مطالعہ تہذیب'' (۱۹۹۳ء/طبع ثانی ۲۰۰۹ء)، ''جدید ترکی'' (۲۰۰۱ء)، ''قرنِ اولی کا ایک مدبر: مختار ثقفی'' (۲۰۰۴ء/طبع ثانی ۲۰۱۴ء)، ''سیرت نگاری آغاز وارتقاء'' (۲۰۱۰ء)، ''خوارج ایک مطالعہ'' (۲۰۱۲ء/طبع ثانی ۲۰۱۵ء)، ''اسلام میں غلامی کا تصور'' (۲۰۱۶ء) اور ''تاریخ شام'' (۲۰۱۸ء) شامل ہیں۔ اُن کی دیگر تحقیقی تصنیفات جن میں سفرنامے اور افسانوں کے مجموعے شامل ہیں اس کے علاوہ ہیں۔

